THE CHALICE & THE BLADE

BY RIANE EISLER

جام اور خنجر

ہماری تاریخ اور ہمارا مستقبل

ریان آئسلر

ترجمہ: محمد یحییٰ خان

ڈارون کی کتاب "اوریجن آف سپیشیز" کے بعد اہم ترین کتاب

500,000
سے زائد کاپیاں
فروخت ہو چکی ہیں

مشعل

MashalBooks.org

1

جام اور خنجر

ریان آئسلر

ترجمہ: محمد یحییٰ خان

مشعل
آر۔بی۔۵، سیکنڈ فلور، عوامی کمپلیکس
عثمان بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور 54600، پاکستان

MashalBooks.org

جام اور خنجر

ریان آئسلر

ترجمہ: محمد یحییٰ خان

کاپی رائٹ اردو © 2011 مشعل بکس
کاپی رائٹ انگریزی © ریان آئسلر 1995,1987

ناشر: مشعل بکس
آر۔بی ۔5، سیکنڈ فلور،
عوامی کمپلیکس، عثمان بلاک، نیوگارڈن ٹاؤن، لاہور۔54600، پاکستان
فون وفیکس 042-35866859
E-mail: mashbks@brain.net.pk
http://www.mashalbooks.org

MashalBooks.org

ترتیب

اظہار تشکر 7

تعارف کتاب 11

باب 1: ایک گمشدہ دنیا کا سفر: آغازِ تہذیب 27

باب 2: ماضی سے ملنے والے پیغامات: دیوی کی دنیا 47

باب 3: اساسی فرق: جزیرہ کریٹ 65

باب 4: ابتدا سے قرونِ وسطیٰ تک 83
جام میں سے خنجر کیسے برآمد ہوا

باب 5: بھولے بسرے زمانے کی یادیں: دیوی کا ورثہ 105

باب 6: تکذیب حقیقت: حصّہ اوّل 131

باب 7: تکذیب حقیقت: حصّہ دوم 147

MashalBooks.org

باب 8: تاریخ کا دوسرا نصف: حصّہ اوّل 167

باب 9: تاریخ کا دوسرا نصف: حصّہ دوم 189

باب 10: نقوشِ ماضی: نسوانیت اور تاریخ 209

باب 11: چھٹکارا: نامکمل تقلیب 239

باب 12: ارتقا کا تعطل: تسلط کا مستقبل 261

باب 13: ارتقا میں پیشرفت: شراکت دارانہ مستقبل 279

تازہ ترین صورتِ حال

25 ویں طباعت کے لئے خصوصی ضمیمہ 305

MashalBooks.org

5

اظہار تشکر

یہ کتاب کئی جہتوں سے ایک مشترکہ کوشش ہے جس میں بے شمار خواتین و حضرات کی مساعی اور بصیرت سے استفادہ کیا گیا ہے ان میں سے متعدد کا توضیحی حاشیوں میں شکریہ ادا کیا جا چکا ہے۔ ان کے علاوہ اور بھی کئی تھے جن سے نقد ونظر، تجاویز، ترتیبِ اشاعت اور مسودہ کاری میں ہمیں معاونت ملتی رہی۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ گزشتہ دس برس سے زائد عرصہ سے ان کی جو تائید و انمول حوصلہ افزائی ہمیں حاصل رہی وہ ہماری ہمتوں کو توانائی بخشتی رہی۔

David Loye کی معاونت، جن سے یہ کتاب معنون کی جارہی ہے، اتنی خطیر تھی کہ میں کسی طور بھی اس کا کما حقہ، شکریہ ادا نہیں کر سکتی۔ یہ کہنا مبالغہ نہیں ہوگا کہ اگر وہ مجھ سے اتنے برس بھرپور عملی تعاون نہ کرتے تو یہ کتاب ہرگز منصۂ شہود پر نہ آسکتی۔ وہ سماجی علوم کے محقق کے طور پر اپنی گرانقدر مصروفیات کو ایک طرف رکھ کر اس تصنیف کے لئے اپنی علمی بصیرت، سوچ بچار، مہارتِ تدوین اور قوتِ ادراک کو نہایت فیاضی کے ساتھ بروئے کار لاتے اور اتنے صبر و بے لوثی کا مظاہرہ کرتے کہ انسانی حدودِ استطاعت سے آگے نکل جاتے۔

بہت سی خواتین، جنہوں نے انتہائی فراخ دلی کے ساتھ اس کتاب کے لئے اپنی خدمات پیش کیں، میں ان میں سے اپنی دوست اور رفیقہ کار Annette Ehrlich کی خاص طور پر ممنونِ احسان ہوں، انہوں نے بطور پروفیسر آف سائیکالوجی اور سائنٹیفک ایڈیٹوریل کنسلٹنٹ بے حد مصروف ہونے کے باوجود اپنا وقت نکالا اور بہت طویل مسوّدوں کو کئی بار پڑھا جن میں سے بالآخر "The Chalice and the Balde" برآمد ہوئی۔ ان کے بے لاگ

تنقیدی جائزوں اور مستحکم حمایت نے میرے ان جذبوں اور توانائیوں کو تقویت پہنچائی جو کبھی کبھی کمزور پڑ جاتی تھیں۔ میں Mara Keller، Fran Hosken، Carole Anderson، Rebecca McCann، Isolina Ricci اور آنجہانی Wilma Scott Heide کی بھی بے حد شکر گزار ہوں۔ ان میں سے ہر ایک نے مختلف مراحل پر سارے یا بیشتر مسوّدے کو پڑھا، اہم تجاویز دیں اور بھرپور حمایت و محبت کا اظہار کیا۔

میں "The Chalice and the Blade" اور Ashely Montague کی بھی زیرِ بارِ احسان ہوں جس نے اپنی دو کتابوں کو تشنۂ تکمیل چھوڑتے ہوئے اس کتاب کے مسوّدے کو حرف بحرف اور حاشیہ بحاشیہ پڑھا۔ یہ اس شخص کا میرے کام پر اظہار اعتماد تھا جس نے اپنی طویل اور غیر معمولی طور پر بارآور زندگی انسانی فلاح و بہبود کے لیے وقف کر رکھی ہے وہ میرے لیے بہت بڑی مدد اور حوصلہ افزائی کا باعث بنا۔

اس کتاب کو منظر عام پر لانے میں اہم کردار ادا کرنے والے ہر فرد کا مناسب طور پر شکریہ ادا کرنے کے لیے مجھے ایک اور کتاب لکھنا پڑ جائے گی۔

میری بیٹیوں Andrea اور Loren Eisler، میری ایجنٹ Ellen Levine میرے ایڈیٹر جان جانسن اور ''ہارپر اینڈ رو'' میں کام کرنے والے سبھی افراد بشمول Clayton Carlson، Vergينia Rich اور Dorian Gossy، Yvomnne Keller، Tom Dorsaneo اور دیگر لوگوں نے اس کتاب کے آخری مراحلِ تکمیل میں قابل قدر کردار ادا کیا ہے۔

دست تعاون بڑھانے والوں میں چند ایک جنہوں نے اپنی مخصوص شعبہ جاتی مہارتوں کے تناظر میں The Chalice and the Blade کے جاری کام میں اہم کردار ادا کیا، ان میں ماہرین آثاریات Marija Gimbutas اور Nicolas Platon، ماہرین معاشرتی علوم Jessie Bernard اور Joan Rockwell، ماہر نفسیات Jean Baker Miller، ماہرینِ ثقافت وفنون Elinor Gadon اور Merlin Stone, ماہر ادبی تقابل Gloria Orenstein، ماہر حیاتیات Vilmos Csani ماہرینِ ''نظام ہائے خود انتظامی'' و ''اختلال'' Ervin Laszlo اور Ralph Abrahans، ماہر طبعیات Fritjof Capra، ماہرینِ مستقبلیات Hazel Henderson اور Robert Jungk اور عالم دینیات Carol chrsit شامل تھے ان کا شکریہ بھی مجھ پر لازم ہے۔

اسی طرح جنہوں نے مسوّدے کے اجزا کی ریڈنگ کی یا اہم تجاویز دیں، معلومات فراہم

کیں اور میری ہمت افزائی کی ان میں حروف تہجی کی ترتیب سے درج ذیل شامل

، Marie cantlon، June Brindel، Anna Binicus، Lettie Bennet، Andra Akers ہیں

Allie، Helen Helmer، Mary Hardy، Maier Greif، Julia Eisler، Olga Eleftheriades

، عابدہ خانم، Ed Jarvis، Al Ikof، Barbara Honegger، Elizabeth Holm، Hixson

Hilkka، Mary and Floyd Morain ، سوسن مہرہ، Pat Salas، Samson Knoll

اور Pietila، Cosette Thomson۔ یہ فہرست طویل تر ہوتی جا رہی ہے مگر جگہ کی کمی ہر ایک کا ذکر کرنا ناممکن بنا رہی ہے۔ چنانچہ میں اپنی یادداشت کی کوتاہیوں پر معافی کی خواست گار ہوں کیونکہ میں ان کے نام لے کر ان سب کا شکریہ ادا کرنا چاہتی تھی جو میری کئی برسوں کی تحقیق اور تحریروں کے دوران میرے لئے ذہنی انگیخت کا ذریعہ اور میرا جذباتی سہارا بنے رہے۔

میں ان کا بھی خصوصی طور پر شکر ادا کرنا چاہتی ہوں جو مسوّدے کی تیاری کے بظاہر لامتناہی سلسلے میں میرے ساتھ شریک رہے، یا رہی ہیں۔ بالخصوص میں، Jeannie Adams،

Elizabeth، Sylvia Edgren، Kathy Campbell، Kedron Bryson، Ryan Bounds

، Jeannie McGregor، Cherie Long، Elizabeth Harrington، DiAna، Dolmat

اور Elizabeth Wahbe، Susanne Sharlione، Cindy Sprague، Mike Rosenberg

Jo Warley کا ادا کرنا چاہتی ہوں۔

MashalBooks.org

تعارف کتاب

یہ کتاب ایک دروازہ کھولتی ہے، اسے کھولنے کی چابی بہت سے لوگوں اور بہت سی کتابوں نے تیار کی ہے۔ اس کے پیچھے واقع مناظر کی پوری چھان بین کے لئے مزید لوگوں اور کتابوں کی ضرورت ہے۔ مگر اس دروازے کو ایک درز کی حد تک کھولنے سے بھی ہمارے ماضی کے بارے میں ایک نئے دلفریب و مسحور کن علم کا انکشاف ہوتا ہے اور ہمارے امکانی مستقبل کے بارے میں بھی ایک نیا منظر دکھائی دیتا ہے۔

میرے لئے اس دروازے کی تلاش عمر بھر کی ایک جستجو رہی ہے، میں نے اپنی زندگی کے اوائل میں دیکھا کہ مختلف تہذیبوں کے لوگ جس چیز کو ایک پیش پا افتادہ حقیقت کے طور پر لیتے ہیں وہ ہر جگہ وہی کی وہی نہیں ہے۔ اسی زمانے میں میرے دل میں انسانی حالات سے آگاہی پانے کا بھی ایک زبردست جذبہ اور شوق پیدا ہو گیا۔ جب میں بالکل چھوٹی سی تھی اپنے گردو پیش کی جس دنیا کو بظاہر محفوظ سمجھتی تھی وہ آسٹریا پر نازیوں کے قبضے سے تہہ و بالا ہو گئی۔ پھر جب میں نے چند مسلح لوگوں کو دیکھا کہ وہ میرے باپ کو گھسیٹتے ہوئے لے جا رہے ہیں تو میں کانپ کر رہ گئی۔ میری ماں نے کئی جتن کر کے خفیہ جرمن پولیس گسٹاپو سے میرے باپ کو حیرت انگیز طور پر چھڑوا لیا تو ہم نے اسی میں خیریت جانی کہ یہاں سے بھاگ نکلیں۔ چنانچہ میرے والدین اور میں طیارے میں سوار ہو کر پہلے کیوبا گئے اور بالآخر امریکہ جا پہنچے۔ اس تجربے نے مجھے تین مختلف تہذیبوں سے آشنا کر دیا۔ جن میں ہر ایک اپنی الگ الگ حقیقت رکھتی تھی۔ میں نے بہت سے سوالات مرتب کئے اور ہر کسی سے ان کا جواب مانگنے لگی۔ یہ سوالات میرے نزدیک فرضی و قیاسی نہیں ہیں اور کبھی بھی اتنے مشکل

MashalBooks.org

نہیں تھے کہ ان کا کوئی جواب ہی نہ ہو۔

ہم ایک دوسرے کو کیوں شکار کرتے ہیں اور پھر انہیں اذیتیں کیوں دیتے ہیں؟ ہماری دنیا رسوائے انسانیت انسانوں سے کیوں بھری پڑی ہے اور بالخصوص عورتوں سے رسوا کن سلوک کیوں کیا جاتا ہے؟ انسان اپنی ہی نوع پر وحشیانہ مظالم کیوں ڈھاتا ہے؟ وہ کیا چیز ہے کہ ہم ہمیشہ سے شفقت کی بجائے ظلم کی طرف، امن کی بجائے جنگ کی طرف اور تشکیل کی بجائے تباہ کاری کی طرف مائل رہتے ہیں؟

کرۂ ارض پر پائی جانے والی اقسامِ زندگی میں صرف ہم ہی ہیں جو درخت لگا سکتے ہیں اور کھیتوں میں فصل اگا سکتے ہیں، شاعری کر سکتے ہیں موسیقی ترتیب دے سکتے ہیں، حق و انصاف تلاش کر سکتے ہیں، اپنے بچوں کو پڑھنا لکھنا سکھا سکتے ہیں حتیٰ کہ ہنسنا اور رونا بھی جانتے ہیں۔ چونکہ ہم نئے حقائق کا تصور کرنے اور انہیں نہایت ترقی یافتہ ٹیکنالوجیز کے ذریعے بروئے کار لانے کی بے مثل صلاحیت رکھتے ہیں اس لئے ہم اپنے ارتقا کے صحیح معنوں میں شریک کار ہیں اور پھر بھی ہماری یہ باکمال نوع نہ صرف اپنے اس ارتقا کو ختم کرنے پر کمر بستہ دکھائی دے رہی ہے بلکہ روئے زمین پر پائی جانے والی بیشتر زندگی اور کرۂ ارض کو ماحولیاتی تباہ کاری یا ایٹمی فناہ کاری سے دوچار کرنے پر تلی ہوئی ہے۔

وقت گزرتا رہا اور میں اپنی پیشہ ورانہ تعلیم میں مصروف ہوگئی، بچے پیدا ہوئے، تحقیق و مطالعے میں انہماک بڑھتا رہا اور مستقبل کے بارے میں لکھتے رہنے کی وجہ سے میری سوچوں میں وسعت اور گہرائی آتی چلی گئی۔ بہت سے دیگر لوگوں کی طرح میں بھی اس بات کی قائل ہوگئی کہ ہم تیزی کے ساتھ ایک ارتقائی چوراہے کی طرف بڑھ رہے ہیں اور یہ کہ اس سے پہلے ہم نے جتنے راستے اختیار کئے تھے، ان میں اس سے زیادہ خطرناک راستہ کبھی شامل نہیں تھا۔ مگر اب ہمیں کون سا راستہ اختیار کرنا چاہیے؟

سوشلسٹ اور کمیونسٹ دعویٰ کرتے ہیں کہ ہمارے مسائل کی اصل جڑ سرمایہ دارانہ نظام (کیپیٹل ازم) ہے۔ سرمایہ داروں کا اصرار ہے کہ سوشلزم اور کمیونزم ہمیں تباہی کی طرف لے جا رہے ہیں۔ بعض یہ دلیل دیتے ہیں کہ ہماری پریشانیاں ہمارے صنعتی نمونوں کا نتیجہ ہیں اور یہ کہ سارا قصور ہمارے ''سائنسی تصور زندگی'' کا ہے۔ کچھ اور بھی ہیں جو انسان دوستی، تحریکِ نسواں اور حتیٰ کہ سیکولرازم کو موردالزام ٹھہراتے ہوئے ''اچھے پرانے وقتوں'' کی

MashalBooks.org

طرف لوٹ جانے میں عافیت سمجھتے ہیں جب زندگی کی ضرورتیں مختصر اور سادہ ہوا کرتی تھیں اور انسان پر مذہب کا غلبہ بھی زیادہ ہوتا تھا۔

تاہم جب ہم اپنے آپ پر نظر ڈالتے ہیں۔ جیسا کہ ٹیلی ویژن کے دباؤ اور روزانہ ناشتے پر اخبار بینی کے ایک تلخ معمول کے باعث ہم اپنے آپ کو دیکھنے کے عادی ہیں تو یوں دکھائی دیتا ہے کہ سرمایہ دار، سوشلسٹ اور کمیونسٹ اقوام ایک ہی طریقے سے خطرناک ہتھیاروں کی دوڑ میں شامل ہیں اور دیگر نامعقولیتوں میں ایک دوسری سے آگے بڑھنے کے لیے کوشاں ہیں جس سے ہم اور ہمارا معاشرہ دونوں ہی خطرات سے دوچار ہیں۔ اگر ہم اپنے ماضی کو دیکھیں تو جتنے ہُن، رومن، وائیکنگز اور شامی یا مسیحی صلیبی اور مذہبی عدالتوں کے قیام والے بطور ایک معمول کشت وخون کا بازار گرم کرتے رہے ہیں، ان سے کہیں زیادہ تشدد اور ناانصافی کا مظاہرہ قبل از سائنس اور قبل از صنعت کاری والے ان معاشروں میں بھی ہوتا رہا ہے جو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں۔

چونکہ پیچھے ہٹ جانا اصل سوال کا جواب نہیں ہے پھر ہم آگے کیسے بڑھیں؟ عہدِ نو کے بارے میں بہت کچھ لکھا جا رہا ہے۔ ایک بہت بڑا اور عدیم النظیر ثقافتی عمل تغیّر رونما ہو رہا ہے[1] مگر عملی طور پر یہ کیا معنی رکھتا ہے؟ ہماری روزمرہ کی زندگی اور ہمارے ثقافتی ارتقا میں کیا فرق پڑے گا، یعنی ان دونوں کا مستقبل کیا ہوگا؟ کیا ایک ایسے نظام کو بدلا جا سکتا ہے جو طویل جنگوں، معاشرتی ناانصافی اور ماحولیاتی عدم توازن کی طرف لے جا رہا ہو، اس کی جگہ ایسا نظام لے آنا جو امن، معاشرتی انصاف اور ماحولیاتی توازن قائم کر دے ایک حقیقت پسندانہ امکان ہوسکتا ہے؟ سب سے اہم سوال یہ ہے کہ معاشرتی ڈھانچے میں کیا تبدیلیاں لائی جاسکتی ہیں جو ایسے عمل تغیر (transformation) کو ممکن بنا دیں۔

ان سوالوں کے جوابات کی تلاش وجستجو نے مجھے اپنے ماضی، حال اور مستقبل کی از سرِ نو جانچ پڑتال پر آمادہ کر دیا جس پر یہ کتاب مبنی ہے The Chalice and the Blade انسانی معاشرے کے ایک نئے مطالعے کے ایک جزو کو پیش کرتی ہے جو اس سے قبل کئے گئے بیشتر مطالعات سے اس لحاظ سے مختلف ہے کہ اس میں پوری انسانی تاریخ (بشمول زمانہ قبل از تاریخ) اور پوری انسانیت کو پیش کیا گیا ہے (جس میں مذکر اور مؤنث دونوں صنفوں کو (بطور دو نصف نصف اجزائے انسانیت) سامنے لایا گیا ہے۔

آرٹ، آثاریات، مذہب، معاشرتی علوم اور بہت سے دیگر شعبہ ہائے تحقیق کی شہادتوں کے تانے بانے کو نئے نقوش میں ڈھال کر بہترین معلومات کا ایک مرقع تیار کیا گیا "The Charlice and the Blade" کی صورت اختیار کر گیا۔ یہ ہمیں ہماری تہذیب و ثقافت کے منابع کی بالکل ایک نئی کہانی سناتی ہے۔ یہ بتاتی ہے کہ جنگ اور ''صنفوں کی جنگ'' نہ تو مافوق البشری اور الہیاتی ہیں اور نہ حیاتیاتی فرمانِ تقدیر ہیں۔ یہ اس امر کی تصدیق فراہم کرتی ہے کہ بہتر مستقبل کا پورا پورا امکان موجود ہے اور........................ اور یہ دراصل ہمارے ماضی میں وقوع پذیر ہونے والے حسرت ناک اور دلدوز ڈرامے میں مضبوطی سے پیوست حقائق ہیں۔

انسانی صلاحتیں: دو متبادل

ہم پرانے دور کی ہم آہنگ اور پُر سکون زندگی کے روایتی قصوں سے آگاہ ہیں۔ بائیبل ہمیں ایک باغ کے بارے میں بتاتی ہے جس میں ایک عورت اور ایک مرد آپس میں اشیائے فطرت کے ساتھ ہم آہنگی کی زندگی بسر کر رہے تھے یہ اس وقت سے پہلے کی بات ہے جب ''نر'' معبود نے فیصلہ صادر کیا کہ اب سے عورت مرد کی مطیع فرمان ہوا کرے گی۔ چینی تاؤتی چنگ نے ایک زمانے کا ذکر کیا ہے جب نسوانی اصول مردانہ اصول کا تابعِ فرمان نہیں ہوا کرتا تھا۔ یہ وہ وقت تھا جب ماں کی دانائی کا ہر جگہ احترام ہوا کرتا تھا اور سب اسی کے پیروکار ہوتے تھے۔ قدیم یونانی شاعر نے ''سنہری نسل'' کے بارے میں لکھا ہے جو بڑی آسان اور پر سکون فضا میں زمین میں ہل چلایا کرتی تھی، یہ اس وقت سے پہلے کی بات ہے جب ایک ''گھٹیا نسل'' اپنے درمیان خدائے جنگ کو لے آئی۔ لیکن اگرچہ سکالرز کا اس بات پر اتفاق ہے کہ یہ تحریریں زمانہ قبل از تاریخ کے واقعات پر مبنی ہیں اور اس وقت کا حوالہ دیتی ہیں جب عورتیں اور مرد رفاقت کی زندگی بسر کرتے تھے لیکن ان قصوں کو روایتی طور پر ایک تخیل سے زیادہ اہمیت نہیں دی جاتی۔

جب علم آثاریات اپنے عہد طفولیت میں ہی تھا ہنرخ اور صوفیہ شلائمن کی کھدائیوں نے ہومر کی ٹرائے (Troy) کی حقیقت کے قیام میں مدد دی۔ آج کی نئی آثاریاتی کھدائیوں نے پرانی کھدائیوں کی از سر نو تعبیر سے، جو کہ مزید نئے سائنسی طریقوں کے ذریعہ کی جا رہی

ہے، پرانی کہانیوں کی تصدیق کر دی ہے جن میں باغِ عدن سے اخراج کی کہانی بھی شامل ہے۔عوامی یادداشتوں میں اولین زرعی (یا نئے حجری) معاشروں کے قصے بھی رچے بسے ہوئے ہیں جنہوں نے اس زمین پر پہلے پہل باغات لگائے تھے۔اسی طرح (جیسا کہ ماہر آثاریات سپائرڈون مارینا ٹوز نے تقریباً پچاس برس پہلے خیال ظاہر کیا تھا) وہ روایت ملتی ہے جس میں ایٹلانٹیس کی شاندار تہذیب کے سمندر میں غرق ہونے کا حال بیان کیا گیا ہے۔اسے بجا طور پر ''مینوآن'' تہذیب کی مسخ شدہ کہانی سمجھا جا سکتا ہے۔اب خیال کیا جاتا ہے کہ ''مینوآن'' اس وقت ختم ہوگئی تھی جب کریٹ اور اس کے اردگرد کے جزیروں کو زلزلوں اور تندو تیز سمندری لہروں نے شدید نقصان پہنچایا تھا۔[۲]

جس طرح کولمبس کے زمانے میں انکشاف ہوا کہ زمین چپٹی نہیں۔ اس نے ایک حیرت انگیز دنیا کی تلاش ممکن بنا دی جبکہ زمین ہمیشہ سے ویسی ہی چلی آرہی تھی، ان آثاریاتی انکشافات نے (جنہیں برطانوی ماہر آثار قدیمہ جیمز میلارٹ حقیقی آثاریاتی انقلاب قرار دیتا ہے) ہمارے مخفی ماضی کی حیرت انگیز دنیا کے در کھول دیئے۔[۳] یہ امن اور خوشحالی کے اس طویل دور کا انکشاف کرتے ہیں جب ہمارا معاشرتی، تیکنیکی اور ثقافتی ارتقا اوپر کی جانب جارہا تھا، یہ کئی ہزار برسوں پر محیط تھا جب تمام بنیادی ٹیکنالوجیز، جن پر تہذیب کی تعمیر ہوئی ہے ایسے معاشروں میں بھرپور ترقی پا رہی تھیں جن میں نہ مردوں کا غلبہ تھا، نہ کہیں تشدد اور نظامِ مراتب دیکھنے میں آتا تھا۔

اس امر کی بھی تصدیق ہوئی ہے کہ بہت سے قدیم معاشرے تھے جو ہمارے معاشرے سے کلیتاً مختلف تھے مگر ان کے آرٹ، داستانوں اور حتیٰ کہ تاریخی تحریروں میں ہستئی مطلق (Deity) کی شبیہوں کو مؤنث ظاہر کیا گیا تھا، اگرچہ ان کی بعض شبیہیں ناقابل وضاحت ہیں۔تاہم ان میں کائنات کا تصور بطور ایک ایثار پیشہ ماں دیا جانا، زندہ ہے اور ہمارے دور میں پہنچ چکا ہے (اگرچہ وہ ترمیم شدہ شکل میں ہے) چین میں اب تک دو دیویوں "Tsu" اور "Kuan Yin" کی رحمدل اور فیض رساں ہستیوں کے طور پر وسیع پیمانے پر پوجا کی جارہی ہے مختصراً یہ کہ ماہر بشریات پی ایس سنگرین کہتا ہے کہ 'کوآن ین'(Kuan Yin) مقبول ترین چینی دیوی ہے۔[۴] اسی طرح مادرِ خدا ''میری'' کی تعظیم وتکریم وسیع پیمانے پر ہوتی ہے۔اگرچہ کیتھولک دینیات میں ان کا رتبہ گھٹا کر ''غیرالوہی'' کر دیا گیا ہے لیکن ان کی الوہیت ان

کے خطاب ''مادرِ خدا'' میں بھی مضمر طور پر موجود ہے اور لاکھوں افراد کی نمازوں میں بھی تسلیم کی جاتی ہے جو ہر روز ان سے پُر شفقت حفاظت و تسکین کے لئے مناجات کرتے رہتے ہیں۔ مزید برآں یسوع مسیح کی ولادت، موت اور قیامت کی کہانی حیرت انگیز طور پر ان قدیم ''پراسرار رسوم'' سے مشابہ ہے جو ایک الوہی ماں اور اس کے بچے کے گرد گھومتی ہیں یا ''Demeter'' اور اس کی بیٹی ''Kore'' کی پوجا میں مذکور ہے۔

اس بات میں بھی ایک گہرا مفہوم پایا جاتا ہے کہ قدیم زمانے میں الوہی طاقتوں کے انسانی ظہور کو مرد کی بجائے عورت کی شکل میں پیش کیا جاتا تھا۔ جب ہمارے آباؤ اجداد نے دائمی سوالات (ہم پیدا ہونے سے پہلے کہاں سے آئے؟ اور مرنے کے بعد کہاں جائیں گے؟) پوچھنا شروع کئے انہوں نے یہ ضرور سوچا ہوگا کہ زندگی ایک عورت کے جسم سے برآمد ہوتی ہے۔ ان کے لئے اس بات کا تصور بھی ایک فطری امر ہوگا کہ وہ کائنات کو سب کچھ عطا کرنے والی ماں کے مماثل سمجھیں جس کے رحم میں سے زندگی پھوٹتی ہے اور جس سے سلسلہ ہائے روئیدگی کی طرح موت کے بعد دوبارہ زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ اس بات میں بھی ایک مفہوم موجود ہے کہ جن معاشروں میں کائنات پر حکمرانی کرنے والی قوتوں کا یہ تصور تھا ان کا سماجی ڈھانچہ ان معاشروں سے یقیناً بہت مختلف ہوتا ہوگا جو ایک ایسے الوہی باپ کی عبادت کرتے تھے جو بجلی کے کڑکوں اور تلوار کا مالک تھا یا صرف تلوار لہراتا دکھائی دیتا تھا۔ یہ بات بھی مزید منطقی دکھائی دیتی ہے کہ ان معاشروں میں عورتوں کو مطیع شے نہیں سمجھا جاتا ہوگا جو کائنات پر حکمرانی کرنے والی قوتوں کو زنانہ شکل کی حامل تصور کرتے تھے اور یہ کہ دیکھ بھال کرنے، محبت و شفقت کرنے اور عدم تشدد کی ''زنانہ'' صفات کو ان معاشروں میں بڑی قدر کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ جو چیز اپنے اندر کوئی معقولیت نہیں رکھتی وہ یہ نتیجہ اخذ کرنا ہے کہ جن معاشروں میں مرد عورتوں کو مغلوب کر کے نہیں رکھتے وہ ایسے معاشرے ہوتے ہیں جن میں عورتیں مردوں کو مغلوب کر کے رکھتی ہیں۔

تاہم جب 19ویں صدی میں ایسے معاشروں کے بارے میں پہلی شہادت کا سراغ لگایا گیا تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ وہ یقیناً ''مادرسری'' (matriarchal) ہوں گے۔ پھر جب اس شہادت نے اس نتیجے کی حمایت کی تو یہ دلیل دینے کا پھر رواج بن گیا کہ انسانی معاشرہ مرد کے زیر فرمان ہے اور ہمیشہ ایسا ہی رہے گا لیکن اگر ہم حقیقت کے مروّجہ ماڈلوں

سے خود کو آزاد کرا لیں تو صاف ظاہر ہے کہ ایک اور منطقی متبادل موجود ہے: کہ ایسے معاشرے ہو سکتے ہیں جن میں تفریق و امتیاز کو لازماً کمتری یا برتری کے آئینے میں نہیں دیکھا جاتا۔

انسانی معاشرے کی تذکیر و تانیث کے نظریئے سے ازسرِ نو جانچ پڑتال کا ایک نتیجہ یہ نکلا کہ ثقافتی ارتقا کا ایک نیا نظریہ سامنے آ گیا، یہ نظریہ جسے میں نظریۂ ثقافتی تقلیب کہتی ہوں یہ تجویز دیتا ہے کہ انسانی تہذیب کے تنوع کی عظیم سطح کے پیچھے معاشرے کے دو بنیادی ماڈل کارفرما ہوتے ہیں:

پہلا ماڈل جسے میں ''تسلط ماڈل'' کہتی ہوں وہ ہے جسے عام طور پر پدرسری یا مادرسری کہا جاتا ہے۔ یعنی انسانیت کے ایک نصف کو دوسرے نصف سے برتر قرار دے دینا۔ دوسرا ماڈل جس میں معاشرتی تعلقات بنیادی طور پر اصولِ رابطہ پر مبنی ہوتے ہیں نہ کہ درجہ بندی پر۔ اسے شراکت داری ماڈل کہا جائے تو زیادہ مناسب ہوگا۔ اس ماڈل میں ہماری انواع میں پائے جانے والے اصل بنیادی فرق ''نر'' اور ''مادہ'' سے شروع ہوتا ہے اس تنوّع کو نہ کمتری سے تعبیر کیا جاتا ہے نہ برتری سے۔(۵)

نظریہ ثقافتی تقلیب مزید کہتا ہے کہ ہمارے ثقافتی ارتقا کے اصل دھارے کا رُخ شراکت داری کی طرف تھا مگر درمیان میں انتشار اور بدنظمی کا دور حائل ہو گیا جس سے ایک کلّی ثقافتی انقطاع (total cultural disruption) واقع ہو گیا۔ اس طرح ایک بنیادی معاشرتی تبدیلی (شفٹ) نمودار ہو گئی۔ مغربی معاشروں کی تحقیق سے حاصل ہونے والی وافر معلومات کی دستیابی (جو کہ نسلی تقابل پر مغربی سوشل سائنس کے خصوصی فوکس سے ممکن ہوئی ہے) نے یہ ممکن بنا دیا ہے کہ مغربی ثقافتی ارتقا کا تجزیہ کر کے اس تبدیلی (شفٹ) کا تفصیلی ریکارڈ رکھا جائے۔ تاہم اس امر کی علامات موجود ہیں کہ دنیا کے دوسرے خطوں میں بھی ''شراکت داری ماڈل'' سے ''تسلط ماڈل'' تک کی تبدیلیوں کو کم و بیش اس کے متوازی سمجھا جا سکتا ہے۔

اس کتاب کا ٹائیٹل "The Chalice and the Blade" ماقبل از تاریخ کے دوران مغربی تہذیب کے اس زبردست نقطۂ انقلاب سے ماخوذ ہے جب ہمارے ثقافتی ارتقا کی سمت یکدم الٹ گئی۔ بنیادی شاخیں پھوٹنے کے اس مرحلے میں ایسے معاشروں کے ثقافتی ارتقا کا عمل

فوری طور پر تھم گیا جو زندگی کو وجود میں لانے اور اس کو پروان چڑھانے والی قوتوں کی پرستش کیا کرتے تھے (ان قوتوں کا اب تک قدیم کٹورے یا مقدس جام "Chalice" کے ذریعے علامتی اظہار کیا جاتا ہے)

اب وہاں زمانہ قبل از تاریخ کے افق پر ہمارے کرۂ ارض کے مضافاتی علاقوں سے جانے والے حملہ آوروں کا ظہور ہوا جنھوں نے وہاں کی معاشرتی تنظیم کی ایک بالکل مختلف شکل متعارف کرا دی۔ جیسے کہ یونیورسٹی آف کیلی فورنیا کی ماہر آثاریات مریجہ گمبوٹس لکھتی ہے۔ ''یہ حملہ آور وہ لوگ تھے جو خنجر (Blade) کی ہلاکت خیز قوت کی پرستش کیا کرتے تھے۔(۷) وہ اس قوت کے پجاری تھے جو زندگی عطا کرنے کی بجائے اسے چھین لیتی ہے'' یعنی یہ غلبہ مسلط کرنے والی حتمی قوت کے مظہر تھے۔

ارتقائی چوراہے

آج ہم ایک اور ارتقائی چوراہے اور امکانی طور پر فیصلہ کن شاخ دار مقام پر کھڑے ہیں۔ یہ ایک ایسا موقع ہے جب خنجر (Blade) کی ہلاکت خیزی کی قوت کہیں زیادہ بڑھ کر کئی لاکھ میگا ٹن ایٹمی ہتھیاروں تک پہنچ چکی ہے اور سارے کے سارے انسانی کلچر کو ملیامیٹ کرنے کی دھمکیاں دے رہی ہے "The Chalice and the Blade" میں قدیم و جدید تاریخ کے نئے انکشافات ہمارے ماضی کی کہانی میں محض ایک نئے باب کا اضافہ نہیں ہیں، سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ یہ نیا علم ہمارے حال اور امکانی مستقبل کے بارے میں کیا کہتا ہے:

مردوں نے ہزاروں سال جنگیں لڑی ہیں اور خنجر (Blade) ایک مردانہ علامت رہا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مرد لازمی طور پر متشدد اور جنگجو ہیں۔(۸) ساری تاریخِ معلومہ اس امر کی گواہ ہے کہ پُر امن اور غیر متشدد مرد ہمیشہ موجود رہے ہیں۔ علاوہ ازیں زمانہ قبل از تاریخ کے ان معاشروں میں ایسے مرد اور عورتیں رہی ہیں جنہیں ان کی ''عطا'' کرنے اور پرورش کرنے کی قوت کے باعث عزت ملتی تھی "Chalice" اسی قوت کا مظہر تھا۔ بنیادی مسئلہ مرد بطور ایک جنس (Sex) نہیں۔ مسئلے کی اصل جڑ اس معاشرتی نظام میں پیوست ہے جس میں خنجر کی قوت کو وجہ فضیلت بنا کر پیش کیا جاتا ہے۔ جس میں مردوں اور عورتوں کو یہ

سکھایا جاتا ہے کہ وہ حقیقی مردانگی کو تشدد اور غلبے کے طور پر دیکھا کریں اور جو مرد اس معیار پر نہیں پہنچ پاتے انہیں ''بے حد نرم'' یا ''زن صفت'' سمجھیں۔

بہت سے لوگوں کے لیے یہ یقین کرنا بہت مشکل ہے کہ انسانی معاشرے کی کوئی اور تشکیل بھی ممکن ہے جبکہ اس امر کا تصور ہی نہیں کیا جاتا کہ ہمارا مستقبل عورتوں یا نسوانیت سے متعلقہ کسی چیز سے منسلک ہوسکتا ہے۔ ایسے تصورات یا عقائد کا ایک سبب یہ ہے کہ مردوں کے غلبے والے معاشروں میں عورتوں یا نسوانیت سے تعلق رکھنے والی ہر چیز کو ایک خود کار طریقے سے ثانوی یا زنانہ قرار دے کر ناقابل توجہ سمجھا جاتا ہے، بالفرض توجہ دینی پڑ ہی جائے تو اس وقت دی جاتی ہے جب ''زیادہ اہم'' مسائل نمٹا دیئے گئے ہوں۔ ایک اور سبب یہ ہے کہ ہم نے ضروری معلومات اکٹھی نہیں کیں۔ اگرچہ انسانیت دونصفوں (مردوں اورعورتوں) کی یکجائی سے وجود میں آئی ہے زیادہ تر انسانی معاشروں میں سربرآوردہ کردار یا واحد اداکارا کثر مذکر رہا ہے۔

اس عمل کے نتیجے میں، جسے لفظاً "The study of man" کہہ دیا جاتا ہے، بیشتر ماہرین معاشرتی علوم کو ایسی نامکمل اور مسخ شدہ معلومات (data base) کی بنیاد پر کام کرنا پڑا ہے۔ کوئی دوسرا سیاق وسباق ہوتا تو اس کو فوری طور پر ناقص تسلیم کرلیا جاتا۔ پہلے کی طرح اب بھی عورتوں سے متعلقہ معلومات کو لاپرواہی کے ساتھ "Women's studies" کی ذہنی تنگ گلی کی طرف دھکیل دیا جاتا ہے۔ مزید برآں بالکل قابل فہم انداز میں بوجہ نسوانی زندگی کے لئے اس کی فوری اہمیت کے ،(اگرچہ اسے طویل عرصے تک نظر انداز کئے رکھا گیا) علمبردارانِ حقوقِ نسواں کی طرف سے ہونے والی بیشتر تحقیق میں توجہ تحقیقِ نسواں برائے نسواں کے مضمرات پر مرکوز کی گئی ہے۔

یہ کتاب اس لحاظ سے منفرد ہے کہ اس میں توجہ ان مضمرات پر مرکوز کی گئی ہے کہ ہم ایک معاشرتی نظام کی کلیّت وسالمیّت کی خاطر انسانیت کے دونصفوں (two halves) کے درمیان کے درمیان تعلقات کو کیسے ہم آہنگ بنائیں۔ یہ بالکل ایک واضح امر ہے کہ ان تعلقات کی جو بھی ساخت وترکیب ہوگی اس کے مرد اور عورت دونوں کی زندگیوں کے لئے فیصلہ کن مضمرات ہوں گے جو ہمارے روز مرہ کے کرداروں اور حقِ انتخابِ زندگی (options) کے لئے بھی فیصلہ کن ہوں گے۔ مگر اسی طرح کی ایک اور بات اتنی ہی اہمیت

رکھتی ہے اگرچہ اسے اب تک عموماً نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ اس کی نوعیت ہی ایسی ہے کہ جونہی اس کا اظہار کیا جاتا ہے واضح ہو جاتی ہے اور وہ یہ ہے کہ ہم جملہ انسانی تعلقات میں سے اس اہم ترین بنیادی معاملے کی جس انداز میں تشکیل کریں گے (جس کے بغیر ہماری انواع آگے بڑھ ہی نہیں سکتیں) وہ ہمارے اداروں میں سے ہر ایک ادارے پر، ہماری اقدار پر (جیسا کہ ہم اگلے صفحات پر بتائیں گے) اور ہمارے تہذیبی و ثقافتی ارتقا کے رُخ پر بے پناہ اثرات مرتب کرے گا۔ خاص طور پر اس امر کا تعین کرے گا کہ اس ارتقا کو پُر امن رہنا ہے یا جنگجو یا نہ رہنا ہے۔

اگر ہم توقف کریں اور اس کے بارے میں سوچیں تو انسانیت کے زنانہ نصف اور مردانہ نصف کے تعلقات کی تشکیل کے صرف دو بنیادی طریقے دکھائی دیتے ہیں۔ تمام معاشرے یا تو تسلط ماڈل (dominator model) پر متشکل ہوئے ہیں یا شراکت داری ماڈل (partnership model) پر بنے ہوئے ہیں۔ اوّل الذکر وہ ہیں جن میں انسانوں کا ایک سلسلۂ مراتب ہے جسے قوت کے استعمال یا قوت کی دھمکیوں کی پشت پناہی حاصل ہوتی ہے۔ مؤخر الذکر ماڈل مختلف تنوّعات پر مشتمل ہوتا ہے۔ مزید برآں اگر ہم انسانی معاشرے کا اس تناظر میں نئے سرے سے جائزہ لیں جو عورت اور مرد ''دونوں'' کو زیرِ غور رکھتا ہے تو ہم یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ اس میں کئی نمونوں یا نظاموں کی جھلک ملتی ہے۔ بعضوں میں تسلط کا عنصر زیادہ ہے بعضوں میں شراکت داری زیادہ ہے اور وہ معاشرتی تنظیم کے طور پر اپنا اظہار کرتے ہیں۔

مثال کے طور پر روایتی تناظر سے ہٹلر کا جرمنی، خمینی کا ایران، سمورائی کا جاپان اور ازٹکوں کا میزو امریکہ مختلف نسلوں، نسلی منابع، تیکنیکی ترقی اور جغرافیائی محل وقوع والے متنوع معاشرے ہیں مگر نظریۂ ثقافتی تقلیب کے نئے تناظر سے دیکھا جائے تو وہ نہ صرف مردوں کے جابرانہ تسلط کی خصوصیات کے حامل ہیں بلکہ ان میں ایک عمومی مراتب وار مستبدانہ معاشرتی ڈھانچہ دکھائی دیتا ہے جو معاشرتی تشدد اور بالخصوص جنگجویانہ مزاج کے حامل ہیں۔(۹)

اس کے برعکس ہم ایسے مختلف المزاج معاشروں کے مابین حیران کن مشابہت پاتے ہیں جن کے اندر بے انتہا تنوع پایا جاتا ہے مگر وہ جنسی اور شہوانی مساوات کے زیادہ قائل

ہیں۔خصوصیات کے لحاظ سے ایسے ''شراکت دار ماڈل'' والے معاشرے نہ صرف زیادہ پر امن ہیں بلکہ ان میں مراتب داری اور تحکم پسندی (hierarchy and authoritaranism) بھی بہت کم دکھائی دیتی ہے۔ اس کی شہادت معلومات علم البشر یعنی (The BaMbuti and the kung) جدید معاشروں میں مزید شہوانیاتی مساوات (یعنی سکنڈے نیویائی اقوام، مثلاً سویڈن) اور قبل از تاریخ زمانے اور تاریخی زمانے کی معلومات "data" سے ملتی ہے جن کی تفصیلات آگے کے صفحات میں دی جائیں گی۔ (۱۰)

سماجی تنظیموں کے ''تسلط ماڈل'' اور ''شراکت داری ماڈل'' کے ذریعے حال اور امکانی مستقبل کا تجزیہ کر کے ہم دائیں اور بائیں، کیپیٹل ازم کمیونزم اور سیکولرازم اور حتیٰ کہ تذکیریّت و تانیثیّت کے مابین مروجہ ابعادِ قطبین (polarities) سے بھی ماورا ہونا شروع کر سکتے ہیں۔ اس سے ایک وسیع تصویر جو سامنے آتی ہے وہ ظاہر کرتی ہے کہ معاشرتی انصاف کے لئے چلنے والی تمام جدید ''بعد از روشن خیالی'' تحریکیں (post-enlightenment movements) خواہ وہ مذہبی ہیں یا سیکولر، نیز حالیہ حقوقِ نسواں کی تحریکیں امن اور ماحولیاتی تحریکیں ''تسلط ماڈل'' سے ''شراکت داری ماڈل'' کی طرف منتقلی کے لئے ایک خفیہ دھکے کی حیثیت رکھتی ہیں۔ علاوہ ازیں ہمارے دور میں جو عدیم النظیر طاقتور ٹیکنالوجیز وجود میں آئی ہیں انہیں بھی ان تحریکوں کے ارتقائی دھکے کا حصہ سمجھا جانا چاہیے جو جہد للبقا (survival) کے لئے چل رہی ہیں۔

اگر ہم اپنے نظریۂ ثقافتی تقلیب کے تناظر میں اپنے ثقافتی ارتقا کے پورے دور کو دیکھیں تو ہم اپنے حالیہ عالمی بحرانوں کی جڑیں زمانہ قبل از تاریخ میں واقع ہونے والے انحراف (shift) میں پیوست پائیں گے۔ جس نے نہ صرف ہمارے معاشرتی ڈھانچے میں بے پناہ تبدیلیاں کیں بلکہ ٹیکنالوجی میں بھی بہت ردّوبدل کیا ہے۔ یہ انحراف ان ٹیکنالوجیز کی اہمیت کم کرنے کی صورت میں رونما ہوا جو زندگی کو برقرار رکھتی یا اسے آگے بڑھنے میں مدد دیتی ہیں۔ اس کے مقابلے میں ان ٹیکنالوجیز کو بہت زیادہ اہمیت دی جانے لگی جن کی علامت ''خنجر'' (Blade) ہے۔ یعنی ایسے طریقوں کو فروغ دیا گیا جو تباہی پھیلانے اور دوسرے کو مغلوب کرنے کے لئے استعمال کئے جاتے تھے۔ تاریخ معلومہ کا بیشتر حصہ ان ٹیکنالوجیز کو اہمیت دینے پر صرف ہو گیا ٹیکنالوجی میں آگے بڑھنے کی یہی دُھن (نہ کہ ٹیکنالوجی بذاتِ

MashalBooks.org

خود "per se") آج سارے کرۂ ارض پر ہر قسم کی زندگی کو خطرے میں ڈال رہی ہے۔[۱۱]

بے شک یہ دلیل دینے والے لوگ بھی ہوں گے کہ چونکہ زمانہ قبل از تاریخ میں معاشرے کے "شراکت داری ماڈل" سے "تسلط ماڈل" کی طرف منتقلی ہوئی تو یقیناً ان میں توافق پذیر پائی جاتی ہو گی تاہم یہ دلیل کہ ارتقا میں کوئی چیز واقع ہوئی وہ توافق پذیر تھی معقول نہیں۔ جیسا کہ ڈینوساروں کا ناپید ہو جانا ایک واضح گواہی دیتا ہے۔ کسی صورت میں ارتقائی اصطلاحات میں ایسا فیصلہ صادر کرنے کے لیے بنی نوع انسان کے ثقافتی ارتقاء کا عرصہ بہت تھوڑا ہے۔ اصل نقطہ یہ ہے کہ ہماری ٹیکنالوجیکل ترقی کی موجودہ اعلیٰ سطح کے لحاظ سے معاشرتی تنظیم کا ایک تسلط ماڈل نامربوط ہے۔

چونکہ یہ تسلط ماڈل اب اپنی منطقی حدود کو پہنچتا ہوا دکھائی دے رہا ہے بہت سے مرد اور عورتیں آج معاشرتی تنظیم کے پرانے اصولوں کو جن میں ان کے ڈھلے ڈھلائے جنسی کردار بھی شامل ہیں، مسترد کر رہی ہیں۔ بہت سے دیگر لوگوں کے لئے یہ تبدیلیاں نظام کے ٹوٹ جانے کی صرف علامات ہیں۔ انتشار اور بدنظمی کا ہر قیمت خاتمہ ہو جانا چاہیے۔ یہ محض اس لئے ہے کہ ہم جس دنیا کو جانتے ہیں وہ اتنی تیزی سے متغیر ہو رہی ہے کہ اس کے طول و عرض کے لوگوں کو صاف دکھائی دینے لگا ہے کہ دیگر متبادل صورتیں موجود ہیں۔

جام و خنجر (The Chalice and the Blade) ان متبادل صورتوں کا کھوج لگاتی ہے لیکن اس میں جو مواد دیا جا رہا ہے وہ بتاتا ہے کہ ایک بہتر مستقبل قابلِ حصول ہے، اس سے یہ مطلب ہرگز نہیں نکلتا کہ (جیسا کہ بعض لوگ ہمیں باور کرانے کی کوشش کر سکتے ہیں) ہم ایٹمی خطرے یا ماحولیاتی تباہی سے لازمی طور پر بچ کر نئے اور بہتر زمانے میں جا پہنچیں گے۔ آخری تجزیئے کے طور پر یہ کہنا ہے کہ انتخاب ہمارے پاس ہی ہے۔

انتشار یا عملِ تغیّر

وہ مطالعہ و تحقیق جس پر "جام اور خنجر" (The Chalice and the Blade) مبنی ہے، اسے ماہرین معاشرتی علوم "سرگرم تحقیق" کہتے ہیں۔[۱۲] یہ محض "کیا تھا، کیا ہے یا کیا ہو سکتا ہے" کا مطالعہ نہیں ہے بلکہ اس کی تلاش و جستجو بھی ہے کہ ہم اپنے ثقافتی ارتقا میں زیادہ موثر طور پر کیسے مداخلت کر سکتے ہیں۔ اس تعارفِ کتاب کا باقیماندہ حصہ اصلاً اس قاری کی نذر

ہے جو اس تحقیق کے بارے میں مزید جاننے کا خواہشمند ہے۔ دیگر قارئین غالباً سیدھے باب نمبر ا پر پہنچنا چاہتے ہوں گے یا اس حصے کی طرف بعد میں آنا پسند کریں گے۔

اب تک، ثقافتی ارتقا، بنیادی طور پر فنیاتی اور معاشرتی ترقی کی سادہ ترین سطح سے شروع ہو کر پیچیدہ سے پیچیدہ ترین سطحوں کی طرف پیشروی پر مرکوز رہا ہے۔(۱۳) اس میں زیادہ تر فنیاتی منتقلی (shifts) پر خاص توجہ دی گئی ہے جیسے کہ زراعت کی ایجاد تھی، صنعتی انقلاب تھا اور مزید تازہ پیش رفت بعد از صنعتی یا نیوکلیائی/برقیاتی دور وغیرہ ہیں۔(۱۴) اس قسم کی ترقی یا تحریک صاف ظاہر ہے کہ اپنے اندر بے حد اہم معاشرتی اور معاشی مضمرات رکھتی ہے مگر یہ ہمیں انسان کی کہانی کا صرف ایک حصہ بتاتی ہے۔

کہانی کا دوسرا حصہ ایک مختلف قسم کی تحریک سے تعلق رکھتا ہے۔ معاشرتی تبدیلیاں کہیں معاشرتی تنظیم کے شراکت داری ماڈل کی جانب رہیں اور کہیں تسلط ماڈل کی طرف رہیں۔ جیسا کہ پہلے بیان کیا جا چکا ہے۔ نظریۂ ثقافتی تبدیلی کا مرکزی قضیّہ یہ ہے کہ ثقافتی ارتقا برائے تسلط اور شراکت داری پر مبنی معاشروں کی سمت بہت مختلف ہے۔

یہ نظریہ کسی حد تک تو اس اہم ''فرق'' سے ماخوذ ہے جسے عمومی طور پر ملحوظ نہیں رکھا جاتا، وہ یہ ہے کہ ''ارتقا'' کی اصطلاح کے دو معنی ہیں سائنسی زبان میں یہ ایک حیاتیاتی امر ہے جسے ذرا وسعت دے کر زندہ انواع کی ثقافتی تاریخ کہا جاتا ہے لیکن ارتقا ایک معیاری اصطلاح ("normative term) بھی ہے۔ دراصل اسے اکثر ترقی کے مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے یہ نچلی سطح سے اوپر کی سطحوں کی جانب تحرک کے معنوں میں بولا جاتا ہے۔

درحقیقت ہمارا فنیاتی ارتقا نیچے سے اوپر کی سطحوں کی طرف ایک سیدھی ہموار تحریک کے طور پر نہیں ہوا بلکہ ایک ایسے عمل کے طور پر ہوا ہے جس میں بڑے پیمانے پر عمومی تنزل یا رجعت کے طویل وقفے آتے رہے۔ جیسے یونانی تاریک عہد اور متوسط عہد کے وقفے (۱۵) ۔تاہم ایک زیر زمین دھکا واضح طور پر محسوس ہوتا رہا جو بڑے پیمانے کی فنیاتی اور معاشرتی پیچیدگی (complexity) کی طرف بڑھنے پر زور دے رہا تھا۔ اسی طرح ایک انسانی دھکا بھی تھا جو اعلیٰ اہداف، سچائی، حسن اور انصاف کی طرف پیش قدمی کے لیے دباؤ ڈال رہا تھا۔ لیکن چونکہ وحشت و بربریت، تشدد اور جنگ و جدل کے واقعات بھی ہو رہے تھے جن کا تاریخِ معلومہ میں بڑے پیمانے پر اظہار ہوا، اس لیے ان اہداف کی طرف سیدھا سیدھا

تحرّک بمشکل ہی ہو سکا ہے یہاں بھی بڑے پیمانے پر رجعت یا پسپائی ہوئی ہے۔

نقشہ مرتب کر کے اس کو ٹیسٹ کرنے کے لیے معلومات(data) اکٹھی کرتے ہوئے، میں جن معاشرتی حرکیات کا مطالعہ کرتی رہی ہوں ان کے لیے میں نے معاشرتی اور قدرتی، دونوں اقسام کے علوم کی بہت سے میدانوں سے متعلقہ دریافتوں اور نظریات کو یکجا کیا ہے۔ اس سلسلے میں دو منابع خاص طور پر مفید رہے ہیں۔ نئے حامیانِ حقوقِ نسواں جو علم وفضل سے آراستہ ہیں اور حرکیاتِ تغیر(Dynamics of Change) کے بارے میں نئی سائنسی دریافتیں۔

مختلف نظام کس طرح وجود میں آتے ہیں، خود کو کیسے برقرار رکھتے ہیں اور کیسے تبدیل ہوتے ہیں، اس کی ازسر نو تشخیص کی ضرورت کا احساس سائنس کے کئی شعبوں میں تیزی سے پھیل رہا ہے، اس احساس کو اجاگر کرنے میں کیمسٹری اور عمومی نظامات میں نوبل پرائز یافتہ Ilya Prigogine اور Isabel Stengers، فزکس میں Robert Shaw اور Marshall Feigenbaum اور بیالوجی میں[16] Humberto Maturana اور Francisco Varela کی تصانیف نے نمایاں کردار ادا کیا ہے۔ نئے ابھرنے والے اس مجموعۂ نظریات ومعلومات کو بعض اوقات ''نئی طبیعیات'' کا نام دیا جاتا ہے۔ اسے Fritjof Capra کی کتابوں "Tao of Physics" اور "The Turning point" جیسی تصانیف نے شہرت ومقبولیت دلائی ہے[17]۔ اسے بعض اوقات نظریۂ ''انتشار'' بھی کہا جاتا ہے کیونکہ سائینس کی تاریخ میں اس نے پہلی بار ''ناگہانی اور اساسی'' ردّوبدل پر توجہ مرکوز کی ہے، یہ اس نوع کا ردّوبدل ہے جس سے دنیا آئے دن زیادہ سے زیادہ دوچار ہوتی رہتی ہے۔

ممتاز ماہرین حیاتیات(Biologists) اور معدوم حیوانات و نباتات(Paleontologists) کی نئی تصانیف جن میں ارتقائی تبدیلیوں کی تحقیق کی گئی ہے خاص دلچسپی کی حامل ہیں۔ ان میں Vilmos Csanyi، Niles Eldredge اور Stephen Jay Gould خاص طور پر قابل ذکر ہیں، اسی طرح Erich Jantsch، Ervin Laslo اور David Loye جیسے سکالرز ہیں جنہوں نے ثقافتی ارتقا اور سماجی علوم کے لیے نظریۂ انتشار کے مضمرات کا جائزہ لیا ہے[18] لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسانی ثقافتی ارتقا وہی چیز ہے جسے حیاتیاتی ارتقا کہا جاتا ہے۔ فطری علوم اور معاشرتی علوم(natural and social sciences) میں اگرچہ بہت اہم فرق ہے اور

معاشرتی نظاموں کے مطالعے کو میکانیاتی تخفیف و تجزیہ پسندی (mechanistic reductionism) سے الگ رکھنا چاہیے، ان میں اس معاملے میں اہم مماثلتیں بھی ہیں کہ دونوں نظاموں میں تبدیلیوں کے وقوع کو اور نظاموں میں خود تنظیمی کی صلاحیت کو ایک ہی طرح دیکھتے ہیں۔

جُملہ نظام اپنے اہم اجزا کی ''باہمی کمک'' اور ''تعامل برائے ہم زیستی'' کے ذریعے خود کو برقرار رکھتے ہیں۔ چنانچہ اس کتاب میں پیش کردہ نظریۂ ثقافتی تقلیب کے بعض حیرت انگیز پہلوؤں اور نظریۂ انتشار (جیسا کہ قدرت اور مختلف نظاموں نے اسے پڑوان چڑھایا ہے) کے حوالہ سے سائنس دان یکساں سوچ رکھتے ہیں اور ہمیں بتاتے ہیں کہ ''کیا ہوا تھا''، اور جب ان نظاموں میں دوعملی پیدا ہوگی اور ان کی نئی شاخیں پھوٹیں گی ''اس وقت کیا ہوگا'' اور جب پورے نظام میں ایک تیز رفتار تقلیب رونما ہوگی تو ''اس وقت کیا کیا دیکھنے کو ملے گا''۔(۱۹)

مثال کے طور پر Eldredge اور Gould کہتے ہیں کہ ارتقا ہمیشہ اوپر کی منزلوں کی طرف ہی پیش قدمی نہیں کرتا، اس میں توازن کے لیے لمبے لمبے پھیلاؤ بھی آسکتے ہیں، یہ بھی ہوتا ہے کہ کوئی بڑی تبدیلی آتی ہوئی دکھائی نہیں دیتی اس میں نئی انواع کے پھوٹنے سے دوشاخہ تقسیم، یا متعدد شاخوں کا ظہور بھی ہوسکتا ہے۔ جو کسی نوع کے جدّ اعلیٰ کے مسکن کے محیط یا اس کے ارد گرد تبدیلیوں کی وجہ سے رونما ہوتی ہیں(۲۰) اور اگرچہ نئی انواع پھوٹنے اور معاشرے کی ایک قسم کی دوسری قسم میں تقلیب کے سلسلے میں واضح اختلافات بھی ہیں (جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے کہ) Gould اور Eldredge کے ''محیط میں جنم لینے والی انواع'' کے ماڈل اور دیگر نظریہ سازوں کے تصوراتِ ارتقا اور ''انتشار'' کے مابین چونکا دینے والی مماثلتیں ہیں اور اس بارے میں بھی مشابہت ہے کہ ماضی میں کیا ہوا اور ہمارے آئندہ کے ثقافتی ارتقا میں کیا کچھ دوبارہ وقوع پذیر ہوگا۔

ثقافتی ارتقا کی جامع تحقیق میں اہل علم حامیانِ حقوق نسواں کا کردار بہت واضح ہے (انہوں نے انسانی تاریخ اور انسانیت کے دونوں ''نصفوں'' کا احاطہ کیا ہے): اس تحقیق میں وہ گمشدہ معلومات (data) مہیا کی گئی ہیں جو روایتی منابع میں موجود نہیں ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اس کتاب میں پیش کردہ ہمارے ماضی، حال اور مستقبل کی مکرر جانچ پڑتال ممکن نہ ہوتی اگر ان سکالر نے ہماری مدد نہ کی ہوتی Simone de Beauvoir، Jessie

گیتا سین، Ester Boserup، Bernard Florence، Dale Spender، Mary Doly
Alice، Barbara Gelpi، Kate Millett، Andrienne Rich، Nancy Chodorow، Howe
Judith Plaskow، Carol Christ، Charlotte Bunch، Annette Kuhn، Schlegel
Hazel Henderson، Rosemary Radford Ructher، Catherine Stimpson
Jean Baker Miller، Wilma Scott Heide، Catherine Mackinnon اور Carol
Gilligan، یہ صرف چند نام ہیں، کچھ اور اہل علم بھی مددگار رہے ہیں جن کے نام بخوف طوالت نہیں دیئے جا رہے۔(۲۱) سترھویں صدی میں افرا بہن کے زمانے سے حتیٰ کہ پہلے سے بھی شروع کرتے ہوئے (۲۲) بلکہ اس کے اپنے زمانے میں جو پچھلے دوعشروں کی بات ہے معلومات کے نئے ذخیرے اور بصیرت کے باعث حقوق نسواں کے حامی سکالرز ''نظریۂ انتشار'' سامنے آیا جس نے سائنس کے لئے نئی سرحدیں کھول دی ہیں۔

اگرچہ مآخذ کے اعتبار سے بہت دور کے فاصلے پر ہوتے ہوئے ایک روایتی جنسِ مذکر ماخذ ہے اور دوسرا ایک انقلابی مؤنث تجربہ اور عالمی نقطۂ نظر ہے، نظریاتِ ''انتشار'' کے مابین بہت کچھ مشترک ہے۔ رائج الوقت سائنس کے دائرے کے اندر، دونوں کو اب تک پُر اسرار سرگرمیاں سمجھا جاتا ہے کچھ انہیں عین مقدس مساعی سمجھتے ہیں اور کچھ انہیں تقدس کے دائرے سے بہت دور سمجھتے ہیں۔

آگے آنے والے ابواب اُس مستقبل کی جڑوں یا اس تک پہنچنے والے راستوں کی تلاش کے بارے میں ہیں۔ وہ ہمیں ایک ایسی کہانی سناتے ہیں جو ہماری تاریخِ معلومہ (یاتحریری تاریخ) سے ہزاروں سال پہلے شروع ہوئی: یہ اس بات کی کہانی ہے کہ مغربی ثقافت کی اصل شراکت داری کی سمت کس طرح چکر کھا کر پانچ ہزار برس کے تسلط ماڈل کے گرد گھومتی رہی۔ یہ ابواب بتاتے ہیں کہ ہمارے گوناگوں عالمی مسائل بڑی حد تک ہماری سطح کی تیکنیاتی ترقی کی سطح پر معاشرتی تنظیم کے تسلّط ماڈل کے منطقی نتائج ہیں، لہٰذا اس کے اندر رہ کر انہیں حل نہیں کیا جا سکتا۔ اور وہ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ایک اور راستہ بھی ہے جو خود ہمارے اپنے ارتقا کے شریک خالقوں(co-creators) کے طور پر اب بھی ہمارا اپنا انتخاب ہوگا۔ ہم اب بھی اس پر گامزن ہو سکتے ہیں۔ یہ مسئلے کے حل یا نئے طریقے کی دریافت کا روشن فکر لمحہ ہے، نہ کہ ٹکڑے ٹکڑے ہو جانے کا: یعنی ہم سیاست، معیشت، سائنس اور

MashalBooks.org

روحانیت کی تشکیل کے نئے راستے تلاش کر کے شراکت داری کی دنیا کے عہد میں کس طرح داخل ہوتے ہیں۔

MashalBooks.org

باب۔1

ایک گمشدہ دنیا کا سفر: آغازِ تہذیب

ایک غار میں بیس ہزار سال سے زائد عرصہ سے محفوظ شدہ ایک زنانہ مورتی ہم سے ہمارے قدیم مغربی آباؤ اجداد کے بارے میں گفتگو کرتی ہے۔ یہ چھوٹی سی مورتی پتھر میں سے تراشی گئی ہے: یہ وینس کے نام سے پہچانی جانے والی ان مورتیوں میں سے ہے جو زمانہ قبل از تاریخ کے سارے یورپ میں دستیاب تھیں۔

علم جغرافیہ کی دلچسپی کے نقطۂ نظر سے اہم علاقوں میں ...... مشرقی یورپ میں بلقان سے لے کر سائبیر یا میں جھیل بیکال تک، مغرب کی طرف جاتے ہوئے وی آنا کے قریب ولنڈارف تک اور فرانس میں گروٹ ڈوپیپے تک...... کھدائیوں میں سے برآمد ہونے والی ان مورتیوں کو بعض سکالرز نے مردانہ شہوت کے لیے اشیائے انگیخت میں شمار کیا ہے: یعنی آج کے پلے بوائے رسالوں کی قدیم مماثل قرار دیا گیا ہے۔ بعض دوسرے سکالرز کے خیال میں یہ ان چیزوں میں سے ہے جو غیر مہذب زمانے میں عام تھیں اور غالباً فحش کاری اور اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کی آزمائش کی رسوم میں استعمال ہوتی تھیں۔

مگر ان قدیم مجسمہ سازیوں کی حقیقی اہمیت کیا ہے؟ کیا انہیں مردوں کے گمراہ کن تصورات کا نتیجہ قرار دے کر بالکل ترک کر دیا جانا چاہیے؟[1] کیا چوڑے عقبی حصے والی،

MashalBooks.org

بعض اوقات حاملہ نظر آنے والی طرحدار حسینہ اور اکثر زنانہ شبیہہ کے لیے ''وینس'' (زہرہ) کی اصطلاح کا استعمال درست ہے؟ کیا زمانہ قبل از تاریخ کے مجسمے ہمیں ہمارے متعلق کوئی اہم بات بتاتے ہیں یعنی کیا یہ اطلاع دیتے ہیں کہ پرانے زمانے کی عورتیں اور مرد کائنات کی حیات بخش قوتوں کو مقدس مانتے تھے؟

قدیم حجری دور

ان کی دیواروں کی پینٹنگز، غاروں کے اندر اور مقاماتِ تدفین کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کی بنائی ہوئی عورتوں کی مورتیاں اہم نفسیاتی ریکارڈز ہیں۔ یہ اس امر کی شہادت ہے کہ ہمارے آباؤ اجداد زندگی اور موت کی پُراسرار حقیقتوں سے خوفزدہ رہتے تھے۔ یہ اشیا ظاہر کرتی ہیں کہ انسان اپنی تاریخ کے بالکل ابتدائی دور ہی سے اپنی زندہ رہنے کی خواہش کو ایک جامۂ اظہار پہناتا رہا اور مختلف رسوم اور ایسی دیومالائی داستانوں کے ذریعے اپنی خود اعتمادی بڑھاتا رہا ہے جو وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے اس اعتقاد کے ساتھ وابستہ تھیں کہ مُردے نئے جنم کی رسم ادا ہو جانے پر دوبارہ زندہ ہو سکتے ہیں۔

مذہبی تاریخ دان ''ای او جیمز'' (E.O James) لکھتا ہے کہ Niaux, Les Trois Freres اور Font de Gaume یا Lascous جیسے گہرے اور محفوظ غاروں میں منعقد ہونے والی رسم کے ذریعے فطری قوتوں اور ان سے متعلقہ دیگر مختلف مظاہر کو مسخر کیا جاتا ہوگا اور پھر ان کی وساطت سے حصولِ رزق، پیدائش، نسلوں کے پھلنے پھولنے اور زندگی و موت سے وابستہ دیگر ضرورت و حاجات پوری ہوتے سمجھی جاتی ہوں گی۔ ان سب باتوں سے ان لوگوں کے اس دنیا اور اگلی دنیا میں اچھی زندگی گزارنے کی خواہشات کا اظہار ہوتا ہوگا۔(۲)

اس مقدس رسم کا حجری دور کی ثقافت میں بھرپور اظہار ہوتا تھا۔ اس متبرک روایت کا ایک جزوِ لازم ان قوتوں کے ساتھ میل جول تھا جو زندگی اور موت کو عورت کے ساتھ جوڑتی تھیں۔

ہم نسوانیت کے زندگی دینے کے ساتھ تعلق کو حجری تدفین کی رسم میں دیکھ سکتے ہیں۔ مثال کے طور پر فرانس کے قصبہ "Les Eyzies" میں (جہاں 1868 میں ''اپر پیلیولتھک'' کے آباؤ اجداد کی ہڈیاں پائی گئی تھیں) ایک چٹانی پناہ گاہ ''کرومینگنن'' (Cro-Magnon) دریافت

MashalBooks.org

ہوئی اس میں لاشوں کے اردگرد اور اوپر کوڑیوں کے خول بڑے اہتمام کے ساتھ سجائے گئے تھے۔ ان خولوں کی شکل، بقول جیمز ''اس دروازے جیسی ہوتی ہے جس میں سے گزر کر ایک بچہ دنیا میں داخل ہوتا ہے۔'' لاشوں کو ان کوڑیوں سے سجانے سے یہ مطلب لیا گیا کہ کسی زمانے میں نسوانی الوہیت کی پرستش کی جاتی تھی۔ جیسا کہ وہ لکھتا ہے کوڑی زندگی دہندہ ایجنٹ سمجھی جاتی تھی۔ اسی طرح اس پر ملی ہوئی سرخ مٹی تھی جو دور متاخر کی روایات کے مطابق عطیۂ زندگی دینے کے ذریعے یا عورت کے ماہواری کے خون کی علامت تھی۔(۳)

اصل زور عورت کے زندگی دینے اور اسے سہارا دینے کے ساتھ تعلق پر ہے مگر ساتھ ساتھ موت (یا زیادہ خصوصیت سے دوبارہ جی اٹھنے) پر بھی زور دیا گیا ہے جو کہ مذہب کا ایک اہم موضوع ہے۔ لاشوں کے اردگرد اور اوپر عورت کے اندام نہانی کی شکل کے خول اور ان پر لگائی گئی سرخ مٹی (یہ خون کی قوتِ حیات بخشی کی علامت ہے) رسم تدفین کا حصہ تھی جس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ میت کو نئے جنم کے ذریعے واپس لایا جانا مراد لیتے تھے۔ جیمز اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ کہتا ہے وہ ''رسوم تدفین کے ذریعے یہ اشارہ دیتے ہیں کہ زندگی دینے کا نسوانی مورتیوں اور دیوی پوجا کی دیگر علامات کے ساتھ گہرا تعلق ہے''(۴)

حجری دور کی رسم تدفین کی آثاریاتی شہادت کے علاوہ ان رسوم کی شہادت بھی موجود ہے جو بظاہر ان جنگلی جانوروں اور پودوں کی زرخیزی کی حوصلہ افزائی کے لیے ہوتی ہیں جنھوں نے ہمارے اسلاف کی زندگیوں میں آسانیاں پیدا کر دی تھیں۔ مثال کے طور پر "Ariege" میں "Tuc d' Audoubert" کے ناقابل رسائی غار کی گیلری میں جس میں نرم مٹی کا فرش بنا ہوا ہے، دیوار پر دو ارنا بھینسوں (ایک مادہ ہے جس کے پیچھے ایک نر لگا ہوا ہے) کی پینٹنگ بنی ہوئی ہے، وہاں ہمیں انسانی پیروں کے نشانات ملتے ہیں۔ جس سے سکالرز نے اندازہ لگایا ہے کہ یہ مذہبی ڈانس کرنے والوں کے نقوش پا ہیں۔ اسی طرح کیٹالونیا میں ''کاگل'' کی چٹان پر منقش ہمیں عورتوں کے مناظر ملتے ہیں یہ غالباً پجارنوں کے ہیں جو ایک کوتاہ قامت ننگے بدن کے مرد کے گرد دھمال ڈال رہی ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مذہبی تقریب کی منظرکشی ہے۔

یہ محفوظ غار، مورتیاں، تدفین اور تمام رسمیں اس عقیدے کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں کہ وہ

MashalBooks.org

منبع جس میں سے زندگی ابھرتی ہے، وہی تمام سبزیوں اور جانداروں کی زندگی کا منبع ہے......
وہی عظیم دینی ماں(Mother Goddess)یا"Giver of All"ہے۔ یہ عقیدہ مغربی تہذیب میں اب بھی پایا جاتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ ہمارے قدیم اسلاف یہ امر تسلیم کرتے تھے کہ ہم اور ہمارا قدرتی ماحول کلی طور پر اسرارِ زندگی اور موت کے مربوط اجزا ہیں ۔اور یہ کہ ساری اشیائے فطرت کے ساتھ احترام کا سلوک کیا جانا چاہیے۔ یہ احساس وشعور...... (بعد ازاں دیویوں کی مورتیوں جو یا تو قدرتی علامات مثلاً جانوروں، پانی ور درختوں سے گھری ہوئی ہیں یا بذات خود جزوی طور پر جانور کی صورت میں بنی ہوئی ہیں) واضح طور پر ہمارے گمشدہ نفسیاتی ورثے کا مرکز تھا۔ علاوہ ازیں اس گمشدہ ورثے کا مرکز وہ حیرت بھی ہے جس سے ہم اپنے انسان ہونے کا عظیم معجزہ دیکھ کر دو چار ہوتے ہیں۔ وُہ معجزۂ پیدائش ہے جو عورت کے گوشت کے اندر کارفرما ہے۔ ان قدیم نفسیاتی ریکارڈز کو دیکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ یہ زمانہ قبل از تاریخ کے مغربی نظام ہائے اعتقاد کا مرکزی نقطہ تھا۔

اب تک ہم جن خیالات وشواہد کو لے کر آگے بڑھ رہے ہیں، سرِدست بہت سے سکالرز کا یہ نقطۂ نظر نہیں ہے اور نہ ہی مآخذ تہذیب کے بارے میں سروے کلاسوں میں یہ خیالات پڑھائے جاتے ہیں۔ کیونکہ یہاں، جیسا کہ اس موضوع پر بہت سی مشہور تحریروں کے سلسلے میں ایک عام رویہ ہے، اب تک ان قدیم سکالرز کے متعصّبانہ خیالات رائج ہیں جو حجری فن(Paleolithic art) کو گھسی پٹی اصطلاحات ''قدیم انسان'' خون کا پیاسا، لڑاکا شکاری وغیرہ کی روشنی میں لیتے ہیں جبکہ حقیقت حال جو دورِ جدید میں بہت سے شکار پر جینے والے قدیم معاشروں کے بارے میں سامنے آئی ہے اس کے بالکل برعکس ہے۔(۵) حجری دور سے متعلق دستیاب متفرق مواد کی اس تعبیر کی بنیاد پر بہت ابتدائی اور زمانہ قبل از تاریخ سے متعلق ''مردمرکز(male-centered) نظریات'' کی عمارت تعمیر کی گئی ہے اور اس وقت بھی جبکہ بہت سی نئی دریافتیں سامنے آچکی ہیں، ان کی تعبیر بھی سکالرز عموماً اس طرح کرتے ہیں جو ان کے پرانے نظریاتی سانچوں میں ڈھل سکتی ہو۔

ان سکالرز کے مفروضات میں سے ایک یہ تھا (جو آج بھی عموماً ہے) کہ حجری فن کا واحد ذمہ دار زمانہ قبل از تاریخ کا ''مرد'' تھا۔ یہ کہنا بھی کسی حقیقی شہادت پر مبنی نہ تھا بلکہ پہلے سے قائم کی ہوئی آراء کا نتیجہ تھا۔ ایسے مفروضے تحقیق کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے۔ جیسے مثال

کے طور پر عہدِ حاضر کے ''ویدا'' (سری لنکا) میں یہ ایک حقیقت ہے کہ راک پینٹنگ مرد نہیں، بلکہ عورتیں کرتی ہیں۔(۶)

ان پیشگی قائم کردہ آرا کی بنیاد ہی مرد کی برتری کے تصور پر تھی جیسا کہ جان فیفر نے "The Emergence of Man" میں کہا ''قبل از تاریخ کے مرد کی توجہ اور تصور پر شکار مسلط تھا'' اور یہ کہ ''اگر وہ ذرہ بھر بھی جدید دور کا ''مرد'' تھا تو اس نے اس رسم کو متعدد مواقع پر اپنی قوت میں کمی دور کرنے اور اس میں اضافہ کرنے کے لیے استعمال کیا۔(۷) اسی تصور کے عین مطابق حجری دور کی دیواروں پر نقش کاری اور پینٹنگز کی تعبیر شکار کے حوالہ سے کی جاتی جبکہ عورتوں کو رقص کرتے ہوئے دکھایا جاتا۔ خدا کو انسانی شکل سے منسوب کرنے کے عقیدے کے تحت بنائی پینٹنگز میں عورت کو اس طرح دکھایا جاتا کہ اس کے کولہو خوب چوڑے تھے اور پیٹ حمل کو ظاہر کر رہا ہوتا تھا۔ اسے یا تو نظر انداز کرنا پڑا یا وہ مرد کے لیے محض ایک شہوت انگیز شے تھی: فربہ اندام ''وینس'' یا ''حسن کا ایک وحشیانہ پیکر''(۸) ۔

اگرچہ مستثنیات موجود رہی ہیں، شکاری جنگجو مرد کے ارتقائی ماڈل نے حجری آرٹ کی بیشتر تعبیرات کو رنگدار کیا ہے۔ صرف 20ویں صدی کے اواخر میں آ کر مشرقی اور مغربی یورپ اور سائبیریا کی کھدائیوں میں سے ملنے والی نئی اور پرانی دریافتوں نے بتدریج تبدیلیاں شروع کی ہیں۔ محققین میں سے بعض خواتین تھیں جنہوں نے زنانہ اعضائے تولید و تناسل کی خیالی تصاویر کو نوٹ کیا اور حجری آرٹ کے ''شکاری طلسم'' پر مبنی توضیحات میں جامع مذہبی توضیحات کی طرف میلان کا بھی اظہار کیا۔(۹) اور چونکہ زیادہ تر سکالرز سیکولر سائنسدان تھے ان کی تحقیق ''ایبے بروئیل'' جیسے راہبوں کی طرز سے ہٹ کر تھی۔ (ایبے بروئیل کی مذہبی رسوم کی ''اخلاقی توضیحات'' نے انیسویں اور بیسویں صدی کے اوائل کی حجری تحقیق میں اس قدر رنگ آمیزی سے کام لیا کہ) بعض مردوں، جنہوں نے غاروں کی پینٹنگز، مورتیوں اور دیگر دریافتوں کے مکرر معائنے کئے تھے انہوں نے بھی ان بنیادوں کے بارے میں سوالات کرنا شروع کر دیئے جنہیں اہل علم کی ایسٹیبلشمنٹ نے تسلیم کر رکھا تھا۔

ان سوالات کی ایک دلچسپ مثال حجری غاروں کی دیواروں پر کی ہوئی چھڑیوں اور لکیروں پر مبنی پینٹنگ اور ہڈیوں یا پتھروں پر کیے گئے نقش و نگار تھے۔ بہت سے سکالرز کا

MashalBooks.org

خیال تھا کہ یہ پینٹنگ اور نقش و نگار مختلف ہتھیاروں: نیزوں بھالوں اور کیل کانٹوں کا اظہار ہیں لیکن جیسا کہ الیگزنڈر مارشک اپنی کتاب "The Roots of Civilizaiton" میں لکھتا ہے، یہ ان کاوشوں میں سے ایک ہے جو اس معیاری تعبیر کو چیلنج کرتی ہے ان لکیروں کی پینٹنگز اور نقش و نگار کو بہ آسانی پودے، درخت، شاخیں، نرسل اور پتے قرار دیا جا سکتا ہے۔(۱۰) مزید برآں یہ نئی تعبیر ایسا مطلب دے سکتی تھی جیسے سبزیوں کی تصاویر کا نمایاں طور پر فقدان ہو، جن سبزیوں پر وہ لوگ آج ہی کے شکار پیشہ لوگوں کی طرح کافی حد تک انحصار کرتے تھے۔

"Paleolithic Cave Art" کے مصنفین "Peter Ucko" اور "Ardree Rosenfeld" نے بھی حجری آرٹ میں سبزیوں کی بالتخصیص غیر موجودگی پر اظہار حیرت کیا ہے۔ انہوں نے ایک اور حیران کن ناموزونیت بھی نوٹ کی ہے۔ تمام دیگر شواہد بتاتے ہیں کہ بڑی مچھلیاں مارنے کے لیے استعمال ہونے والا ایک خاص قسم کا نیزہ جسے ''بسریل'' (biserial) کہتے تھے حجری دور کے اواخر یا میگڈیلنین عہد تک بنا ہی نہیں تھا، اگرچہ سکالرز اسے ہزاروں برس پہلے زمانہ قبل از تاریخ کے غاروں کی پینٹنگز میں "Sticks" تلاش کرتے رہے تھے۔ مزید برآں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حجری دور کے آرٹسٹ اپنے شکار کی اتنی زیادہ ناکامیوں کی مصوری کیوں کرنا چاہیں گے؟ کیونکہ اگر ان کی ''چھڑیاں'' اور ''لکیریں'' دراصل ان کے ہتھیاروں کی تصویر کشی کر رہی تھیں تو ان کی تصاویر میں سے ان کے اہداف لاپتہ کیسے رہے۔(۱۱)

ایسی پُر اسرار چیزوں کی چھان بین مارشک نے کی جو ایک ماہر آثاریات نہیں تھا اور سابقہ آثاریاتی روایات کا پابند نہیں تھا۔ چنانچہ اس نے ہڈی قسم کی ایک چیز پر بنی ہوئی نقش کاری کا بہ نظر غائر جائزہ لیا جنہیں نیزوں یا بھالوں کی تصاویر قرار دیا گیا تھا۔ اس نے اسے خوردبین کے نیچے رکھ کر دیکھا تو انکشاف ہوا کہ اس قیاسی نیزے پر بنے ہوئے کانٹے نہ صرف غلط سمت میں مڑے ہوئے ہیں بلکہ نیزے کی نوکیں بھی غلط سرے پر ہیں۔ لیکن اگر وہ ''غلط سمت'' والے ہتھیار نہیں ہیں تو یہ نقش کاری کیا ظاہر کر رہی ہے؟ جیسا کہ بعد میں پتہ چلا ان لکیروں کو بہ آسانی لمبے تنے کے سرے پر اگی ہوئی شاخوں کے صحیح زاویئے سے تعبیر کیا جا سکتا ہے۔ بہ الفاظ دیگر اس اور دیگر نقشکاریوں کو جنہیں رسماً ''کانٹے دار نشانات'' یا ''مردانہ اشیا'' قرار دیا گیا تھا غالباً درختوں، شاخوں اور پودوں کے مخصوص اظہار سے زیادہ

کچھ نہیں تھیں۔ (۱۲)

چنانچہ بار بار کی گہری چھان پھٹک کے نتیجے میں حجری آرٹ کے روایتی نظریئے کو بنیادی طور پر قدیمی شعبدے کے گھسے پٹے طریقوں کے مظہر کی حیثیت سے دیکھا جا سکتا ہے، نہ کہ جو کچھ دکھائی دے اس کی منطقی تعبیر شروع کر دی جائے۔ اسی طرح حجری نسوانی مورتیوں کی وضاحت بھی یا تو عریاں مردانہ جنس کے مد مقابل شے یا بچے پیدا کرنے کی صلاحیت کی رسم کے اظہار کے طور پر کی جا سکتی ہے۔

ان باقیات کی کمیابی اور ان کے اور ہمارے درمیان بُعدِ زمانی کے باعث ہم غالباً یہ بات یقینی طور پر نہیں کہہ سکتے کہ ہمارے حجری آباؤ اجداد اپنی پینٹنگز، مورتیوں اور علامات سے خصوصی طور پر کیا مطلب لیتے تھے۔ لیکن حجری غاروں کی پینٹنگز کی شاندار رنگوں میں پہلی بار اشاعت کے بعد اس فن کی تمثیل انگیزی کی قوت ایک افسانوی درجہ اختیار کر گئی ہے۔ بعض جانوروں کا فنکارانہ اظہار ایسا عُمدہ کیا گیا ہے جیسے کہ جدید دور کے بہترین آرٹسٹوں نے کیا ہو اور ان میں تازگی اور شادابی اتنی پائی جاتی ہے کہ اس دور کے بہت ہی کم فنکار اس کی باز آفرینی پر قادر ہو سکتے ہیں۔ لہٰذا صرف ایک ہی چیز ہے جو یقینی طور پر کہی جا سکتی ہے: حجری آرٹ غیر ترقی یافتہ قدیم لوگوں کی بے ڈھنگی لکیروں سے کوسوں دور ہے۔ بلکہ یہ ایسی نفسیاتی روایات کی ترجمانی کرتا ہے جو ہمیں دعوت فکر دیتی ہیں کہ ہم نہ صرف یہ جانیں کہ بنی نوع انسان کیسے کیسے حالات سے گزرے ہیں بلکہ یہ بھی سمجھیں کہ وہ کیا کچھ بن سکتے ہیں۔

جیسا کہ Sorbonne's Center for Prehistoric and Protohistoric studies کے ڈائریکٹر آندر لیرائے گورہن نے حجری آرٹ کی ایک حالیہ اہم ترین تحقیق میں لکھا ہے کہ اس دور کے نظام عقائد کو ''غیر ترقی یافتہ رسم زرخیزی'' قرار دے کر مسترد کر دینا ''مضحکہ خیز اور غیر معقول رویہ ہے''۔ ہم اپنی بات کو ''جبراً'' مسلط کئے بغیر سارے تمثیلی حجری آرٹ کو زندہ دنیا کے فطری اور غیر فطری تصورات کا اظہار قرار دے سکتے ہیں''۔ انہوں نے مزید کہا کہ حجری دور کے لوگ بلاشبہ جانوروں اور انسانوں کی دنیا کو دو متقابل نصف نصف حصوں میں منقسم جانتے تھے اور اس امر سے بخوبی آگاہ تھے کہ جانداروں کی معیشت پر حکمرانی انہی دو نصفوں کے اتحاد و اتفاق کے ذریعے ممکن ہے (۱۳)۔

یرائے گورہن کا یہ اخذ کردہ نتیجہ کہ حجری آرٹ اس وقعت کی عکاسی کرتا ہے جو ہمارے ابتدائی اسلاف اپنے اس مشاہدے کو دیتے تھے کہ دنیا میں دو جنسیں ہوتی ہیں۔ یہ ان کی کم و بیش ساٹھ حجری غاروں کی کھدائی سے برآمد ہونے والی پینٹنگز اور اشیا کے تجزیئے پر مبنی تھا۔ اگرچہ وہ ایذا پسندانہ نر و مادہ کی لگی بندھی اصطلاحوں میں بات کرتا ہے اور دیگر پہلوؤں سے قدیم آثاریاتی روایات کی پیروی کرتا ہے وہ اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ حجری آرٹ کسی قسم کے قدیم مذہب کا اظہار کرتا تھا جس میں صنف نازک کے نقوش اور علامات مرکزی کردار ادا کرتی تھیں۔ اس سلسلے میں وہ دو حیرت انگیز مشاہدات کا ذکر کرتا ہے۔ خصوصی طور پر زنانہ خدوخال اور علامات جنھیں اس نے مؤنث قرار دیا کھدائی والے چیمبرز میں مرکزی حیثیت میں تھیں۔ اس کے برعکس مذکر علامات خاص کر محیطی حصے میں واقع تھیں یا مونث اشکال و علامات کے اردگرد مرتب شدہ تھیں۔ (۱۴)

یرائے گورہن کے اخذ کردہ نتائج میرے اس نظریئے سے مطابقت رکھتے ہیں جس کا اظہار میں نے ابتداء کیا تھا: کہ اندام نہانی کی شکل کے کوڑیوں کے خول، تدفین میں سرخی مائل مٹی، وینس کی شکل کی مورتیاں اور عورت و جانور کے یکجا اعضا والی مورتیاں جنھیں سابقہ مصنفین نے ''بدہئیت مخلوق'' کہہ کر مسترد کر دیا تھا، یہ سب قدیم رواج کی عبادت سے تعلق رکھنے والی چیزیں تھیں جن میں عورت کی زندگی دہندہ قوتیں اہم کردار ادا کرتی تھیں۔ یہ سب ہمارے آباؤ اجداد کی ان کوششوں کا اظہار تھیں جن کے ذریعے وہ اپنی دنیا کو سمجھنا چاہتے تھے۔ یہ وہ کوششیں تھیں جو ہمہ گیر انسانی سوالوں کا جواب تلاش کے لیے کی جاتی رہیں۔ مثلاً ہم کہاں سے آئے، ہم کب پیدا ہوئے اور مرنے کے بعد ہمیں کہاں جانا ہے۔ یہ سوالات اس امر کی تصدیق کرتے ہیں جو ہم منطقی انداز میں تسلیم کرتے ہیں یعنی اپنے آپ کا شعور دیگر انسانوں، جانوروں اور باقیماندہ اشیائے فطرت کے شعور کے ساتھ ساتھ پُر جلال و مرعوب کن اسرار کا شعور اور اس حقیقت کی عملی اہمیت کا شعور کہ زندگی عورت کے جسم میں سے برآمد ہوتی ہے۔

یہ بات منطقی دکھائی دے گی کہ دکھائی دینے والی دوشکلیت(dimorphism) یا انسانیت کے دونوں نصفوں کی ہیئت میں اختلاف نے حجری نظام عقائد پر بے پناہ اثرات مرتب کئے اور یہ بات بھی اتنی ہی منطقی دکھائی دے گی کہ انسان اور جانور، دونوں کی زندگی مادہ

(female) کے جسم میں سے برآمد ہوتی ہے اور یہ کہ موسموں اور چاند کی طرح عورت کا جسم بھی گردشوں میں سے گزرتا ہے اس سے ہمارے آباؤ اجداد سمجھ گئے کہ دنیا میں زندگی دینے اور اسے برقرار رکھنے کی قوتیں ''مادہ'' کی شکل میں پائی جاتی ہیں نہ کہ ''نر'' کی شکل میں۔

خلاصۂ کلام یہ کہ حجری دور کی باقیات میں نسوانی مورتیاں، تدفین میں نیم سرخ مٹی اور اندام نہانی کی شکل کے خول موجود ہونا انٹ شنٹ اور غیر متعلقہ مواد ہونے کی بجائے اس امر کا اظہار تھے کہ یہ بعد میں ترقی پا کر ایک پیچ در پیچ مذہب بن جائیں گے جس میں Mother Goddess کی پوجا کی جائے گی اور اسے زندگی کی تمام اشکال کے لیے ایک منبع اور مبداء سمجھا جائے گا۔ یہ دیوی پوجا جس کے بارے میں جیمز اور دیگر سکالرز نے کہا ہے کہ یہ کئی تاریخی تختیوں میں سے گزر کر بھی زندہ رہی۔ ''مشرق قریب اور گریکو رومن ورلڈ میں یہ میگنا میٹر کی جامع شکل میں'' تھی (15) ہم یہی مذہبی تسلسل مصر میں مشہور دیوی ''ایسیس''، ''نٹ'' اور ''ماٹ'' کی شکلوں میں، ہلال اضحر (Fertile Crescent) بحیرہ روم سے خلیج فارس تک کے زرخیز علاقے میں ''اشتر''، استارتے اور ''للتھ'' کی صورتوں میں، یونان میں ''دیمتیر''، کورے اور ''ہیرا'' کی شکلوں میں اور روم میں ''اتارگیتس''، ''سیریس'' اور ''سیبلی'' کی صورتوں میں پاتے ہیں۔ بعد میں بھی یہودی و مسیحی ورثے میں یہ ہمیں کوئین آف ہیون کی صورت میں ملتی ہے، جس کے جھنڈ بائبل میں جلائے جاتے ہیں، یہ عبرانی کبالسٹ رسم کے شیخینا میں، اور کیتھولک ورجن میری (کنواری مریم) ہولی مدر آف گاڈ کی صورت میں ملتی ہے۔

پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ سلسلے اتنے واضح ہیں تو روایتی آثاریاتی ادب میں اتنے طویل عرصہ سے یہ تخفیف کی زد میں کیوں آتی رہیں یا نظر انداز کیوں کر دی گئیں؟ اس کا ایک سبب تو پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وہ مرد کے زیر تسلط قائم سماجی تنظیموں کے زمانہ قبل از تاریخ یا زمانہ مبادیاتِ تاریخ کے ادوار کے ماڈل میں فٹ نہیں بیٹھتیں۔ لیکن ایک سبب اور بھی ہے کہ جنگ عظیم دوم کے بعد اس مذہبی روایت کے بارے میں جو ہزاروں سال کا سفر طے کرتی ہوئی حجری دور کے بعد مسحور کن زمانے میں داخل ہوئی، بعض اہم ترین نئی شہادتوں کا انکشاف ہوا۔ یہ ہمارے ثقافتی ارتقا کا ایک لمبا عرصہ تھا جو حجری دور کے زمانے میں انسانی ثقافت کے اولین بحرانی حالات اور بعد کے کانسی دور کی تہذیبوں کے درمیان کا زمانہ تھا۔ یہ

وہ وقت تھا جب ہمارے آباؤ اجداد نئے حجری دور میں زرعی معاشروں کے طور پر آباد ہو گئے۔

نیا حجری دور: اوزاروں کا زمانہ

تقریباً اسی وقت برائے گورہن نے اپنی دریافتوں کے بارے میں لکھا۔ قبل از تاریخ کے سلسلے میں نئے حجری مقامات: قصبہ ''کٹل ہویوک'' اور ''ہاسیلر'' کا پتہ چلنے اور وہاں پر کھدائیوں سے حیرت انگیز دریافتوں کی وجہ سے ہمارے علم میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ یہ مقامات اناطولیہ کے میدان کہلاتے تھے جو اب جدید ترکی میں ہیں۔ جس شخص نے ان کھدائیوں کے لیے ہدایت دیں وہ برٹش انسٹی ٹیوٹ آف آرکیالوجی انقرہ کے لیے کام کر رہا تھا۔ یہ جیمز میلارٹ تھا، اس کا کہنا تھا کہ ان دریافتوں میں خاص دلچسپی کی بات یہ تھی کہ ان دو مقامات کی تحقیق سے وہاں دیوی پوجا کی تہذیبوں کی ترقی اور استحکام وتسلسل کا پتہ چلا۔

میلارٹ نے لکھا کہ ''اے لیرائے گورہن کی عمدہ تشخیص نو نے اپرپیلیولتھک مذہب کے بارے میں بہت سی غلط فہمیوں کو دور کر دیا ہے.......... یہاں کا آرٹ غیر معمولی ذہنی رجحان اور نسوانی علامتیت کے نظریئے کے گرد گھومتا ہے (جو علامات اور جانوروں کی شکل میں ہے)۔ یہ کٹل ہویوک کے مذہبی نقوش اور استعارات سے قوی مشابہتوں کا اظہار کرتا ہے'' علاوہ ازیں اس میں اپرپیلیولتھک کے اثرات بھی نمایاں ہیں ''جو بے شمار رسوم، نیم سرخ تدفین، سرخ نشانات والے فرشوں، کلسی رسوبوں(stalactites)، ڈھانچوں کے اجزا اور سیپیوں میں دکھائی دیتے ہیں''(۱۶)

میلارٹ نے مزید لکھا کہ جب تک یہ سوچا جاتا رہا کہ انتہائی ترقی یافتہ اور طرحدار اپرپیلیولتھک آرٹ ''شکاریاتی طلسم کے اظہار سے سوا کچھ نہیں۔ اور یہ نقطۂ نظر آسٹریلیا کے پسماندہ قدیم معاشروں سے مستعار لیا ہوا تھا'' اس وقت تک مشرقِ قریب کے دور متاخر کی رسومِ زرخیزی (اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت کے متعلقہ رسوم) کے ساتھ کوئی کڑی ملنے کا امکان نہیں تھا۔

یہ رسوم مہادیوی اور اس کے بیٹے کے بتوں کے گرد گھومنے سے متعلق تھیں۔ اگرچہ ایسی دیوی کی اپرپیلیولتھک میں موجودگی کا بھی مشکل سے انکار کیا جا سکتا تھا۔ جو کہ وہاں نہیں ہے۔ اس نے کہا

''لیکن اب یہ صورتِ حال دستیاب معلومات(data) کی روشنی میں مکمل طور پر تبدیل ہو چکی ہے''(۱۷)

یہ الفاظ دیگر کٹل ہویوک اور ہاسیلر کے نیولتھک کلچر نے ہمارے ماضی کے معمے میں سے لمبے عرصہ تک مفقود رہنے والی کڑی کے بارے میں وسیع معلومات فراہم کیں...... یہ کڑی حجری عہد اور بعد کے فنیاتی طور پر زیادہ ترقی یافتہ چقماق، تانبے اور کانسی کے درمیان مفقود تھی۔ جیسا کہ میلارٹ لکھتا ہے ''کٹل ہویوک اور ہاسلر نے آرٹ کے ان دو بڑے مکاتب فکر کے درمیان ایک تعلق یا رابطہ قائم کر دیا ہے۔ مذہب کا تسلسل کٹل ہویوک سے ہاسلر سے آگے قدیم اور کلاسیکی عظیم ''مدر گاڈیس'' تک قائم کیا جا سکتا ہے۔(۱۸)

جیسا کہ حجری آرٹ میں تھا کٹل ہیوک آرٹ میں بھی عورتوں کی مورتیوں اور ان کی علامات کو مرکزی حیثیت حاصل تھی۔ اس میں جگہ جگہ قربان گاہیں اور خانقاہیں ملتی ہیں۔ مزید برآں یہ مورتیاں مشرقِ قریب و بعید کے دیگر علاقوں کے جدید حجری آرٹ کی بھی نمایاں خصوصیت ہیں۔ مثال کے طور پر مشرق وسطیٰ میں جریکو (اب اسرائیل) کی جدید حجری سائیٹ میں جہاں کے باشندے7000 قبل مسیح میں پہلے سے ہی پلستر شدہ اینٹوں سے بنے گھروں میں رہتے تھے...... بعض گھروں میں مٹی کے چمنی والے تندور حتیٰ کہ ان کے دروازوں کی کھڑی پٹیوں میں بھی خول (ساکٹ) بنے ہوئے تھے...... وہاں بھی دیوی کی مٹی سے بنی مورتیاں ملی ہیں۔(۱۹) تل السوان میں سے، جو کہ دریائے دجلہ کے کناروں پر ایک وسیع قطعۂ ارضی ہے جسے قدیم آبپاشی پر مبنی کھیتی باڑی اور ہندسی اشکال سے مزین مٹی کے ظروف (جنہیں سمر کہا جاتا ہے) کی وجہ سے امتیازی مقام حاصل تھا، قسم قسم کی مورتیاں برآمد ہوئی ہیں، جن میں سے بعض پر نہایت نزاکت کے ساتھ پینٹ شدہ عورتوں کے مجسمے ہیں۔ شمالی شام میں ایک جدید حجری قطعۂ زمین ''کیونو'' میں بھی کھدائی سے اسی طرح کی نسوانی مورتیاں برآمد ہوئیں۔ یہاں سب سے پہلے دیسی تانبے کو ہتھوڑے سے کوٹ کوٹ کر اشیا بنائے جانے کے شواہد ملے اور اینٹوں کے بھی اولین استعمال کا پتہ چلا ہے۔ یہ مورتیاں، تانبے کے ظروف اور اینٹیں تقریباً ایک ہی زمانے میں بنے تھے۔ یہاں ملنے والی دیوی کی چھوٹی چھوٹی مورتیوں کی مماثل مورتیاں بعد میں انتہائے مغرب میں ''ایسرالک سیسکلو'' (Aceramic Sesklo)میں بھی پائی گئی ہیں۔ یہ سرامک برتن بنائے جانے سے بھی پہلے

متعارف کرائی گئی تھیں۔(۲۰)

اگرچہ یہ بات بھی عموماً زیادہ زور دے نہیں کہی جاتی کہ جن کثیر التعداد جدید حجری کھدائیوں سے دیوی کی مورتیاں اور علامات برآمد ہوئیں وہ وسیع جغرافیائی علاقہ تھا جو مشرقِ قریب اور مشرق وسطیٰ سے پار تک جا پہنچا۔ اتنا دور کہ ہڑپہ اور موہنجو ڈارو تک چلا گیا۔ جہاں سے پہلے ہی سرخ پختہ مٹی سے بنی ہوئی متعدد نسوانی مورتیاں برآمد ہو چکی تھیں۔ یہ بھی جیسا کہ سر جان مارشل نے لکھا غالباً ایسی دیوی تھی جس کی ''خصوصیات اس عظیم 'Mother Goddess' جیسی تھیں جسے بہشت کی خاتون کہا جاتا ہے''(۲۱) ۔ دیوی کی مورتیاں یورپ میں بجانب مغرب بڑے بڑے پتھروں والی ثقافتوں میں سے بھی برآمد ہوئی ہیں جن کے لوگ اپنی زبردست انجینئرنگ کا مظاہرہ کرتے ہوئے پتھر کی بڑی بڑی یادگاریں تعمیر کرتے تھے، جو انگلینڈ میں ''سٹون ہنج'' اور ''ایوبری'' میں بنائی گئی تھیں اور ان بڑے بڑے پتھروں والی بعض ثقافتیں جنوب میں بحیرۂ روم کے جزیرہ مالٹا تک پہنچ گئیں جہاں ایک بہت بڑا ''مردہ خانہ'' پایا گیا اس کے اندر سات ہزار مقاماتِ تدفین تھے جہاں مذہبی نوعیت کی کئی رسوم ادا کی جاتی تھیں جن کے بارے میں جیمز لکھتا ہے کہ ''غالباً Mother Goddess نے کوئی اہم کردار ادا کیا تھا''(۲۲)

رفتہ رفتہ تہذیبوں اور مذہب، دونوں کے مآخذ اور ارتقا کی ایک نئی تصویر سامنے آ رہی ہے۔ جدید حجری زرعی معیشت تہذیبی ارتقا کی اساس تھی جو ہزاروں برسوں کا سفر طے کرتا ہوا ہمارے زمانے میں آ پہنچا ہے۔اور تقریباً ہمہ گیر طور پر جہاں کہیں بھی مادی اور سماجی ٹیکنالوجی کی اولین عظیم کامیابی ہوئی اس کا ایک پہلو مشترک تھا۔ وہ تھا دیوی کی پرستش۔

ہمارے حال اور مستقبل کے لیے ان دریافتوں کے کیا مضمرات ہیں؟ اور ہم قدیم مقدس مرد کی برتری پر مبنی معلومات کی حامل مرصع و مسجع بیڈ ٹائم بکس اور کافی ٹیبل آرکیالوجی کی بجائے اپنے ثقافتی ارتقا کے اس نئے منظر پر کیوں ایمان لائیں؟

اس کی ایک وجہ یہ ہے کہ نسوانی مورتیوں کی دریافتیں اور دیگر آثاریاتی ریکارڈز جو جدید حجری دور میں عورت کی برتری پر مبنی مذہب کی ترویج کی شہادت دے رہے ہیں ان کی تعداد اتنی زیادہ ہے کہ ان کی صرف فہرست مرتب کرنے کے لیے ہی بے شمار کتابیں درکار ہوں گی لیکن بڑی وجہ یہ ہے کہ زمانہ قبل از تاریخ کا یہ نیا منظر آثاریاتی تحقیق کے طریق کار

میں بے پناہ تبدیلی اور اس کی اہمیت پر بہت زور دیئے جانے کا نتیجہ ہے۔

قدیم دور میں مدفون خزانوں کو کھودنا اتنا پرانا ہے جتنا کہ قبروں کے وہ ڈاکو پرانے ہیں جنہوں نے فراعنۂ مصر کے مقبروں کو تاراج کیا۔ مگر آثاریات بطور ایک سائنس صرف 18ویں صدی کے آخری برسوں میں متعارف ہوئی۔ تب بھی پہلے پہل کی آثاریاتی کھدائیاں اگرچہ ہمارے ماضی کے بارے میں ذہنی تجسس کی تحریک کی وجہ سے بھی ہو رہی تھیں لیکن بظاہر قبروں کو لوٹنے جیسی وارداتیں لگ رہی تھیں۔ جیسا کہ انگلینڈ، فرانس اور دیگر نوآبادیاتی اقوام کے عجائب گھروں کو نادر اشیا، اسی طریقے سے حاصل ہوئیں۔ آثاریاتی کھدائیوں کا تصور کسی جگہ یا مقام سے زیادہ سے زیادہ معلومات اکٹھی کرنے کی خواہش کا نتیجہ تھا مگر اس نے ایک باقاعدہ طریق کار کی حیثیت بہت بعد میں جا کر حاصل کی۔ دوسری جنگ عظیم کے بعد اس کے لیے ٹیکنالوجی کا بھرپور استعمال شروع ہوا اور ہمارے آباؤ اجداد کی زندگی، افکار اور ان کی سماجی تنظیم کے بارے میں قیمتی معلومات سامنے آنے لگیں۔

نئی کھدائیاں کوئی اکیلا وکیلا سکالر یا کوئی پرانے زمانے کا محقق نہیں کر رہا ہے بلکہ اس میں زیادہ سے زیادہ تعداد میں سائنسدان شریک کئے جا رہے ہیں، جن میں ماہرین حیوانات و نباتات، ماہرین موسمیات ماہرین علم بشریات، ماہرین معدوم حیوانات اور آثار شناس شامل ہیں۔ بہت سے شعبوں کے ماہرین کی ٹیموں کی شرکت، میلارٹ کے کٹل ہویوک کی حالیہ تحقیق کی طرح ہمارے زمانہ قبل از تاریخ کے بارے میں صحیح ترین معلومات کا حصول یقینی بنا رہی ہے۔

لیکن سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس سے متعدد نمایاں فنیاتی کامیابیاں حاصل ہوئی ہیں مثلاً نوبل پرائز یافتہ ولرڈ لبی نے ریڈیو کاربن یا "C-14" کے ذریعے اشیا کے تخمینی زمانے کو متعین کر لیا اور درختوں کے تنے کے اندرونی حلقوں کو گن کر ان کی عمر معلوم کر لی۔ ان دو طریقوں نے ماضی پر آثاریاتی گرفت بڑھا دی۔ اس سے پہلے یہ کام اٹکل پچو سے چلایا جاتا تھا مثلاً مختلف چیزوں کا آپس میں موازنہ کر کے کسی کو بڑی عمر، کسی کو مساوی عمر اور کسی کو کم عمر مان لیا جاتا تھا۔ لیکن جب تاریخوں کا تعین تکرار پذیر اور قابل اعادہ طریقوں سے کیا جانے گا تو کوئی یہ کہہ کر نہیں بچ سکتا تھا کہ اگر کوئی صناعی کا نمونہ زیادہ فنکارانہ انداز سے بنا ہوا ہو یا جمالیاتی طور پر زیادہ پُرکشش ہو یا زیادہ فنیاتی دکھائی دے تو وہ لازماً بعد کے

دور کی کاوش ہوگا۔

نتیجتاً تسلسلِ زمانہ کی ڈرامائی تخمینِ نو(reassessment)نے زمانہ قبل از تاریخ سے متعلق پہلے سے قائم شدہ نظریات میں ڈرامائی تبدیلیاں کر دی ہیں۔ اب ہم جانتے ہیں کہ زراعت (جنگلی پودوں اور جانوروں کو پالتو بنانے کے عمل کے حوالہ سے) کا آغاز ہمارے اندازوں سے کہیں پہلے ہو چکا تھا۔ ماہرین آثاریات جسے جدید حجری دور یا زرعی انقلاب قرار دیتے ہیں، اس کی ابتدائی نشانیاں9000 تا8000 قبل مسیح، یعنی دس ہزار برس قبل ہی ملتی ہیں۔

زرعی انقلاب، نوع انسانی کی مادی ٹیکنالوجی کے شعبے میں ترقی کی طرف اہم ترین پیش رفت تھا۔ چنانچہ جسے ہم مغربی تہذیب کہتے ہیں اس کی شروعات اس سے کہیں پہلے ہو چکی تھیں جس کا ہم اندازہ لگائے بیٹھے تھے۔

زراعت کی ترقی کی بدولت اناج، ہماری بڑھتی ہوئی آبادی اور وسیع ہوتے ہوئے قصبات کی ضرورتوں کو نہ صرف پورا کرتا رہا ہے بلکہ فالتو بھی ہو جاتا رہا ہے۔سینکڑوں بلکہ ہزاروں افراد آبادیوں میں رہنے اور کام کرنے لگے، جگہ جگہ ہل چلائے جاتے رہے اور فصلوں کو باقاعدگی سے پانی دینے کے لیے آبپاشی کا نظام بنا لیا گیا۔ جدید حجری عہد میں فنیاتی تخصص کے حصول اور تجارتی سرگرمیوں کی رفتار تیز ہوگئی اور جیسے ہی زراعت نے انسانی قوت اور تصور کو آزاد کیا۔ برتن اور ٹوکری بنانے، کپڑے بننے، چمڑے کی دستکاری، زیورات بنانے،لکڑی کی نقش کاری، پینٹنگ،مٹی کے ماڈل تیار کرنے اور پتھر تراشی جیسے فنون ترقی کرنے لگے۔

ساتھ ساتھ انسان کا روحانی شعور بھی جاری رہا۔ اولین بشر پیکری مذہب، جس میں دیوی پوجا کو خاص اہمیت حاصل ہوتی تھی اب ترقی کر کے علامات، رسوم اور خدائی احکام معروف ومنکر کے پیچیدہ نظام میں ڈھل گیا۔ ان سب کا اظہار جدید حجری دور کے فاخرانہ آرٹ میں ہونے لگا۔

اس زن مرکز فنی روایت کی بعض نہایت اہم شہادتیں ہمیں میلارٹ کی کٹل ہویوک کھدائی سے ملتی ہیں۔ یہاں مشرق وسطیٰ کی سب سے زیادہ وسیع سمجھی جانے والی جدید حجری سائیٹ پرآثاریاتی باقیات بتیس ایکڑ پر پھیلی ہوئی ہیں۔ ٹیلے کا صرف120واں حصہ کھودا گیا

MashalBooks.org

ہے لیکن اس ایک کھدائی سے اندازاً آٹھ سو سالوں کی باقیات کا انکشاف ہوا۔ یہ 6500 سے تقریباً 5700 قبل مسیح سے تعلق رکھتی تھیں۔ اور جو کچھ یہاں سے دریافت ہوا یہ ہے کہ یہ کافی حد تک ترقی یافتہ سنٹر آف آرٹ ہے، اس کی دیواریں پینٹ شدہ تھیں، پلاسٹر کی بے شمار مورتیاں، پتھر سے تراشے ہوئے بت اور چکنی مٹی سے بنے ہوئے دیوی کے مجسمے تھے۔ ان سب کا مقصد دیوی کی الوہیت کا اظہار تھا میلارٹ نے ''کٹل ہویوک'' کے بارے میں اپنے اولین تین موسموں (1961 تا 1963) کے کام کا مختصر جائزہ پیش کرتے ہوئے لکھا ''اس کے بے شمار عبادت گاہیں ایک ترقی یافتہ مذہب کی گواہی دیتی ہیں، یہ علامتیت اور اصنام پرستی سے متعلقہ چیزوں کے لحاظ سے بالکل مکمل ہیں۔ ان سے فنِ تعمیر کے آغاز اور باشعور منصوبہ بندی کا ثبوت ملتا ہے، اس کی معیشت ان لوگوں کے زرعی طریقوں اور مویشیوں کی نسلوں کی افزائش، ان کے درآمدی سامان اور خام مال کی تجارت پر مبنی تھی۔''(۲۳)

کٹل ہویوک اور اس کے قریبی علاقے سے (جہاں آبادکاری تقریباً 5700 تا 5000 قبل مسیح میں ہوئی تھی) قدیم تہذیب کے بارے میں وافر معلومات دستیاب ہوئیں۔ جنوبی اناطولیہ کا میدان ان متعدد علاقوں سے صرف واحد علاقہ ہے جہاں دیوی کی پرستش کرنے والے زرعی معاشرے کے بارے میں آثاریاتی شواہد ملتے ہیں۔ درحقیقت اندازاً 6000 قبل مسیح میں نہ صرف زرعی انقلاب ایک مسلمہ امر تھا بلکہ بقول میلارٹ ''پوری طرح زرعی معاشرے ان علاقوں میں پھیلنا شروع ہو گئے جہاں اب تک کم منافع بخش زندگی گزارنے والے لوگ آباد تھے۔ ان علاقوں میں ایک طرف سیلابی مٹی والے میسوپوٹیمیا، ٹرانس کاکیشیا اور ٹرانس کیسپیا کے سیلابی مٹی والے میدان اور دوسری طرف جنوب مشرقی یورپ شامل تھا۔ مزید برآں اس سے ''متصل کچھ علاقہ کریٹ اور قبرص میں تھا جہاں یقیناً براستہ سمندر جانا پڑتا تھا۔ ان میں سے ہر علاقے میں آنے والے نئے لوگ اپنے ہمراہ جدید حجری معیشت لے کر آئے''(۲۴)

مختصراً یہ کہ اگرچہ صرف پچیس برس قبل ماہرین آثار قدیمہ ابھی تک دریائے فرات کے قدیم نشیبی خطے سومر کو تہذیب کا گہوارہ کہتے تھے (اور اگرچہ عام پبلک میں بھی یہی تاثر پایا جاتا ہے) اب ہم جانتے ہیں کہ تہذیب کا کوئی ایک گہوارہ نہیں تھا بلکہ کئی گہوارے تھے اور سب کے سب پہلے سے مشہور گہوارے سے ہزاروں سال قبل کے زمانے سے تعلق رکھتے

تھے۔ جیسا کہ میلارٹ نے 1957 میں اپنی تصنیف The Neolithic of the Near East لکھا تھا ''شہری تہذیب جسے بڑے عرصے تک میسوپوٹیمیا کی ایجاد سمجھا جاتا تھا اس کے بہت سے پیشرو مقامات تھے جیسے فلسطین اور اناطولیہ میں جیریکو یا کٹل ہویوک جنہیں عرصۂ دراز سے دنیا سے دور دراز علاقے سمجھا جاتا ہے۔[۲۵] مزید برآں اب ہم کسی اور چیز کو بھی اپنے ارتقا کی اصلی ترقی کے لیے زیادہ اہمیت دیتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ ان سب جگہوں پر جہاں ہماری مادی اور سماجی ٹیکنالوجی کو اوّلین کامیابیاں حاصل ہوئیں (اگر مرلن سٹون کا جملہ استعمال کیا جائے جسے اس نے اپنی لازوال کتاب کا ٹائیٹل بنایا تو کہا جائے گا کہ) وہاں ''خدا ایک عورت تھی''

نئی معلومات (کہ تہذیب اس سے کہیں زیادہ پرانی اور وسیع ہے جتنا کہ اس کے بارے میں گمان کیا جاتا تھا، اس سلسلے میں) بہت سی نئی عالمانہ تحریروں کو جنم دے رہی ہیں۔ ساتھ ساتھ سابقہ آثاریاتی نظریوں کی بھی ازسرنو جانچ پڑتال ہو رہی ہے لیکن یہ حیرت انگیز حقیقت (کہ اوّلین تہذیبوں کا نظریہ ''عورت مرکز'' تھا)، ماسوائے علمبردارانِ حقوقِ نسواں کے کسی کے لیے باعث دلچسپی نہیں ہوا، اگر ان کے علاوہ باہر کا کوئی سکالر یہ ذکر چھیڑتا ہے تو وہ عموماً سرسری ہوتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ لوگ بھی جو ملارٹ کی طرح یہ ذکر کرتے ہیں وہ خالصتاً فنکارانہ اور مذہبی اہمیت کے طور پر کرتے ہیں لیکن اس کے سماجی اور ثقافتی مضمرات کی تحقیق کرنے سے گریز کرتے ہیں۔

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ غالب نظریہ اب بھی یہی ہے کہ مردانہ اقتدار بمعہ نجی ملکیت اور غلام، یہ سب زرعی انقلاب کی ضمنی پیداواریں تھیں۔ یہ نظریہ اس شہادت کے باوجود اپنے آپ کو برقرار رکھے ہوئے ہے کہ اس کے برعکس مرد و عورت کی برابری سب لوگوں کے مابین ...... جدید حجری دور کا عمومی رویہ تھا۔ ہم اگلے ابواب میں اس مسحور کن شہادت کا تعاقب جاری رکھیں گے لیکن پہلے ہم ایک اور اہم دائرہ کار کا رُخ کرتے ہیں جہاں اس وقت نئی دریافتیں پرانے آثاریاتی تصورات کو روند رہی ہیں۔

قدیم یورپ

انسانی کلچر کے ہزاروں سابقہ نامعلوم برسوں میں زندگی کیسی تھی اس کے بارے میں

ہمیں بعض حیران کن شہادتیں ملی ہیں جو کلی طور پر غیر متوقع مقام سے موصول ہوئیں۔ عرصۂ دراز سے مسلّمہ چلے آنے والے اس نظریئے کے عین مطابق کہ مشرقی بحیرۂ روم سے خلیج فارس تک ہلالی شکل میں پھیلا ہوا زرخیز علاقہ، ہلال اخضر(Fertile Crescent) تہذیب کا گہوارہ تھا قدیم یورپ کو بڑے عرصے تک وہ واحد ثقافتی بند کھڑا پانی(cultural backwater) مانا جاتا تھا جو کچھ عرصہ پھلنے پھولنے کے بعد ''منوان(Minoan)'' اور یونانی تہذیبوں کی صورت میں ڈھل گیا، اس کی واحد وجہ مشرق کے اثرات تھے۔ لیکن جو تصویر اب سامنے آ رہی ہے وہ بالکل مختلف ہے۔

یونیورسٹی آف کیلی فورنیا کی ماہر آثار قدیمہ مریجہ گمبوٹس "The Goddesses and Gods of Old Europe" میں لکھتی ہے ''جہاں جنوب مشرقی یورپ کے جدید حجری اور کانسی کے عہد میں مختلف ثقافتی گروہوں کی اجتماعی شناخت اور اچھی کارکردگی کے اعتراف کے طور پر ایک نیا عنوان Civilization of Old Europe متعارف کرایا جا رہا ہے''۔ یہ ابتدائی کام ایجین اور ایڈریاٹک (بشمول جزائر) سے چیکوسلاواکیہ جنوبی پولینڈ اور مغربی یوکرائن تک سینکڑوں آثاریاتی دریافتوں کی فہرستوں اور تجزیات سے متعلق ہے (۲۶)

جنوب مشرقی یورپ کے باشندے سات ہزار برس قبل بھی بمشکل ہی پرانے دیہاتی لگتے تھے۔ گمبوٹس لکھتی ہے'' دو ہزار برسوں کے زرعی استحکام کے باعث ان کی مادی فلاح و بہبود میں مسلسل بہتری آتی چلی گئی جو ان کی زرخیز دریائی وادی کے وسائل کے بھرپور استعمال کا ثمر تھا۔ وہ گندم، جو، باقلہ، مٹر اور دالوں کی فصلیں اگاتے تھے۔ بلقان میں آج جتنے پالتو مویشی موجود ہیں، ماسوائے گھوڑوں کے، ان کی خوب نسل کشی کی جاتی تھی۔ ان کی ظروف سازی کی ٹیکنالوجی اور ہڈیوں اور پتھروں سے اشیا بنانے کی تکنیک بہت ترقی یافتہ تھی۔ وسطی یورپ میں تانبے کی دھات کاری 5500 قبل مسیح میں متعارف ہو چکی تھی۔ تجارت اور مواصلات نے جو ہزار سال میں کافی پھیل چکی تھی تبادلہ افکار میں آسانیاں پیدا کر کے ثقافتی رابطوں کو یقیناً فائدہ پہنچایا ہو گا۔ بادبانی کشتیوں کے چھٹے ہزاریئے کے بعد سے استعمال کی تصدیق ان کے ذریعے لے جائے جانے والے ظروف سے ہوتی ہے جن پر دندانے دار نشانات بنے ہوتے تھے۔''(۲۷)

7000 ق م سے 3500 ق م کے درمیان قدیم یورپیوں نے مختلف قسم کی دستکاریوں میں

مہارت پیدا کرنے کے لیے ایک جامع سماجی تنظیم قائم کی۔ اسی طرح مذہبی تعلیم کی توسیع کا بندوبست کیا گیا۔ مختلف سرکاری ادارے قائم کئے گئے۔ یہ لوگ تانبے کے آلات اور سونے کے زیورات بھی بنانے لگے۔ کچھ ایسے نشانات بھی وضع کئے گئے جنہیں تحریر کی ابتدائی شکل قرار دیا جاسکتا ہے۔ گمبوٹس کے الفاظ میں ''اگر تہذیب کی تعریف یہ ہو کہ لوگوں کی ایک کثیر تعداد میں ماحول کے مطابق ڈھلنے کی صلاحیت پیدا کی جائے۔ کارآمد فنون کو فروغ دیا جائے، ٹیکنالوجی، تحریر اور سماجی تعلق داری کے طور طریقے پیدا کئے جائیں تو صاف ظاہر ہے کہ قدیم یورپ نے اس میں قابل ذکر کامیابی حاصل کر لی تھی۔''(۲۸)

قدیم یورپ کے بارے میں آج ہم میں سے بیشتر لوگوں کے تاثرات یہ ہیں کہ وہ بڑے خوفناک اور وحشی قبائل کا براعظم تھا جو مسلسل جنوب کی طرف بڑھتے رہے اور بالآخر روم کو تاراج کر کے انہوں نے وحشت و بربریت میں رومنوں کو بھی پیچھے چھوڑ دیا تھا۔ چنانچہ قدیم یورپی معاشرے کی انتہائی قابل قدر اور فکر انگیز خصوصیات جن پر سے آثار یاتی محقق کے بیلچے نے پردہ اٹھایا، وہ ان کے اساسی طور پر امن پسندانہ کردار کی گواہی دے رہی تھیں۔ گمبوٹس بتاتی ہے ''قدیم یورپیوں نے کبھی مشکل جگہوں پر رہنے کی کوشش نہیں کی مثلاً اونچی، نیچی سطحوں اور ڈھلوان پہاڑیوں پر گھر نہیں بنائے جیسا کہ بعد کے انڈو یورپی لوگوں نے کیا تھا جنہوں نے ناقابل رسائی مقامات پر پہاڑی قلعے تعمیر کئے اور وہ اکثر اپنے پہاڑی مقامات کو چکردار پتھریلی دیواروں کے حصار میں لے لیتے۔ قدیم یورپی جگہوں کا انتخاب ان کے خوبصورت محل وقوع، اچھے پانی، عمدہ مٹی اور مویشیوں کی چراگاہوں کی دستیابی کے پیش نظر کیا جاتا تھا۔ ونکا، بُٹمر، پٹریسٹی اور ککٹینی کی آبادیاں ان کے ماحول کی خوبصورتی کی بنا پر تعمیر ہوئیں لیکن دفاعی اہمیت کی وجہ سے نہیں بنیں۔ بھاری قلعہ بندیوں اور خوفناک ہتھیاروں کی عدم موجودگی ان محبِ فن (art-loving) لوگوں کی اکثریت کے پُر امن کردار کی ترجمانی کرتی ہے''(۲۹)

مزید برآں یہاں جیسا کہ ''کٹل ہویوک'' اور ''ہاسلر'' میں تھا (جہاں پندرہ سو برس میں جنگوں کی تباہ کاریوں کا کوئی نشان نہیں ملتا) آثاریاتی شہادت بتاتی ہے کہ مردوں کا تسلط زندگی کا عام رویہ نہیں تھا(۳۰) ۔ گمبوٹس لکھتی ہے ''دونوں صنفوں میں تقسیم کار کے شواہد تو ملتے ہیں لیکن کسی ایک کی برتری کے نہیں ملتے۔ ونکا کے 53 قبرستانوں میں مردوں اور

عورتوں کی قبروں میں لوازماتِ دولت کے حوالے سے بمشکل ہی کوئی فرق دکھائی دیا ہے۔ ......معاشرے میں عورت کے کردار کے سلسلے میں ونکا کے شواہد مساوات اور غیر پدرشاہی (non-patriarchal) سوسائٹی کا اظہار کرتے ہیں۔ وارنا سوسائٹی پر بھی ایسی ہی صورت حال کا یقین کیا جا سکتا ہے۔ مجھے پدرشاہی ، مردانہ زنانہ ویلیو سکیل پر کوئی رینکنگ دکھائی نہیں دی''(۳۱)

خلاصہ یہ کہ ''کٹل ہویوک'' کی طرح یہاں بھی شواہد سے ظاہر ہوتا ہے کہ عمومی طور پر ایک غیر طبقاتی اور مبنی برانصاف معاشرہ تھا، طبقے اور جنس کی بنیاد پر کوئی نمایاں امتیاز روا نہیں رکھا جاتا تھا لیکن فرق یہ ہے کہ گمبوٹس کے کام میں اسے محض سطحی طور پر نہیں لیا گیا۔ اس ممتاز آثاریاتی مہم جُو نے بار بار ہمیں توجہ دلائی ہے، اس نے ہمت اور جرأت سے جو باتیں کہی ہیں بہت سے لوگ انہیں نظر انداز کرنے کا ہی راستہ اختیار کرتے ہیں اور بات یہ ہے کہ ان معاشروں میں ہمیں کوئی صنفی عدم مساوات دکھائی نہیں دیتی، ہمیں جو درس دیا گیا ہے وہ صرف ''فطرتِ انسانی ہے۔''

گمبوٹس کے مطابق ''مساواتِ مرد و زن پر مبنی معاشرت کا عملی اظہار قدیم یورپ کے تمام معروف قبرستانوں کے سامانِ تدفین سے ہوتا ہے۔'' اس نے متعدد شواہد کی بنا پر یہ بھی لکھا ہے کہ یہ ایک مادریت کا مظہر (matrilinear) معاشرہ تھا یعنی ایک ایسی طرزِ بود و باش تھی جس میں نسل اور وراثت ماں کے حوالے سے چلتی اور تقسیم ہوتی تھی۔(۳۲) مزید برآں وہ دعویٰ کرتی ہے کہ آثاریاتی شہادت اس امر میں کوئی شبہ باقی نہیں رہنے دیتی کہ قدیم یورپی زندگی کے تمام امور میں عورت کلیدی کردار ادا کرتی تھی۔

اس کا کہنا ہے کہ ''ان کے اقامتی مزاروں، عبادت گاہوں اور مقدس عمارتوں کی باقیات کو دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ تمام رسومِ عبادت کی تیاریاں اور ان کی ادائے رسوم جو دیوی سے اظہارِ عقیدت کے لیے مخصوص تھیں وہ عورت کی زیرِ نگرانی ہی انجام پاتی تھیں۔ آلاتِ رسوم کے اہتمام اور منت پوری کرنے کے تحائف اور چڑھاووں کے لیے بہت سی جسمانی مشقت درکار ہوتی تھی۔ عبادت گاہ کے ماڈلوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تہواروں پر عبادت گاہوں میں اناج پیسنے اور مقدس روٹی تیار کے لیے فرشوں کا تقریباً نصف حصہ یا ایک منزل مخصوص ہوتی تھی۔ عورتیں کھانے پکانے اور تزئین و آرائش میں بڑھ چڑھ کر حصہ

MashalBooks.org

لیتی تھیں۔ عبادت گاہ کے ساتھ ہی قربان سے متصل ایک عمودی کھڈی ہوتی تھی جس پر غالباً مقدس پارچات یا چڑھاووں کے لیے مختلف اشیا تیار کی جاتی تھیں۔ قدیم یورپ کی نفیس ترین تخلیقات رنگا رنگ گلدان اور مجسمے وغیرہ بھی موجود ہیں، یہ سب عورتوں کے تیار کردہ ہوتے تھے۔(۳۳)

فنکارانہ ورثہ جو قدیم کمیونٹیز نے ہمارے لئے چھوڑا ہے، اس میں دیوی کی پوجا کو زندگی کے تمام پہلوؤں میں مرکزیت حاصل تھی، آثاریاتی محقق کا بیلچہ ان لوازماتِ عبادت پر سے مسلسل پردہ اٹھا رہا ہے۔1947ء میں جب گمبوٹس نے اپنی کھدائیوں اور تین ہزار دیگر مقامات سے اکٹھی ہوئی دریافتوں کے بارے میں پہلی یک جلدی کتاب شائع کی تو اس میں کم وبیش تین ہزار مٹی، سنگِ مرمر، ہڈی تانبے اور سونے کی خوبصورت منقش مورتیوں کا ذکر تھا۔ اس کے علاوہ بہت بڑی تعداد میں مذہبی رسوم سے متعلقہ ظروف، قربان گاہیں، عبادت گاہیں، ظروف اور مزاروں کی دیواروں پر پینٹنگز بھی برآمد ہوئیں۔(۳۴)

ان دریافتوں میں سے یورپی جدید حجری ثقافت کی انتہائی پُر معنی باقیات مجسمے ہیں۔ یہ حیاتِ انسانی کے ایسے پہلوؤں کے بارے میں معلومات مہیا کرتے ہیں جو ماہرین آثار کے لیے بصورت دیگر ناقابل رسائی ہوتیں۔ مثلاً ملبوسات کے فیشن، حتیٰ کہ ہیئر سٹائل جیسی چیزیں، انہی مجسموں سے ملتی ہیں۔ یہ ہمیں اُس عہد کی مذہبی رسوم کی اساطیری شبیہوں کا براہ راست منظر دکھاتے ہیں۔ اور جو کچھ یہ مجسمے دکھاتے ہیں، (جیسا کہ جدید حجری دور اور بعد میں اناطولیہ کے کھلے میدانوں اور دیگر مشرقِ قریب اور مشرقِ بعید کے جدید حجری مقامات کے غاروں سے برآمد ہوا) وہ یہ تھا کہ یہاں بھی نسوانی مورتیوں اور علامات کو مرکزی مقام حاصل تھا۔

اس کے علاوہ یہ اس گمشدہ تہذیب کے جمالیاتی اور سماجی ارتقا کے اگلے قدم کے بارے میں جاذبِ توجہ شہادت فراہم کرتے ہیں کیونکہ ان نسوانی مورتیوں اور علامتوں میں سے بیشتر اُس جگہ پائی جانے والی مورتیوں اور علامات کے بے حد مشابہ ہیں جہاں آج بھی لاکھوں سیاح جا کر انہیں تکتے رہتے ہیں جبکہ انہیں عملاً اس کا کوئی علم نہیں ہوتا کہ وہ دراصل کس کو دیکھ رہے ہیں: یہ کانسی عہد کی تہذیب کی باقیات ہیں جو دورِ متاخر میں داستانی جزیرہ کریٹ میں پھلتی پھولتی رہی۔

قبل اس کے کہ ہم تاریخی زمانوں میں دیوی کی پوجا کے لیے معروف واحد ''اعلیٰ'' تہذیب کے اس صدر مقام کریٹ پر نظر ڈالیں آیئے پہلے بنظرِ غائر اس امر کا جائزہ لے لیں کہ جدید حجری عہد کی آثاریاتی باقیات میں سے ہم مغربی ثقافت کے ارتقا کی طرف کیا کیا اشارے پا سکتے ہیں اور ان کا ہمارے اپنے حال اور مستقبل کے ساتھ کیا تعلق بنتا ہے۔

MashalBooks.org

باب2

ماضی سے ملنے والے پیغامات: دیوی کی دنیا

زمانہ قبل از تاریخ میں ہمارے وہ آباؤاجداد کس قسم کے لوگ تھے جو دیوی کی پوجا کرتے تھے؟ تحریری تاریخ یا ریکارڈ شدہ تاریخ سے قبل کے زمانے کے ہزاروں برسوں میں ثقافتی ارتقا کے دوران زندگی کیسی ہوا کرتی تھی؟ اور ہم ان زمانوں سے، جو ہم سے تعلق رکھتے ہیں، کیا سیکھ سکتے ہیں؟

چونکہ انہوں نے ہمارے لئے کوئی تحریری روئداد نہیں چھوڑی، اس لئے ہم صرف قیاس کر کے کوئی نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں جیسے شرلاک ہومز سائنسدان بن بیٹھا تھا، ہم بھی خیالوں کے گھوڑے دوڑا سکتے ہیں کہ حجری دور(Paleolithic) اور اس کے بعد کے ادوار میں نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ جدید حجری دور(Neolithic) کے لوگ کیا سوچتے تھے، کیا احساسات رکھتے تھے اور کیسا روّیہ اختیار کئے ہوئے تھے۔ اور تقریباً ہر چیز جو عہد عتیق کے بارے میں ہمیں پڑھائی گئی اٹکل پچو پر مبنی ہے۔حتٰی کہ وہ ریکارڈ جو ابتدائے تاریخ کی ثقافتوں ''سومر''(Sumer) ، ''بابل''(Babylon)اور''کریٹ''(Crete) کے حوالے سے ہمارے پاس ہیں بے حد ناکافی ادھورے اور ٹوٹے پھوٹے ہوئے ہیں اور یہ زیادہ تر اشیاء کی فہرستوں اور تجارت سے متعلق ہیں۔ اور زمانہ قبل از تاریخ اور ابتدائی تاریخ کے کلاسیکل یونانی، رومن، عبرانی اور مسیحی عہد کے بارے میں بعد لکھے گئے تفصیلی حالات بھی اندازوں اور قیاسات پر مبنی ہیں اور یہ جدید آثاریاتی طریقوں کی مدد سے قلمبند نہیں کئے گئے۔

یہ ایک امر واقعہ ہے کہ ہم نے اپنی ثقافت کے ارتقا کی ہیئت کے بارے میں جو کچھ

MashalBooks.org

سوچنا سیکھا ہوا ہے اس میں سے بیشتر درحقیقت تعبیر ہے۔ علاوہ ازیں جیسا کہ ہم نے پچھلے باب میں دیکھا ہے کہ تعبیر، پہلے سے موجود حالاتِ دنیا کا عملِ توسیع ہوتی ہے۔ یہ اِدھر اُدھر بکھری ہوئی معلومات سے اخذ کردہ نتائج پر مشتمل ہوتی ہے جس کی تشریح اس طرح کی جاتی ہے کہ یہ ہمارے ثقافتی ارتقا کے روایتی ماڈل پر ایک سیدھے خط کی مانند ''قدیم انسان'' سے نام نہاد ''شائستہ انسان'' تک پہنچ جائے جو اپنے بہت سے اختلافات کے باوجود ایک مشترکہ شغل فتح کرنے، قتل وغارت کرنے اور مغلوب کرنے میں جُت جاتے ہیں۔

حالیہ برسوں میں ماہرین آثاریات نے قدیم مقامات کی سائنسی انداز میں کھدائیاں کر کے قبل از تاریخ اور بالخصوص جدید حجری دور کے بارے میں بہت سی معلومات حاصل کرلی ہیں، مؤخرالذکر وہ زمانہ تھا جب ہمارے آباؤ اجداد نے پہلے پہل کھیتی باڑی اور مویشیوں کی افزائش نسل کے طریقے سیکھ کر بستیاں آباد کرنے شروع کردی تھیں۔ تازہ تناظر میں تجزیہ کرنے سے یہ کھدائیاں ہمیں اپنے ماضی کا نئے سرے سے تعین کرنے اور تعمیر نو کرنے کے لئے ایک ذخیرۂ معلومات(Database) فراہم کرتی ہیں۔

ان معلومات کا ایک اہم ماخذ عمارات کی کھدائیاں اور وہاں سے برآمد ہونے والی اشیاء ہیں جن میں ملبوسات، زیورات، غذائیں، فرنیچر، برتن، آلات اور روزمرہ کی زندگی میں استعمال ہونے والی چیزیں شامل ہیں، دوسرا ماخذ مقاماتِ تدفین کی کھدائی ہے جو نہ صرف موت سے متعلق لوگوں کے رویّوں کا اظہار کرتی ہے بلکہ ان کی زندگی کے بارے میں بھی معلومات مہیا کرتی ہے۔ ان دونوں ذخیرہ ہائے معلومات کی قدرِ مشترک یا ان دونوں پر حاوی زمانہ قبل از تاریخ سے متعلق ہمارا بے حد قیمتی ماخذِ اطلاعات آرٹ ہے۔

ایسی صورت میں جب کوئی تحریری اور زبانی علمی روایت موجود بھی ہو تب بھی آرٹ علامتی ابلاغ کی ایک شکل ہوتا ہے۔ خواہ یہ روزمرہ کی زندگی کے بارے میں وال پینٹنگ ہو یا اہم داستانوں سے متعلقہ پینٹنگ ہو، مذہبی شبیہات کے مجسمے ہوں، ستونوں پر رسوم کا اظہار کرنے والی آرائش ہو یا محض مرتبانوں اور گلدانوں کی تزئین کاری ہو، شاہی مہروں کی تصاویر ہوں، یا منقش زیورات ہوں، یہ بتاتے ہیں کہ یہ لوگ کیسے جئے اور کیسے مرے۔ یہ چیزیں اس بارے میں بھی بہت کچھ بتاتی ہیں کہ ان کی سوچ کا انداز کیا تھا کیونکہ جدید حجری دور کا آرٹ حقیقی مفہوم میں ایک قسم کی زبان یا ''شارٹ ہینڈ'' ہے جو علامتی طور پر اُس

زمانے کے لوگوں کے تجربات ومحسوسات کا اظہار ہے یا اس چیز کو متشکل کرتا ہے جسے ہم حقیقت کہتے ہیں (1) اگر ہم اس زبان کو خود بولنے کی اس طرح اجازت دیں کہ اس پر حقیقت کے مروّجہ ماڈلز کو مسلّط نہ ہونے دیا جائے تو یہ ہمارے ثقافتی مآخذ کی حیرت انگیز کہانی سناتی ہے۔

جدید حجری آرٹ

جدید حجری آرٹ کے سلسلے میں بے حد حیران کن چیزوں میں سے ایک چیز وہ ہے جس کی منظر کشی یہ ''نہیں'' کرتا کیونکہ جس شے کی منظر کشی وہ لوگ اپنے آرٹ میں نہیں کرتے وہ احسن ترین طریقے سے بتا سکتی ہے کہ وہ جو کچھ کرتے ہیں وہ ہے کیا۔

قدیم دور کے آرٹ کے بالکل برعکس جدید حجری آرٹ میں سے جو موضوع غائب ہونے کی وجہ سے زیادہ اہمیت اختیار کر گیا ہے وہ اس کی نقش گری تھی جو قوتِ بازو، ظلم اور تشدد پر مبنی طاقت کو ایک آئیڈیل کے طور پر پیش کرتی تھی۔ یہاں ''نامی گرامی جنگجوؤں'' (noble wrarriors) کی شبیہیں یا جنگوں کے مناظر نہیں ہیں اور نہ ہی کہیں ''بہادر فاتحین'' کے نشانات ملتے ہیں جو زنجیروں میں جکڑے اسیروں کو کھینچتے ہوئے لے جا رہے ہوتے ہیں یا غلامی کے دیگر شواہد دکھائے جا رہے ہوتے ہیں۔

یہ آرٹ ان قدیم زمانوں کی باقیات سے بھی بالکل برعکس ہے جو مرد کی برتری ظاہر کرنے والے حملہ آوروں کی یادیں ہوتی ہیں۔ ان جدید حجری دیوی کی پوجا پر مبنی معاشروں کی شبیہوں میں ''سربراہانِ قبیلہ'' کی فضول خرچی والی تدفین کے مناظر بھی نہیں ہیں۔ اسی طرح یہ دورِ قدیم کی مرد کی برتری پر مبنی مصری تہذیبوں جیسے معاشرے سے بالکل الٹ معاشرے کا اظہار کرتی ہیں۔ ان میں ان جابر حکمرانوں کا کوئی نشان نہیں ملتا جو آخرت کی زندگی میں داخل ہوتے وقت اپنے ہمراہ خود سے کمتر انسانوں کو لے جاتے تھے جنہیں ان کی موت کے موقع قربان کر دیا جاتا تھا۔

نہ ہی ہم ان میں، ان کے بالکل برعکس دورِ قدیم کے معاشروں کے نشانات، مہلک ہتھیاروں کے انبار یا ان ہتھیاروں پر استعمال والی مادی ٹیکنالوجی اور قدرتی وسائل کے ضیاع کے آثار پاتے ہیں۔ یہ بالکل پُرامن ہونے کے تمام خصائص رکھتا تھا اس تاثر کو مزید

MashalBooks.org

تقویت ایک اور چیز کی عدم موجودگی سے بھی ملتی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہاں فوجی قلعہ بندیوں کے نشانات نہیں پائے جاتے، البتہ بعد میں یہ رفتہ رفتہ ظاہر ہونے لگے جب دنیا کے دوردراز سے تعلق رکھنے والے جنگجوؤں نے ادھر کا رُخ کرنا شروع کر دیا۔ ان کا ہم بعد میں جائزہ لیں گے۔

جدید حجری آرٹ میں نہ تو دیوی نہ ہی اس کا جنگجو بیٹا ایسے نشانات اٹھائے دکھائی دیتے ہیں جنہیں ہم یہ جان گئے ہیں کہ وہ طاقت کے مظہر یعنی نیزے، تلواریں، خوفناک آواز سے گرنے والے گولے ہوا کرتے تھے۔ یہ علامات ایک دنیاوی مطلق العنان حکمران کی ہوتی ہیں یا اس دیوی دیوتا کی ہوتی ہیں جو قتل وغارت اور لوگوں کے ہاتھ پاؤں کاٹ کر انہیں مطیع فرمان بنالیا کرتے تھے۔ اس سے بھی آگے بڑھ کر اس عہد کا آرٹ حکمران ومحکوم اور آقا اور عایا کی شبیہات سے خالی ہے جو جبر پر ایمان رکھنے والے معاشروں کی خصوصیت ہوتی ہے۔

یہاں جو چیز ہم ہر جگہ مقبروں، مکانوں، دیوار گیر پینٹنگز، مرتبانوں اور گلدانوں اور مٹی کی مورتیوں پر بنی آرائشوں میں پاتے ہیں اشیائے فطرت کی علامات کی بھر مار ہے۔ ان اشیاء کا تعلق دیوی پرستش سے ہے، یہ ان کے ذوقِ حُسن اور رازِ حیات پر اظہار حیرت کی توثیق کرتی ہیں۔

یہاں زندگی کو تقویت دینے والی دھوپ اور پانی کا حوالہ دینے والے عناصر کی بھرمار ہے جو جیومیٹریائی شکلوں یا لہردار خطوط میں بہتے ہوئے پانی کا تاثر دیتے ہیں۔ یہ ہنگری میں ۵۰۰۰ برس قبل از مسیح کی یورپی قربان گاہ پر منقش ہیں۔ کٹل ہویوک کے مزاروں کی دیواروں پر بیلوں کے بڑے بڑے کنڈلی دار سرپینٹ کئے گئے ہیں۔ جنوبی رومانیہ کے سرخ مٹی سے بنے ہوئے خارپشت، بلغاریہ کے ہرنی کی شکل میں بنے ہوئے گلدان، مچھلی کی شکل کی انڈہ سنگ تراشی اور پرندوں کی شکل کے گلدان بھی ان کی تہذیب کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ (۲)

پھر اژدھا اور تتلیاں (مافوق الفطرت حجم میں علامات) ہیں جنہیں تاریخی زمانوں میں دیوی کی منقلب کر دینے والی قوتوں کی مظہر مانا جاتا تھا جیسا کہ مشرقی کریٹ کے ملک ''زکرو'' سے تعلق رکھنے والا مُہر کا نقش تھا۔ دیوی کو تتلی کے سے پروں والی ہستی کے روپ

میں ظاہر کیا گیا تھا۔ حتیٰ کہ بعد کے دور میں کریٹ کی دومنہ والی کلہاڑی کو کھیتوں کو ہموار بنانے کے لئے استعمال ہونے والے کدال کی طرح دکھایا گیا تھا، وہ تتلی کی مانند تھا،(۳) یا اژدھا کی طرح تھا جو اپنی کینچلی اتارتا ہے اور ''ازسرنو پیدا'' ہوجاتا ہے، وہ دیوی کے وجود کا حصہ تھا، جو اس کے ظہور ثانی کی قوتوں کی ایک اور علامت تھا۔ (۴)

اور ہم ہر جگہ، دیواروں پر، مجسموں میں اور منت کی مورتیوں میں دیوی کا عکس موجود پاتے ہیں۔ یہ کئی روپوں میں پائی جاتی ہے کہیں یہ کنواری دوشیزہ ہے کہیں دادی پردادی کی تجسیم میں ہے اور کہیں پانیوں، پرندوں اور زیر زمین دنیا کی آقا یا ''الوہی مادر'' (Divine Mother) ہے جو اپنے الوہی بچے کو بازوؤں میں سنبھالے ہوئے ہے۔ (۵)

بعض شبیہیں اتنی حقیقت نگارانہ ہیں کہ بالکل جیتی جاگتی دکھائی دیتی ہیں جیسے پانچ ہزار برس قبل مسیح میں مغربی سلوویکیہ کے ایک قبرستان میں ایک ڈش پر لڑھکتا ہوا سانپ پایا گیا تھا۔ جبکہ دیگر شبیہیں ایسے غیر حقیقت پسندانہ طریقوں سے بنائی گئی ہیں کہ وہ ہمارے انتہائی ''ماڈرن'' تجریدی آرٹ سے بھی زیادہ خیالی اور فرضی دکھائی دیتی ہیں۔ ان میں ایک بڑا رسمِ مقدس کا طرحدار گلدان، یا جام (ساغر) ہے جسے ایک تخت نشین دیوی کی شکل میں بنایا گیا ہے۔ یہ جنوب مشرقی ہنگری کے ''ٹسزا'' کلچر کے تصویری رسم الخط میں نقش شدہ ہے۔ پھر ۵۰۰۰ ق م کے رومانیہ کی ستونی سروالی دیوی ہے جس نے بازو سینے پر باندھ رکھے ہیں اور چھ ہزار سال قبل مسیح کے وسطی بلغاریہ کے علاقے ٹل ازمک کی سنگ مرمر سے بنی دیوی ہے جس کے بازو ایک خاص سکیم کے تحت بنائے گئے ہیں، اس کے پیڑو کے نیچے کے بالوں کی مثلث طبعی حد سے متجاوز ہے۔ مزید کچھ شبیہیں حیرت انگیز طور پر خوبصورت ہیں جیسے ۸۰۰۰ سال پرانا سرخ مٹی سے بنا ہوا ایک سٹینڈ ہے جس کی عورت کی سی چھاتیاں ہیں، یہ کسی قدر کلاسیکل یونانی مجسمے کی یاد دلاتا ہے جسے "Winged Victory" کہا جاتا تھا اور پینٹ شدہ ''کوکوٹینی'' مرتبان ہیں جو دلکش شکلوں اور ہندسی خطوط میں لپٹے ہوئے سانپ کی طرح دکھائی دیتے ہیں۔ کچھ اور نمونے صلیب کی مانند جڑے ہوئے تختے ہیں جن پر کھدی ہوئی دیوی کی ناف یا چھاتی کے قریب سوراخ ہے۔ اس کے حوالے سے ہماری اپنی بعض اہم ترین علامات کے پرانے معنوں کے بارے میں دلچسپ سوالات اٹھتے ہیں۔ (۶) ان میں سے بہت سی شبیہوں کے ''فنطاسیہ'' (خیالی صورت گری) میں کوئی مفہوم پایا جاتا ہے۔ ان کی

خواب کی سی اور بعض اوقات بدہیئت سی شکل کسی خفیہ رسم یا کسی بھولی بسری داستان کی یاد دلاتی ہے۔ مثال کے طور پر ایک ونکا مجسمے پر ایک پرندے کی شکل والی عورت بنی ہوئی اور اس نے جو پرندے کی شکل کا بچہ اٹھایا ہوا ہے وہ قدیم رسوم کا ایک نقاب پوش سر برآوردہ کردار دکھائی دیتا ہے، غالبًا وہ ایک ''پرندہ دیوی'' اور اس کے مقدس بچے کے بارے میں ایک اساطیری داستان کی اداکاری کررہی ہے۔ اسی طرح ۴۰۰۰ سال قبل مسیح کے مقدونیہ کا سرخ پختہ مٹی سے بنا ہوا بیل کا سر ہے جس کی آنکھیں انسان کی آنکھوں جیسی ہیں یہ جدید حجری دور کی کسی اور رسم اور داستان کا نقاب پوش کردار ہے۔ ان نقاب پوش شبیہات میں سے بعض کائناتی قوتوں کی نمائندگی کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں کوئی فیض رسانی کا اظہار کررہی ہے اور کوئی ڈر اور خوف میں مبتلا کررہی ہے۔ جبکہ بعض دوسری ظرافتِ طبع کا مظاہرہ کررہی ہیں جیسے کہ ایک نقاب پوش شخص ڈھیلا ڈھالا گدے دار جانگیہ پہنے اپنا برہنہ پیٹ دکھا رہا ہے، یہ پانچ ہزار سال قبل مسیح کا ''فیفکوس''(Fafkos) ہے جس کے بارے میں گمبوٹس کا خیال ہے کہ یہ کوئی مسخرہ ایکٹر ہے۔ کچھ ایسی شبیہات بھی ہیں جنہیں گمبوٹس کائناتی انڈے کہتی ہے یہ بھی اس دیوی کی علامات ہیں جس کا وجود الوہی ساغر یا جام ہے اس کے اندر معجزۂ پیدائش اور اس امر کی قدرت موجود ہے کہ وہ فطرت کی چکردار مخفی باز آفرینی کے ذریعے موت کو زندگی میں بدل دے۔ (۷)

فطرت کی جُملہ اشیا کی وحدت کا اصل موضوع جو دیوی کی صورت میں متشکل ہے جدید حجری آرٹ میں بھرپور انداز میں موجود دکھائی دیتا ہے کیونکہ یہاں کائنات پر حکمرانی کرنے والی اعلیٰ ترین قوت ایک مقدس دیوی ہے جو اپنے لوگوں کو زندگی بخشتی ہے، انہیں مادی اور روحانی غذا عطا کرتی ہے اور جس پر یہ بھروسہ بھی کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے بچوں کو حالتِ مرگ میں اپنے کائناتی رحم میں واپس لے جاسکتی ہے۔

مثال کے طور پر کٹل ہویوک کے مزاروں میں ہمیں ایسی شبیہیں ملتی ہیں جن میں دیوی کو حالتِ حمل میں بھی دکھایا گیا ہے اور بچے کو جنم دینے کی حالت میں بھی۔ وہ اکثر اپنے ہمراہ طاقتور جانوروں چیتے اور خاص طور پر بیل کو رکھتی ہے۔ (۸) وہ بعض اپنی شبیہات میں فطرت کے اندر ہمہ گیر اتحاد کی علامت کے طور پر خود کسی حد تک انسان اور کسی حد تک جانور کی شکل میں ظاہر ہوتی ہے۔ (۹) ''اپنے تاریک پہلوؤں سے بھی نمودار ہوتی ہے جسے اہل علم

ارضی روپ کا نام دیتے ہیں اسے نظام فطرت کے حصے کے طور پر دکھایا گیا ہے۔جس طرح اس سے زندگی جنم لیتی ہے وہ بھی اپنی موت کی طرف واپسی چلی جاتی ہے تاکہ ازسرنو جنم لے سکے۔

کہا جاسکتا ہے کہ سکالرز جس چیز کو دیوی کے ارضی پہلو (بعض اوقات ماورائے حقیقت روپ میں اور بعض اوقات بھونڈے انداز میں پیش کیا جانا) قرار دیتے ہیں وہ شاید ہمارے آباؤاجداد کی ایسی کوششیں ہوں جو وہ حقیقت کے نامعلوم تاریک پہلوؤں کو ایک نام یا شکل دینے کے لئے کرتے تھے۔ یہ ارضی شبیہات جو وال پینٹنگز، نقابوں اور مجسموں کی شکل میں ہوتیں کبھی موت کو پُرتخیل(fantastic) انداز میں اور کبھی مضحکہ خیز انداز میں پیش کرتی ہیں اور انہیں مذہبی جذبے کے تحت بھی متصوفانہ وحدت(Mystical Unity) کے اظہار کے لئے دنیا پر حکمرانی کرنے والی کبھی پُرخطر اور کبھی پُرشفقت قوتوں کے طور پر پیش کیا جاتا تھا۔

چنانچہ اس خیال سے کہ زندگی کو مذہبی نقش گری اور رسم ورواج کے ذریعے ہی گزارا جاسکتا ہے فطرت کی تباہ کن قوتوں اور طریقِ عمل کو مانا اور ان کا احترام کیا جاتا تھا اور چونکہ مذہبی رسوم وتقریبات کا مقصد فرد اور معاشرے کو حیات آفرینی اور تحفظِ طریق ہائے زندگی میں احساسِ شرکت دلانا ہوتا ہے اس لئے کچھ ایسی رسمیں بھی ادا کی جاتی تھیں جن کے ذریعے ان کے خیال میں فطرت کے زیادہ خوفناک طورطریقوں کی راہ روکی جاسکتی تھی۔

لیکن ان سب کے ساتھ ساتھ زندگی اور موت سے متعلق دیوی کے دوہرے پہلو کی بہت سی شبیہیں دنیا کا ایسا نظریہ پیش کرتی دکھائی دیتی ہیں جس میں آرٹ اور زندگی کا بنیادی مقصد فتوحات کرنا، مالِ غنیمت اکٹھا کرنا اور لوٹ مار کرنا نہیں بلکہ زمین کو کاشت کرنا اور زندگی کو پُرسکون بنانے کے لئے مادی اور روحانی سازوسامان مہیا کرنا ہے۔ اور مجموعی طور پر جدید حجری آرٹ اور ایسا ہی بلکہ کچھ بڑھ کر ''منوآن''(Minoan art) آرٹ ایسا نظریہ پیش کرتا نظر آتا ہے جس میں کائنات پر حکمرانی کرنے والی پُراسرار قوتوں کا بنیادی کام اطاعت کرانا، سزائیں دلوانا اور تباہی پھیلانا نہیں بلکہ کچھ عطا کرنا ہے۔

ہم جانتے ہیں کہ آرٹ، بالخصوص مذہبی یا دیومالائی آرٹ نہ صرف لوگوں کے رویّوں کی عکاسی کرتا ہے بلکہ ان کی ثقافت اور سماجی نظم وضبط کی خصوصی شکل کی بھی ترجمانی کرتا ہے۔''دیوی مرکز آرٹ''، جس کا ہم جائزہ لیتے رہے ہیں اس کی نمایاں ترین خصوصیت اس

میں مرد کے غلبہ یا جنگ وجدل کی شبیہوں کی عدم موجودگی ہے۔ وہ ایک ایسے سماجی نظام کی عکاسی کرتا معلوم ہوتا ہے جس میں عورتوں کو بطور سربراہ قبیلہ، بطور پادری اور دیگراہم کرداروں میں مرکزی اہمیت حاصل تھی۔ اور اس میں مرد اور عورتیں، دونوں مشترکہ بھلائی کے لئے مساوی حیثیت میں کام کرتے تھے۔ اگر غضبناک مرد دیوتاؤں یا فرمان رواؤں کو بجلی کے کڑکے دکھاتے یا اسلحہ لہراتے یا بڑے فاتحین کو پابجولاں غلاموں کو کھینچتے ہوئے لے جاتے نہیں دکھایا گیا تو اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ یہ اس وجہ سے تھا کہ حقیقی زندگی ان شبیہوں کا کوئی مماثل موجود نہ تھا۔ (۱۰) اور اگر مرکزی مذہبی شبیہ، بچے کو جنم دیتی ہوئی عورت کی تھی اور صلیب پر، ہمارے زمانے کی طرح، دم توڑتا ہوا مرد نہ تھا، یہ نتیجہ اخذ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ زندگی اور زندگی کے ساتھ پیار کو (نہ کہ موت اور موت کے خوف کو) اس معاشرے اور اس آرٹ میں غلبہ حاصل تھا۔

دیوی کی پرستش

زمانہ قبل از تاریخ میں دیوی پوجا کے انتہائی دلچسپ پہلوؤں میں سے ایک پہلو یہ تھا جسے ماہر اصنام پرستی اور مؤرخِ مذہب جوزف کیمپبل ''اجتماعِ ضدین'' کہتا ہے (۱۱) اس کا مطلب یہ ہے کہ دیوی کی پرستش یا پوجا مشرکانہ بھی تھی اور مؤحدانہ بھی۔ یہ مشرکانہ اس مفہوم میں تھی کہ اس کی پرستش مختلف ناموں اور مختلف شکلوں میں کی جاتی تھی۔ لیکن یہ مؤحدانہ اس مفہوم میں تھی کہ ہم دیوی پر اپنے ایمان کا اظہار اسی طرح کر سکتے ہیں جس طرح خدا پر بطور ماوراہستی اپنے ایمان کا اظہار کرتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر دیوی کی پوجا، اس کے ماں ہونے، جنم دہندہ ہونے اور کنواری ہونے کے مختلف پہلوؤں اور مختلف مقاماتِ پرستش کے ساتھ متلازم علامات اور شبیہوں کے درمیان زبردست مماثلتوں کی وجہ سے کرتے ہیں۔

اس حیرت انگیز مذہبی وحدت کی ایک ممکنہ توجیہہ یہ ہوسکتی ہے کہ اصل میں تمام قدیم زرعی معاشروں میں دیوی کی پرستش ہوا کرتی تھی۔ ہمیں عورت کو خدا ماننے کی شہادت زراعت کی ابتدا کرنے والے تین بڑے مراکز ایشیائے کوچک اور جنوب مشرقی یورپ، جنوب مشرقی ایشیا میں تھائی لینڈ اور بعدازاں وسطی امریکہ میں بھی ملتی ہے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ عورت اپنے حیاتیاتی کردار میں زمین ہی کی مانند جنم دیتی اور نشوونما کرتی ہے۔ (۱۲)

دنیا کے مختلف حصوں میں قدیم ترین زمانوں سے مشہور تخلیق کی کہانیوں میں ہمیں ''مادر دیوی'' تمام موجودات کا منبع ملتی ہے۔ شمالی اور جنوبی امریکہ میں "Lady of the serpent skirt" ہے۔ اور یہ بات بھی خالی از دلچسپی نہیں ہے کہ یورپ مشرق وسطیٰ اور ایشیاء میں مادہ سانپ اس کے بنیادی مظاہر میں سے ہے۔ قدیم میسوپوٹیمیا میں کائنات کا یہی تصور ''عالمی پہاڑ'' کے اس تصور میں پایا جاتا ہے جس میں کائنات کو مادر دیوی کا جسد مانا جاتا ہے۔ یہ تصوّر تمام تاریخی ادوار میں موجود رہا ہے۔ اور جیسے سمیریا کی دیوی ''نمّو'' جو آسمان اور زمین کو جنم دیتی ہے اس کا نام ۲۰۰۰ سال قبل مسیح کے ''خطِ میخی''(Cuneiform) کے متن میں لکھا گیا ہے۔ (یہ آج کل سب سے بڑے عجائب گھروں میں شمار ہونے والے "Louvre" کے عجائب گھر میں محفوظ ہے) یہ تصویری رسم الخط میں ہے جس میں سمندر کو نمایاں کیا گیا ہے۔ (۱۳)

نسوانی اصول کا قدیم سمندر کے ساتھ جوڑ بھی ایک ہمہ گیر نظریہ ہے۔ مثال کے طور پر قدیم یورپ میں مزیّن برتنوں میں پانی کی رمزیت ایک بنیادی خیال ہوتی ہے۔ یہاں عظیم دیوی بعض اوقات ''پرندہ دیوی'' اور بعض اوقات سانپ دیوی کی شکل میں پانی کی حیات بخش قوت پر حکمرانی کرتی ہے۔ یورپ اور اناطولیہ میں ''بارش بردار'' اور ''دودھ بردار'' تصورات کو یکجا اور مربوط کردیا جاتا تھا۔ دیوی کے عبادت خانوں کی اشیا میں جو مٹکے اور مرتبان شامل ہوتے ہیں ان پر دیوی کی شبیہہ بنی ہوتی ہے۔ یہ مٹکے بعض اوقات نظریۂ جسمیت (Anthropomorphism) کے تحت دیوی کی شکل کے بنائے جاتے ہیں۔ مصری دیوی ''نٹ''(Nut) کی طرح وہ ابتدا ہی سے بہتے ہوئے سماوی پانی کی وحدت کی علامت ہے۔ بعد میں وہ کریٹ کی دیوی ''اریاڈنے''(Ariadne) بمعنی بے حد مقدس اور یونان کی دیوی ''افروڈائیٹ'' سمندر میں سے طلوع ہوتی ہے۔ (۱۴) درحقیقت یہ شبیہہ مسیحی یورپ اس وقت بھی اتنی طاقتور تھی کہ اس نے "Botticelli" کی مشہور دیوی ''وینس'' کو غیبی طور پر سمندر میں سے طلوع ہونے پر آمادہ کرلیا۔

اگرچہ ثقافتی ارتقا کے بارے میں ہمیں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے اس میں اسے شاذ و نادر ہی شامل کیا جاتا ہے تاہم جدید حجری تاریخ کے ہزاروں برسوں میں جتنا ارتقا ہوا وہ آج بھی ہمارے پاس موجود ہے۔ جیسا کہ میلارٹ لکھتا ہے ''اس نے اس بنیاد کی تشکیل کی جس پر بعد کی تمام ثقافتوں اور تہذیبوں کی تعمیر ہوئی ہے۔'' (۱۵) یا جیسا کہ گمبوٹس نے لکھا کہ اگرچہ

جس دنیا کی وہ نمائندگی کرتے تھے وہ تباہ ہوگئی ہماری دیوی پوجا کے جدید حجری دور کے آباؤاجداد کی ''اساطیری شبیہات زیریں سطح پر گھسٹتی رہیں وہیں سے انھوں نے یورپی ثقافتی ارتقا کو مزید آگے بڑھایا۔ اس سے یورپی نفسیات کو بے پناہ تقویت ملی۔ (۱۶)

یہ ایک امرواقعہ ہے کہ اگر ہم جدید حجری آرٹ کو قریب سے دیکھیں تو ہمیں حقیقی طور پر حیرت ہوتی ہے کہ اس کی دیوی کی خیالی تصاویر وشبیہات میں سے کتنا کچھ بچ گیا ہے۔ اور یہ کہ تاریخِ مذہب کی بہت سی معیاری کتابیں اس سحرآفریں حقیقت کا احاطہ کرنے سے قاصر ہیں۔ جیسا کہ جدید حجری دور کی حاملہ دیوی پورے پیٹ والی قدیم حجری دور کی ''وینسوں'' کی براہ راست اولاد تھی وہی شبیہہ دور متوسط کی مسیحی نقاشی میں حاملہ مریم (میرؔی) میں پائی جاتی ہے۔ جدید حجری آرٹ کی نوجوان دیوی یادوشیزہ کی شبیہہ کا میرؔی بطور مقدس کنواری کے روپ میں احترام کیا جاتا ہے۔ درحقیقت جدید حجری دور کا ''ماں دیوی'' کا مجسمہ جس نے اپنے مقدس بیٹے کو تھام رکھا ہے اب بھی بطور کرسچین میڈونا اور بچہ ہر جگہ ڈرامائی شہادت دے رہا ہے۔

دیوی کے ساتھ منسلکہ روایتی شبیہات، مثلاً بیل، کاسۂ سر یا سینگ جو فطرت کی قوتوں کی علامات ہیں کلاسیکی اور بعدازاں مسیحی ادوار میں بھی محفوظ رہیں۔ بیل کو دورِ مابعد کے ''لامذہب'' پدرسری علم صنمیات میں مرکزی علامت کے طور پر استعمال کیا گیا۔ اس کے بعد بڑے بڑے سینگوں والا ''بیل دیوتا'' مسیحی مجسمہ نگاری میں مردانہ طاقت کی علامت سے تبدیل ہو کر شیطان یا شرّ وفساد کی علامت بن گیا۔ لیکن جدید حجری زمانوں میں بیل کے سینگ جنہیں اب ہم معمول کے طور پر شیطان کے ساتھ منسلک کرتے ہیں، ان کے معنی بہت تبدیل ہوگئے۔ کٹل ہویوک کے مکانوں اور خانقاہوں کی کھدائی سے بیل کے سینگوں کی جوشبیہات ملیں ان میں سینگ، دیوی کی نگرانی میں منعقدہ مجالس یا قربان گاہوں میں، قطار بندی کے لئے استعمال ہوئے۔ (۱۷) یہاں بیل خود بھی اب تک دیوی کی حتمی طاقت کا مظہر مانا جاتا ہے۔ یہ ''نر'' کے اصول کی علامت ہے مگر یہ ایسی چیز ہے جو دیگر سب چیزوں کی طرح سب کچھ عطا کرنے والے الوہی رحم سے برآمد ہوا ہے۔ جیسا کہ کٹل ہویوک کی ایک خانقاہ میں دکھایا گیا ہے کہ دیوی ایک بچھڑے کو جنم دے رہی ہے۔

جدید حجری دور میں دیوی کے مجسموں کا بھی بیک وقت دوشکلوں میں پایا جانا، جیسا کہ

کٹل ہویوک کی کھدائیوں کے دوران دوجڑواں دیویاں ملی تھیں، تاریخ کے کئی ادوار میں موجود رہا ہے جس طرح کہ کلاسیکل یونانی تہذیب میں ''ڈیمیٹر''(Demeter)اور''کور''(Kore)کے مجسمے دیوی کے دورُخ ہیں اور''ماں'' اور''دوشیزہ'' کے روپ میں فطرت کی ''دائروی باز آفرینی''(Cyclical regeneration) کی علامات ہیں۔ (۱۸) درحقیقت دیوی کے بچے، پیدائش، موت اور روزِ قیامت کے تصورات کے ساتھ جزولاینفک کے طور پر جڑے ہوئے ہیں۔ اس کی بیٹی کلاسیکی ادوار میں بطور''پرسیفون''(Persephone)یا''کور'' کے نام سے موجود رہی۔ اور اسی طرح اس کا بیٹا ، عاشق/شوہر تاریخی ادوار میں بطور''ایڈونس''(Adonis)،''تموز''(Tammutz)،''اٹیس''(Attis)اور آخر میں یسوع مسیح زندہ رہا۔ (۱۹)

مذہبی علامتیت کا یہ بظاہر غیر معمولی تسلسل اس صورت میں زیادہ قابل فہم ہوجاتا ہے جب ہم اس بات پرغور کریں کہ قدیم یورپ کے جدید حجری اور پتھروکانسی کے اوزاروں کے دور اور بعدازاں ''منوآن مائیسینی کانسی''(Minoan-Mycenaean Bronze)کے عہد کی تہذیب میں عظیم دیوی کا مذہب زندگی کی واحد اہم ترین اور نمایاں ترین خصوصیت ہوتا تھا۔ کٹل ہویوک کی اناطولی سائیٹ میں دیوی کی پرستش زندگی کے تمام شعبوں پرحاوی ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر ۱۹۶۱ اور۱۹۶۳ کے درمیان ۱۳۹ کمروں کی کھدائی سے پتہ چلا کہ ان میں سے ۴۰ کمرے خانقاہ کے طور پر استعمال ہوتے تھے۔ (۲۰)

جدید حجری اور پتھر اور کانسی کے ہتھیاروں کے یورپ میں بھی یہی نقشہ رہا۔ دیوی کے مختلف روپوں کے لئے مخصوص خانقاہوں کے علاوہ لوگوں کے مکانات میں بھی تنور، قربان گاہیں اور عبادت کے لئے مقدس کونے مخصوص کردیئے گئے تھے۔ اور بعد میں کریٹ کی تہذیب میں بھی یہی کچھ کیاجاتا تھا۔ جہاں کے بارے میں گمبوٹس لکھتی ہے''خانقاہیں ایک قسم کی یادوسری قسم کی ہیں، تعداد میں بھی زیادہ ہیں، یہ ماننے کی معقول وجہ ہے کہ نہ صرف محل بلکہ ہرنجی مکان کسی ایسے ہی استعمال کے لئے مخصوص تھا...... خانقاہوں، متبرک سینگوں اور دوپھل والے کلہاڑے کی علامتوں کی تعداد کے حوالہ سے جائزہ لیاجائے تو "Knossos" کا محل ایک مقامِ تقدس کی مانند لگتا ہوگا آپ جس طرف بھی مڑیں ستون اور علامات آپ کوعظیم دیوی کی یاد دلائیں گے۔'' (۲۱)

یہ کہنا کہ دیوی کی پرستش کرنے والے گہرے طور پر مذہبی لوگ تھے، حقیقت کو گھٹا کر

MashalBooks.org

بیان کرنے اور بڑی حد تک ایک نقطے کو نظرانداز کرنے والی بات ہے کیونکہ یہاں سیکولر (دنیاوی حقائق) اور الوہی جذبات میں کوئی جدائی نہیں تھی جیسا کہ ماہرینِ تاریخ مذہب کہتے ہیں کہ زمانہ قبل از تاریخ میں بڑی حد تک اور تاریخی ادوار میں بہت زیادہ، مذہب زندگی تھا اور زندگی مذہب تھی۔

ایک سبب جس کی بنا پر یہ نقطہ نظرانداز کیا جاتا ہے، یہ ہے کہ ماضی کے سکالرز دیوی کی پرستش کا عام انداز سے حوالہ دیا کرتے تھے بطور مذہب ذکر نہیں کرتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ محض ایک ''رسمِ تخم ریزی'' (fertility cult) تھی۔ لیکن اگرچہ عورت اور زمین کی زرخیزی بقائے نوع کے لئے ایک ناگزیر شے تھی اور اب بھی ہے، اس لئے یہ کردار نگاری حد سے زیادہ سادہ لوحی کا اظہار کر رہی تھی۔ مثال کے طور پر یہ ایسا ہی تھا جیسے عیسائیت کی کردار نگاری صرف رسمِ مرگ کے طور پر کی جائے کیونکہ اس کے آرٹ کی مرکزی شبیہہ تصلیب ہے۔

جدید حجری مذہب، آج کے مذہبی اور دنیاوی نظریات ہی کی طرح، اپنے زمانے کے نظریۂ عالم کا اظہار تھا۔ ان کا نظریۂ عالم ہمارے نظریۂ عالم سے کتنا مختلف تھا اس کا تمثیلی انداز سے اظہار اس وقت ہوسکتا ہے جب جدید حجری مذہبی مشاہیر کا موازنہ عیسائی مشاہیر سے کریں اول الذکر دور میں برگزیدہ خاندان کی سربراہ ایک عورت ہوا کرتی تھی مثلاً ''عظیم ماں''، ''جنت کی ملکہ'' یا مختلف پہلوؤں اور شکلوں میں ''دیوی''۔ اس خاندان کے مرد ارکان میں اس کا ہمدم و ہمباز اور بھائی اور بیٹا بھی الوہی حیثیتوں کے مالک ہوتے تھے لیکن اس کے برعکس مسیحی برگزیدہ خاندان کا سربراہ ایک طاقتور باپ ہے۔ خاندان میں دوسرا مرد، یسوع مسیح، القدس کا ایک اور رُخ ہے۔ لیکن اگرچہ باپ اور بیٹا غیرفانی اور مقدّس ہیں مریم اس مذہبی تصوّر پدرسری خاندانی تنظیم میں محض فانی ہے جو اپنے ارضی مماثلوں کی مانند واضح طور پر ادنیٰ حیثیت کی حامل ہے۔

ایسے مذاہب جن میں طاقتور ترین یا واحد الوہی ہستی مرد ہے وہ ایسے سماجی نظام کی عکاسی کرتے ہیں جس میں سلسلۂ نسب پدری ہوتا ہے اور مقامِ رہائش وہ ہوتا ہے جہاں شوہر قیام پذیر ہوتا ہے یعنی بیوی اپنے شوہر کے گھر یا خاندان میں جا کر رہائش اختیار کرتی ہے۔ اس کے برعکس ایسے مذاہب جن میں طاقتور ترین، یا واحد الوہی ہستی عورت ہوتی ہے

وہاں سلسلۂ نسب مادری ہوتا ہے، اولاد ماں کی طرف منسوب ہوتی ہے اور شوہر بیوی کے گھر یا خاندان جا کر آباد ہو جاتا ہے۔(۲۲) علاوہ ازیں مرد کے غلبے اور اسی عمومی ترتیبِ مدارج پر استوار معاشرتی ڈھانچہ تاریخی طور ایسے علمبرداران مذہب نے ہی قائم کیا اور برقرار رکھا جو ایسے مذہبی اصولوں پر یقین رکھتے تھے جن میں کہا گیا تھا کہ عورتوں کی محکومی خدائی حکم ہے۔

اگر یہ پدرسری نہیں تو لازماً مادرسری ہے

ان اصولوں کو اس امر کی بے شمار شہادتوں پر لاگو کرتے ہوئے کہ ہزاروں برسوں کی انسانی تاریخ میں الوہیت کے بلند ترین منصب پر عورت فائز رہی ہے، انیسویں صدی اور اوائل بیسویں صدی کے متعدد سکالرز ایک تہلکہ خیز نتیجے پر پہنچتے ہوئے نظر آتے ہیں وہ یہ تھا کہ اگر زمانہ قبل ازتاریخ پدرسری (Patriarchal) نہیں تھا تو وہ لازماً مادرسری (Matriarchal) دور رہا ہوگا۔ بہ الفاظ دیگر اگر مردوں نے عورتوں کو مغلوب نہیں کیا تھا تو لازماً عورتوں نے مردوں کو مغلوب کیا ہوا ہوگا۔

پھر جب شہادت عورت کے غلبے کی تائید کرتی ہوئی نہ دکھائی دی تو بہت سے سکالرز اس سے زیادہ مسلمہ نظریئے کی طرف پلٹ گئے انہوں نے کہا کہ اگر مادرسرانہ نظام نہیں رہا تھا تو آخر کار مرد کا غلبہ ہی انسانی طرز زندگی رہا ہوگا تاہم شہادت نے ان میں سے کسی ایک نتیجے کی بھی تائید نہ کی۔ اوّلاً جو آثاریاتی معلومات اب ہمارے پاس ہیں وہ بتاتی ہیں کہ پدرسری معاشرے سے قبل کے زمانے کا عمومی ڈھانچہ نمایاں طور پر مساویانہ تھا۔ ثانیاً اگرچہ ان معاشروں میں سلسلۂ نسب والدہ کی طرف سے چلتا ہوا معلوم ہوتا ہے عورتیں بحیثیتِ پادری اور سربراہانِ قبیلہ زندگی کے تمام پہلوؤں میں قائدانہ کردار ادا کرتی رہی ہوں گی۔ اس امر کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ اس سماجی نظام میں مرد کی حیثیت کسی مفہوم میں بھی اس طرح ثانوی اور ذیلی تھی جیسی مرد کے غلبے کے نظام میں عورتوں کی رہی ہے۔

میلارٹ نے اپنی کٹل ہویوک کی کھدائیوں سے جو اس نے دراصل وہاں کے باشندوں کے نظامِ زندگی کی ساخت معلوم کرنے کے لئے کی تھیں، اس نے تحقیق کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا کہ تعمیرات کے سائز، آلات اور تدفین کے تحائف سے اگرچہ سماجی عدم مساوات کی کچھ نشانیاں دکھائی دیتی ہیں تاہم ''یہ ہرگز شاندار نہیں تھیں'' (۲۳) مثال کے طور

پر یہاں مکانات میں کوئی بڑا فرق نہیں تھا۔ ان میں سے زیادہ تر مقررہ مستطیلی تعمیرات تھیں جو پچیس مربع میٹر فرش پر بنی ہوئی تھیں حتیٰ کہ خانقاہیں بھی ساخت کے لحاظ سے مکانوں سے مختلف نہیں تھیں اور نہ ہی لازمی طور پر بڑے سائز کی تھیں۔ تاہم وہ کافی تعداد کے مکانوں کے ساتھ گڈمڈ بنی ہوئی تھیں۔ یہ پھر اس امر کا اظہار تھا کہ وہ ''قریہ دارانہ ساخت'' (Communally Based) کی تھیں نہ کہ مرکزگیر مراتب دار سماجی اور مذہبی ساخت کی مظہر تھیں۔ (۲۴)

کٹل ہویوک کی تدفین کی رسوم کے تجزیئے سے بھی عمومی تصویر ابھرتی ہے۔ دورِ متأخر کے ہندوستان اور یورپ کے سرداروں کی قبروں کے برعکس جو کہ واضح طور پر مخروطی معاشرتی ساخت کی نشاندہی کرتی ہیں جن کے سردار دہشتناک شخصیت کے حامل ہوتے تھے، کٹل ہویوک کے سردار کسی نمایاں سماجی عدم مساوات کے مظہر نہیں تھے۔ (۲۵)

جہاں تک مردوں اور عورتوں کے باہمی تعلق کا مسئلہ تھا، میلارٹ کہتا ہے کہ کٹل ہویوک کے مقدس خاندان کو ''ماں کے بعد بیٹی، بیٹا اور باپ کی ترتیب سے درجہ بدرجہ فوقیت حاصل تھی (۲۶) اور یہ کہ یہ شہر کے باشندوں میں اس انسانی خاندان کو منعکس کر رہے تھے جو کہ واضح طور پر شجرۂ مادری اور ماں کی جائے رہائش پر خاندان کے مرتکز رہنے کے نظام کی عکاسی کر رہے تھے۔ یہ بھی درست ہے کہ دیوی کے بشر پیکری روپ بطور نوجوان دوشیزہ، پختہ عمر عورت، نانی، پرنانی وغیرہ غرضیکہ جنم دے سکنے والی جملہ صورتیں...... جیسا کہ بعدازاں یونانی فلسفی فیثا غورث نے کہا عورت کی زندگی کے مختلف مدارج کا اظہار تھیں۔ (۲۷) شجرۂ مادری اور ماں کی جائے قیام پر مبنی سماجی تنظیم ہونے کی طرف ایک اشارہ اس سے بھی ملتا ہے کہ کٹل ہویوک کی عمارتوں میں سونے کے پلیٹ فارم، عورت کے استعمال کپڑے اور اس کا بستر یا دیوان وغیرہ ہمیشہ ایک ہی جگہ پر ''جائے رہائش'' کی مشرقی جانب پائے گئے ہیں۔ مرد کے قیام کی جگہیں بھی وہی تھیں البتہ وہ کسی قدر چھوٹی تھیں۔ (۲۸)

لیکن باوجود اس شہادت کے کہ عورت کو مذہب اور زندگی کے دیگر شعبوں میں امتیازی مرتبہ ومقام حاصل تھا، مردوں اور عورتوں کے درمیان کسی امتیازی عدم مساوات کے کوئی اشارے نہیں ملے اور نہ ہی اس امر کے کوئی شواہد ملے ہیں کہ عورتیں مردوں کو دبا کر رکھتی تھیں۔

ہمارے دور کے مرد کی بالادستی کے حامل مذاہب جن میں زمانۂ حال تک مذہبی ہیئت حاکمہ کی رکنیت صرف مردوں کو مل سکتی ہے، اس کے بالکل برعکس وہاں اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ وہاں عورتوں کے ساتھ ساتھ مرد بھی پادری بن سکتے تھے مثلاً میلارٹ بتاتا ہے کہ یہ امکان معلوم ہوتا ہے کٹل ہویوک میں بنیادی طور پر پادری عورت ہی دیوی کی پرستش کی رسوم بجالاتی تھی لیکن اس امر کے شواہد بھی ملتے ہیں کہ پادری مرد بھی شریکِ عبادت ہوتے تھے۔ اس کا کہنا ہے کہ خانقاہوں کے قبرستانوں میں سے دو قسم کی اشیا ملی ہیں ایک تو آتش فشانی مادے سے بنے ہوئے آئینے اور دوسرے خاص قسم کے کمر بند تھے۔ اول الذکر صرف عورتوں کی لاشوں کے پاس تھے اور مؤخرالذکر صرف مردوں کی لاشوں کے ساتھ پڑے تھے۔ اس سے میلارٹ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ مخصوص حیثیت کی مالک پادری عورتوں اور پادری مردوں کی نشانیاں تھیں۔ خانقاہوں کی کھدائیوں میں ان کے شاذ و نادر پائے جانے کی یہی ایک وضاحت ہوسکتی ہے۔ (۲۹)

یہ انکشاف بھی ہوا کہ بوڑھے مردوں کے مجسمے خاص طور پر سوچنے کی حالت میں بنائے جاتے تھے۔ ان کی وضع دیکھ کر فرانس کے نقاش ''روڈن'' کا بنایا ہوا "The Thinker" یاد آجاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس زمانے میں بوڑھے مردوں اور عورتوں کے کردار کی بہت اہمیت اور عزت ہوتی تھی۔ (۳۰) اسی قسم کا ایک انکشاف یہ ہے کہ بیل اور بچھڑے کو یا قربانی کے طور پر ذبح کئے ہوئے کسی بھی جانور کے سینگوں کو جدید حجری دور کے اناطولیہ، ایشیائے کوچک اور قدیم یورپ کی خانقاہوں میں مرکزی مقام حاصل تھا۔ بعدازاں ''منوآن'' اور ''مائسی نین'' کی شبیہات میں یہ ''نر'' کی علامت بن گئے جیسا کہ مردانہ عضو یا سؤر کو ''نر'' کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ کچھ عرصہ بعد جدید حجری دور میں بالخصوص یورپ میں ان کو ''نر'' کی علامت بنالیا گیا۔ مزید برآں سابق عہد کے دیوی کی مورتیوں میں سے بعض نہ صرف انسان اور جانور کی خصوصیات کا مرکب (hybrid) ہیں بلکہ ان کے بعض مبالغہ شدہ اعضا مثلاً لمبی گردنوں کی اس طرح تعبیر کی جاسکتی ہے کہ وہ نر و مادہ، دونوں کی خصوصیات کو نمایاں کرتی ہیں۔ (۳۱) اور بطور ایک امر واقعہ نوجوان دیوتا جو دیوی کا بیٹا ہونے کے علاوہ اس کا خصم بھی ہے پدرسری نظام سے قبل کے مذہب میں مرکزی معجزۂ باز آفرینی کے اسرار میں بار بار واقع ہونے والا کردار ادا کرتا ہے۔

پھر یہ ایک واضح بات ہے کہ جدید حجری آرٹ اور نظریہ کے معجزۂ زندگی میں جب اصولِ مؤنث بطور ایک علامت سرایت کر چکا تھا تو اصولِ مذکر نے بھی اہم کردار ادا کیا۔ ان دواصولوں کا ''مقدس شادی'' کی رسوم وخرافات کے ذریعے، ادغام درحقیقت قدیم دنیا اور پدرسری دور میں بھی جاری رہا۔ مثال کے طور پر ''حتی اناطولیہ'' میں ''یاز یلکایا'' (Yazilikaya) کی خانقاہ اس مقصد کے لئے وقف تھی اور حتیٰ کہ یہ رسم بعد میں یونان اور روم میں بھی بطور ''ہائروس گیموس'' (hieros gamos) منائی جاتی رہی۔ (۳۲)

اس سلسلے میں جدید حجری دور کی ایک شبیہہ ہے جس میں افزائشِ نسل میں عورتوں اور مردوں کے مشترکہ کرداروں کے سمجھوتے کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ مثلاً کٹل ہویوک سے ملنے والی پتھر کی ایک چھوٹی سی تختی ہے جو ایک عورت اور ایک مرد کو بحالتِ ہم آغوشی دکھارہی ہے اور ان کے قریب ہی ایک ماں کو بچہ اٹھائے دکھایا گیا ہے جوان کے ملاپ کا پھل ہے۔ (۳۳) یہ ساری مجسمہ سازی جدید حجری دور میں عورتوں اور مردوں کے تعلق کے بارے میں مروّج اور نمایاں طور پر مختلف رویّوں کی عکاسی کرتی ہے۔ یہ وہ رویئے ہیں جن میں درجہ بندی (ranking) کی بہ نسبت ربط (linking) کو زیادہ اہمیت حاصل تھی۔ جیسا کہ گمبوٹس لکھتی ہے ''دیوتاؤں کی دنیا مؤنث اور مذکر میں اتنی سختی سے منقسم نہیں تھی۔ جتنی کہ ہندوستان ویورپی ممالک اور بہت سے خانہ بدوشوں اور سرسبز میدانی علاقوں کے چرواہوں میں سختی سے بٹی ہوئی تھی۔ دونوں متذکرہ بالا اصولوں کا پہلو بہ پہلو اظہار ہورہا تھا۔ مردانہ الوہیت کا ایک نوجوان مرد یا نر جانور کی صورت میں اظہار مؤنث جنس کی تخلیقی قوتوں کی توثیق کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ ان میں سے کوئی بھی دوسرے کو مطیع بنانے کی کوشش نہیں کرتا، دونوں ایک دوسرے کی تکمیل کرتے ہوئے اپنی قوت کو دوگنا کرلیتے ہیں۔ (۳۴)

ہم بار بار اس بحث کا سامنا کرتے ہیں کہ کیا کبھی ''مادر سرانہ نظام'' (matriarchate) ہوا کرتا تھا یا نہیں ہوا کرتا تھا۔ یہ بحث علمی اور عام حلقوں میں اب بھی گاہے بگاہے چھڑتی رہتی ہے کہ کسی آثاریاتی شہادت سے زیادہ مروّجہ نظریاتی کتابوں کے مواد کا اثر دکھائی دیتی ہے۔ (۳۵) یہ ہماری اس ثقافت کا مزاج بن چکا ہے جو ہئیت حاکمہ کے مخصوص مزاج اور درجہ بندی پر تعمیر ہوئی ہے اور جس میں اندر کا گروپ بمقابلہ باہر کا گروپ، غیر لچکدار اختلافات یا اجتماعِ ضدین پر زور دیا جاتا ہے۔ ہماری سوچ کی خصوصیت یہ ہے کہ ''اگر یہ ایسا نہیں ہے تو

پھر یہ ویسا ہوگا ۔ یہ دوفرعی (dichotomized) سوچ ہے جس کے بارے میں قدیم ترین زمانے سے فلسفیوں نے خبردار کیا تھا کہ یہ سہل پسندانہ سوچ حقائق سے روگردانی کی راہ دکھاسکتی ہے اور آج کے ماہرین نفسیات کا خیال ہے کہ یہ ادراک کی سطح گراتی اور جذباتیت بڑھاتی ہے۔ (۳۶)

میلارٹ نے بظاہر اس ''یوں نہیں تو یوں ہوگا'' یا ''اگر پدرسری نہیں تو مادرسری'' ہوگا کے مخمصے پر اس وقت قابو پانے کی کوشش کی جب اس نے یہ سطور لکھیں ''اگر دیوی نے کٹل ہویوک کی جدید حجری دور کی آبادی کی زندگی اور موت کی جملہ سرگرمیوں کی صدارت کی تھی تو اس کے بیٹے نے بھی تو کسی طریقے سے کی ہوگی۔ خواہ اس کا کردار ماں کے کردار کا بالکل ہی ذیلی تھا۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ زندگی کے مظاہر میں مَردوں کے بھرپور کردار کا احساس کرلیا گیا تھا'' (۳۷) لیکن ''بھرپور کردار'' اور ''بالکل ہی ذیلی کردار'' کے مابین تضاد پا کر ہم خودکو ایک بار پھر اُن ثقافتی اور لسانی مفروضوں میں پھنسے ہوئے پاتے ہیں جو ''حاکم کون؟'' کی نفسیات میں مضمر ہیں۔ یعنی انسانی تعلقات کو لازماً کسی اعلیٰ ادنیٰ کے سلسلے میں فٹ ہو جانا چاہیے۔

تاہم اگر صحیح معنوں میں تجزیاتی یا منطقی زاویۂ نگاہ سے دیکھا جائے تو دیوی کی برتری اس نتیجے کا جواز پیش نہیں کرتی کہ یہاں عورتیں مردوں پر غالب آجائیں (اگرچہ عورت کو اپنے اندر موجود نشوونما اور باز آفرینی کی قوتوں کی وجہ سے خصوصی اہمیت حاصل ہے)۔ اس بات کو مزید واضح کرنے کے لئے اگر مماثلتوں کو پیش نظر رکھا جائے تو یوں سوچا جانا چاہیے کہ ایک رشتے کو عمومی شکل دے کر تو مرد کے غلبے پر مبنی معاشروں میں بھی برتری یا کمتری کی اصطلاحوں میں تصور قائم نہیں کیا جاتا۔ یہ ماں بچے کا رشتہ ہے اگر ہم اس طریقے سے سوچنا شروع کردیں تو ہوسکتا ہے کہ وہ پدرسری نظام سے قبل کا کوئی تصورِ دنیا ہو۔ بڑے سائز کی مضبوط جسم والی ماں اس مذہبی نظامِ مراتب کی اصطلاح میں واضح طور پر ایک چھوٹے سے کمزور بچے پر فوقیت رکھتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہم عمومی طور پر بچے کو کم حیثیت اور کم قیمت کا حامل سمجھتے ہیں۔

اس مختلف تصوراتی ڈھانچے کو سامنے رکھتے ہوئے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ اس حقیقت کے پیش نظر کہ عورتوں نے زمانہ قبل از تاریخ کے مذہب اور زندگی میں مرکزی اور زوردار کردار

ادا کیا اس کا یہ مطلب نہیں کہ مردوں سے اطاعت گزار اور خادم کے طور پر کام لیا جاتا تھا۔ کیونکہ مرد اور عورتیں، دونوں دیوی کی اولاد تھے اور ان عورتوں کی اولاد تھے جو خاندانوں اور قبیلوں کی سردار تھیں۔ اور چونکہ اس سے عورتوں کو کافی حد تک قوت حاصل ہو چکی تھی، ہمارے دور کے ماں بچے کے تعلق کو بطور مثال سامنے رکھتے ہوئے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک ایسی قوت تھی جسے ذمہ داری اور محبت کے مترادف قرار دیا جانا چاہیے نہ کہ جبر، مخصوص مراعات اور خوف کی مظہر سمجھا جائے۔

مختصراً یہ کہ طاقت کے تاحال مروّجہ منظر، جس کی علامت ''بلیڈ'' یعنی خنجر ہے اور یہ چھین جھپٹ یا غلبہ حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اس کے برعکس جدید حجری دور کی دیوی پوجا کرنے والے معاشروں میں بالکل دوسرا منظر تھا۔ طاقت کا یہ منظر جو ایک پرورش کرنے اور عطا کرنے والی ''نسوانی'' قوت کا مظہر تھا ہوسکتا ہے کہ ان معاشروں میں ہمیشہ یہ صورتِ حال برقرار نہ رہ سکی ہو، کیونکہ یہ معاشرے گوشت پوست کی انسانوں کے تھے کوئی ظاہرداری پر مبنی خیالی جنت'' (یوٹوپیا) نہیں سجائی گئی تھی لیکن پھر بھی یہ ایک معیاری نمونہ تھا جس کی سب مردوں اور عورتوں کو تقلید کرنی چاہیے۔

طاقت کا وہ نظریہ جس کی علامت جام یا ساغر ہوتا ہے، اس کے لئے میں ''قوتِ عملِ تشکیل''(power of actualization) کی اصطلاح تجویز کرتی ہوں جسے قوتِ تسلّط (domination power) کے متقابل سمجھا جانا چاہئے، صاف ظاہر ہے کہ یہ اس تنظیم سے، جس کے ہم عادی ہو چکے ہیں، ایک بالکل مختلف تنظیم کی عکاسی کرتی ہے۔ (۳۸) ہم اس شہادت سے، جس کا ہم اب تک جائزہ لے چکے ہیں، یہ نتیجہ اخذ کر سکتے ہیں کہ اسے ہرگز مادرسری نہیں کہا جاسکتا جیسا کہ اسے پدرسری بھی نہیں کہا جاسکتا۔ یہ سماجی تنظیم کے ایک روایتی غالب نظریئے کے مثالی نمونے پر بھی فٹ نہیں آتا۔ تاہم ''نظریۂ ثقافتی تقلیب'' (Cultural Tranformation) کا جو منظر ہم سامنے لاتے رہے ہیں وہ انسانی تنظیم کے دوسرے متبادل میں یقیناً فٹ آتا ہے: وہ ہے ''پارٹنر شپ سوسائٹی'' جس میں نہ تو انسانیت کے نصف حصے کو دوسرے پر سبقت حاصل ہوتی ہے اور نہ تنوّع (diversity) کو کمتری یا برتری کے مترادف قرار دیا جاتا ہے۔

جیسا کہ ہم اگلے ابواب میں دیکھیں گے، ان دو متبادلوں نے ہمارے ثقافتی ارتقاء کو بے

حد متاثر کیا ہے۔ فنیاتی اور سماجی ارتقا میں یہ رجحان پایا جاتا ہے کہ وہ پیچیدگی اختیار کرتا چلا جاتا ہے۔ قطع نظر اس کے کہ کونسا ماڈل مروّج ہے۔ لیکن ثقافتی ارتقا کی ''سمّت'' ...... بشمول اس امر کے کہ کیا ایک سماجی ڈھانچہ جنگجویانہ ہے یا اس پسندانہ....... کا انحصار اس پر ہے کہ کیا ہمارے پاس پارٹنرشپ کا ڈھانچہ ہے یا تسلط پذیر سماجی ڈھانچہ ہے۔

MashalBooks.org

باب3

اساسی فرق: جزیرہ کریٹ

زمانہ قبل از تاریخ(prehistory)ایک عظیم الجثہ معمے کی طرح ہے جو تصویر کے کٹے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑنے سے تیار ہوتا ہے۔ مگر اس تصویر کے نصف سے زائد ٹکڑے تباہ یا گم ہو چکے ہیں۔ اس لئے اسے مکمل طور پر متشکل کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن اس زمانے کی تاریخ کی تشکیلِ نو میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ نہیں کہ ہمارے پاس بہت سے ٹکڑوں کی کمی ہے: بلکہ یہ ہے کہ ضابطۂ کار کا موجودہ نمونہ ہمارے ہاں دستیاب ٹکڑوں کی صحیح طور پر تعبیر کرنا مشکل بنا رہا ہے اور ایسا حقیقی نقشہ موجود نہیں جس میں یہ فٹ ہوتے ہیں۔

مثال کے طور پر جب ''سر فلنڈرز پیٹری'' نے مصر میں ''میریٹ نیٹ''(Meryet-Nit) کے مقبرے کی کھدائیوں کے بارے میں رپورٹ دی تو اس نے ازخود فرض کر لیا کہ صاحبِ مقبرہ ایک بادشاہ ہوتا تھا۔ تاہم بعد کی تحقیق سے ثابت ہوا کہ ''میریٹ نیٹ'' ایک عورت تھی۔ اور اس کے مقبرے کی تزئین اور اس کی تعمیر میں لگے قیمتی سامان سے یہ اندازہ لگایا گیا وہ ایک ملکہ تھی۔ پروفیسر ڈی مارگن نے ''نگادیہہ'' میں عظیم الشان مقبرہ دریافت کیا تو اس معاملے میں بھی وہی غلطی کی۔ یہاں بھی فرض کر لیا گیا کہ یہ ایک بادشاہ ''ہور۔آہا'' آف دی فرسٹ ڈائنیسٹی کا مقام تدفین ہے لیکن جیسا کہ ماہر مصریات والٹر ایمری لکھتا ہے کہ بعد کی تحقیق سے ظاہر ہوا یہ ''ہور آشا'' کی والدہ ''نیٹ ہوٹیپ'' کی قبر تھی جو چٹان کھود کر اس کے اندر بنائی گئی تھی۔[1]

یہ تعصب کی چند مثالیں ہیں جن کی وجہ سے غلطیاں سرزد ہوئیں مگر یہ محض مستثنیات

ہیں، مؤرخ فنون میرلین سٹون کہتی ہے کہ ان غلطیوں کی بعدازاں تصحیح کردی گئی تھی۔ اس نے تحقیق کے لئے دنیا بھر کے سفر کئے۔ سینکڑوں کھدائیوں، محافظ خانوں، دستاویزات اور قدیم اشیا کا ازسرنو جائزہ لیا اور ان کے ابتدائی منابع کی جانچ پڑتال کر کے معلوم کیا کہ ان کی کیسے تعبیر کی جاتی رہی ہے۔ اور جو کچھ اس نے دریافت کیا وہ یہ تھا کہ قدیم منابع اور آثار میں سے جب کبھی اس امر کی شہادتیں سامنے آئیں کہ ایک ایسا زمانہ ہوا کرتا جب مرد اور عورتیں برابر حیثیتوں میں رہ رہے تھے انہیں انتہائی سادگی سے نظرانداز کر دیا گیا۔ (۲)

اگلے صفحات میں جیسے کہ ہم بیسویں صدی کے موڑ پر بحیرۂ روم کے جزیرہ کریٹ میں دریافت ہونے والی غیر معمولی قدیم تہذیب کا جائزہ لیں گے ہم دیکھیں گے کہ یہ تعصب کیسے ہمارے ثقافتی ارتقا ایک نامکمل اور درحقیقت مسخ شدہ منظر پیش کرنے کا باعث بنا بلکہ ایک اعلیٰ تہذیب کے ارتقا کی بھی صحیح منظرکشی میں رکاوٹ بن گیا۔

آثاریاتی بم دھماکہ

فنیاتی طور پر ترقی یافتہ اور سماجی طور پر مربوط قدیم ثقافت کے حامل ''منوآن'' کریٹ کی دریافت ایک قسم کا بم دھماکہ تھا۔ اسے یہ نام اساطیری شخصیت کنگ مینوس کی نسبت سے دیا گیا تھا۔ نامور ماہر آثار قدیمہ نکولس پلاٹن نے، جو ۱۹۸۰ء میں پچاس سال سے زائد عرصہ سے اس جزیرے کی کھدائیاں کر رہا تھا، لکھا کہ ''ماہرین آثاریات دم بخود رہ گئے، وہ سمجھ نہیں پا رہے تھے کہ ایسی ترقی یافتہ تہذیب کی موجودگی کا اب تک گمان کیوں نہیں ہوسکا تھا۔'' (۳)

نکولس پلاٹن کریٹ میں کئی سال تک آثاریات کا سپرنٹنڈنٹ رہا۔ وہ کہتا ہے کہ ''یہاں کام شروع ہوتے ہی حیرت انگیز دریافتیں ہونے لگیں، جوں جوں کام آگے بڑھتا گیا، وسیع وعریض کثیر المنزلہ محلات، کوٹھیاں، مویشیوں کی باڑے، گنجان آباد شہراور اضلاع، بندرگاہوں کی تنصیبات، جزیرے کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پھیلے ہوئے سڑکوں کے جال، منظم عبادت گاہیں اور محصور قبرستان برآمد ہوتے چلے گئے (۴) ماہرین آثار نے جیسے جیسے کھدائیاں جاری رکھیں چار مسوّدے Linear A, Proto-Linear, Hieroglyphic اور Linear B) دریافت ہوگئے جن سے کریٹ کی تہذیب آثاریاتی تعریفوں

کے عین مطابق تاریخی یا علمی دور میں آ گئی۔ ان آثار سے قدیم منوآن اور دور متاخر کے مائیسینین مراحل کے سماجی ڈھانچوں اور اقدار کے بارے میں بھی بہت کچھ معلوم ہو گیا۔ اور کھدائی کا سلسلہ آگے بڑھنے سے مزید حیران کن آبی رنگوں کی نقاشی، مجسمے، مرتبان، کندہ کاری اور آرٹ کے دیگر نمونے سامنے آ گئے جس سے احساس ہوا کہ یہ تہذیب کی تاریخ کے نادر اور منفرد فنی شہپارے ہیں۔

کریٹ کی تہذیب کی کہانی تقریباً ۶۰۰۰ برس قبل مسیح سے اس وقت شروع ہوتی ہے جب تارکین وطن کا ایک چھوٹا سا گروہ جو غالباً اناطولیہ سے آیا تھا پہلے جزیرے کے ساحلوں پر آ کر آباد ہوا یہی۔ لوگ تھے جو اپنے ہمراہ ''دیوی'' لائے اور زرعی ٹیکنالوجی بھی لائے۔ ان ابتدائی آبادکاروں کو جدید حجری دور کے باشندے قرار دیا گیا۔ اگلے چار ہزار برسوں میں ان کے ہاں ایک متوازن فنیاتی ترقی ہوئی جس کے اثرات ظروف سازی، پارچہ بافی، دھات کاری، کندہ کاری، تعمیرات اور دیگر فنون میں ظاہر ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کی تجارت بھی بڑھی۔ ان کے ذوقِ لطیف اور اظہارِ مسرت کے آداب میں بھی تبدیلیاں آ گئیں اور کریٹ کا مخصوص مزاج مزید نمایاں ہو گیا۔ پھر تقریباً ۲۰۰۰ قبل مسیح میں کریٹ اس دور میں داخل ہو گیا جسے ماہرین آثار قدیمہ ''وسطی منوآن'' یا ''اولڈ پیلس پریڈ'' کہتے ہیں۔ (۵)

اب کانسی کا زمانہ شروع ہو چکا تھا، یہ وہ دور تھا جب اس وقت کی مہذب دنیا کے باقی ماندہ حصے میں ''دیوی'' کی جگہ ''بتدریج جنگجو مرد دیوتا'' لے رہے تھے۔ دیوی کا احترام اس وقت بھی ہوا کرتا تھا، مصر میں وہ "Hather" اور "Isis" تھی، بابل میں "Astarte" اور اناطولیہ میں "The sun Goddes of Arinna" کہلاتی تھی۔ مگر یہ اب صرف ایک ثانوی دیوی تھی جس کا ذکر زیادہ طاقتور مرد دیوتاؤں کی معشوقہ یا ماں کے طور پر آتا تھا۔ کیونکہ اس ایک نئی دنیا میں، جو پیدا ہو رہی تھی عورتوں کے اقتدار کو زوال آ رہا تھا، یہ مردوں کے تسلّط کی دنیا تھی جہاں ہر جگہ فتوحات اور جوابی فتوحات کے لئے جنگوں کا سلسلہ جاری تھا۔

جزیرہ کریٹ میں جہاں دیوی بدستور بالاتر ہستی تھی جنگ کا نام ونشان تک نہیں تھا۔ یہاں معیشت رُوبہ ترقی تھی اور آرٹس پورے عروج پر تھے۔ اور حتیٰ کہ جب ۱۵ ویں صدی قبل از مسیح میں جزیرہ بالآخر یونانی ''اکین'' (Achaean) کے زیرِ غلبہ آ گیا تب بھی دیوی اور

اس کے خیالات اور علاماتِ بودوباش اپنی جگہ پر قائم ودائم رہیں جبکہ ماہرینِ آثاریات اس وقت ''منوآن'' کی بات کے بجائے ''منوآن مائسنین'' ثقافت کی بات کرتے تھے۔

''منوان'' کے پرانے اثرات کے تحت (جو یونان کے اندر بھی دکھائی دے رہے تھے جو اب اسی طرح مائیسنین کے عہد میں داخل ہوگئے تھے) جزیرے کے مقتدر انڈویورپین لوگوں نے ''منوآن'' کلچر اور مذہب بڑی حد تک قبول کرلیا۔ مثال کے طور پر پندرھویں صدی قبل مسیح کے مشہور "Hagia Triada Sarcophus" پر بنی ہوئی تصاویر واضح طور پر جزیرہ کریٹ کی ہیں۔ اس میں وہی دیوی دکھائی گئی ہے جو سیمرغ جُتے رتھ (Griffen-drawn chariot) پر سوار ہے اور مردہ شخص کو اس کی نئی زندگی دینے کے لئے لے جارہی ہے۔ اور یہ اب بھی ''دیوی'' کی خواتین پادری ہیں (نہ کہ مرد پادری جو عورتوں جیسی لمبی پوشاکیں پہنے ہوئے ہوتے ہیں) جو پلستر شدہ سنگِ کلس کے فریسکوز پر دکھائی گئی رسوم میں مرکزی کردار ادا کررہی ہیں۔ یہی جلوسوں کی قیادت کرتی ہیں اور یہی ہیں جو قربان گاہ کو چھونے کے لئے اپنے ہاتھ آگے بڑھا رہی ہیں۔ جیسا کہ تاریخ ثقافت کی ماہر ''جیکو یٹاہا کیز'' سکالرز کی قدیم وضع کی مخصوص زبان میں کہتی ہے ''اگر یہ بات چودھویں صدی میں کافی حد تک درست پائی گئی تھی، تو اس سے کچھ عرصہ بھی اس کا امکان موجود ہونا ممکن تھا۔'' (٦) اس طرح ''ناسس'' کے عظیم الشان محل میں دکھائی دینے والی شخصیت ایک عورت ہے (جو دیوی ہے، عالی مرتبہ خاتون پادری ہے یا شاید جیسا کہ جیکو ٹاہا کیز اپنے یقین کا اظہار کرتی ہے کہ وہ کریٹ کی ملکہ ہے) جو وسط میں کھڑی ہے اور اس کے قریب پہنچنے والے دو جلوس مردوں پر مشتمل ہیں جو اس کو خراجِ تحسین پیش کررہے ہیں۔ (٧) جدھر دیکھئے عورت کے ہی مجسمے ہیں، ان میں سے بہت سوں نے اپنے بازو اظہار شفقت کے طور پر اٹھا رکھے ہیں، ان میں سے بعض مادہ سانپ اٹھائے ہوئے ہیں، بعض نے دیوی کی علامتوں کے طور پر دومنہ والی کلہاڑیاں پکڑی ہوئی ہیں۔

زندگی اور فطرت کی محبت

شفقت اور رحم وکرم کی یہ علامات بہت سے پہلوؤں سے ''منوآن'' ثقافت کا خلاصہ ہیں، کیونکہ، بقول نکولس پلاٹن، ''یہ ایک ایسا معاشرہ تھا جس کے اندر فطرت کی دیوی پر ایمان

ہر کسی کے دل میں رچا بسا ہوا تھا کیونکہ اسے جُملہ مخلوقات اور مظاہرِ یگانگت کا منبع سمجھا جاتا تھا''۔ کریٹ میں ریکارڈ شدہ تاریخ میں آخری بار مردوں اور عورتوں کے درمیان زندگی میں برابر حیثیت کے شرکا طور پر خوش دلانہ ہم آہنگی کا دور دورہ نظر آتا ہے۔ یہی جذبہ ہے جو کریٹ کی فنکارانہ روایت میں آب وتاب سے دمکتا ہے۔ اس روایت کے بیان میں ہم ایک بار پھر پلاٹن کے الفاظ سے مدد لیتے ہیں کہ ''یہ روایت حسن میں مسرت، وقار اور نقل وحرکت میں اپنی مثال آپ سے جو زندگی کی مسرتوں اور فطرت سے قربت میں بھی بھرپور طور پر دکھائی دیتی ہے'' (۸)

بعض سکالرز نے منوآن کی زندگی کو ''انسان'' کے تصورِ "homo ludens" کا مظہر کامل کہا ہے، جس میں وہ اعلیٰ انسانی ہیجانات کو پُرمسرت اور پُرمعنی رسم اور فنکارانہ کھیل کے ذریعے ظاہر کرتا ہے۔ بعض دوسروں نے کریٹ کی ثقافت کو ''حساسیّت زینتِ حیات اور محبتِ حسن وفطرت'' کی مظہر قرار دیا ہے۔ اگرچہ چند ایک (مثلاً سائرس گورڈن) وہ ہیں جو کریٹ کے مظاہرِ زندگی کی تضحیک کرتے ہیں اور اسے پہلے سے قائم شدہ تصوراتِ قدامت کے اندرفٹ کر کے اسے کم وبیش جنگجویانہ اور (ماسوائے عبرانیوں کے) ہم سے کمتر روحانیت والی دنیا کہتے ہیں اور سکالرز کی ایک بھاری اکثریت اور بلاشبہ وہ لوگ جنہوں نے جزیرے میں وسیع فیلڈ ورک کیا ہے وہ اپنی دریافتوں کو بیان کرتے ہوئے اپنی حیرت اور دادو تحسین کے جذبات پر قابو پانے سے قاصر رہے ہیں۔ (۹)

کیونکہ یہاں ہم ٹیکنالوجی کے لحاظ سے ثروتمند اور ثقافتی طور پر ایک ترقی یافتہ تہذیب پاتے ہیں جیسا کہ ماہرینِ آثاریات "Hans-Gunther Buchholtz" اور "Vassos Karageorghis" نے لکھا ہے ''تمام آرٹسٹک میڈیا (درحقیقت زندگی اپنی بھرپور کلیّت مع موت کے) اس جامع اور ہمہ گیر مذہب کو پاکر ورطۂ حیرت میں ڈوب گیا۔'' لیکن وقت کی دیگر اعلیٰ درجے کی تہذیبوں کے برعکس اس مذہب نے (جس میں مرکزیت دیوی کو حاصل ہے) اس سماجی نظام کی عکاسی کی ہے اور اسے تقویت بخشی ہے جس میں بقول نکولس پلاٹن ''زندگی کی فراواں خوشبوں نے موت کا خوف ملیامیٹ کر دیا'' (۱۰)

سر لیونارڈ وولی جیسے سنجیدہ ومتین سکالرز نے ''منوآن'' آرٹ کو ''قدیم دنیا کا انتہائی متاثر کن آرٹ قرار دیا ہے''۔ (۱۱) دنیا بھر کے ماہرینِ آثاریات اور مؤرخینِ آرٹ نے اس

MashalBooks.org

کے لئے ایسے جملے استعمال کئے ہیں: ''پریوں کی دنیا کا مسحور کن'' اور ''لطافتِ زندگی کا کامل ترین اور قبولیت عامہ کی زبردست خصوصیت کا حامل آرٹ جس سے دنیا کبھی آشنا ہوئی'' (۱۲) یہ کریٹ کا صرف آرٹ ہی نہیں بلکہ کریٹ کا معاشرہ بھی تھا جس نے سکالرز کو حیرت زدہ کردیا تھا۔ یہ آرٹ پُرشکوہ استرکاری والے کثیرلونی تیتروں، انوکھے خیالوں کے مظہر سیمرغوں، خوش ادا عورتوں، نادر سنہری مصغّر تصویروں، زرق برق جیولری اور خوبصورتی سے ڈھالے ہوئے مجسموں کا مظہر تھا۔

مثال کے طور پر کریٹ کے معاشرے کا ایک قابل ذکر پہلو، جو اسے دیگر قدیم اعلیٰ تہذیبوں سے ممیّز کرتا ہے یہ ہے کہ اس میں دولت کی تقسیم کافی حد تک منصفانہ تھی۔ نکولس پلاٹن کی رپورٹ کے مطابق ''عوام کا معیار زندگی حتیٰ کہ کسانوں کا معیار زندگی بھی کافی بلند معلوم ہوتا تھا۔ اب تک جتنے گھر دریافت ہوئے ہیں ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جس میں حالاتِ زندگی خراب ہونے کی نشاندہی ہوتی ہو'' (۱۳)

یہ کہنا مناسب نہیں ہوگا کہ کریٹ دیگر ملکوں سے زیادہ امیر تھا یا اتنا تھا جتنے مصر یا بابل امیر تھے لیکن اس امر کے پیش نظر کہ سب سے اوپر اور سب سے نیچے کے لوگوں کے درمیان جو وسیع اقتصادی اور سماجی خلیج ''اعلیٰ'' تہذیبوں کی خصوصیت تھی، وہ کریٹ میں صورتِ حال اس سے بہت مختلف تھی۔ معلوم ہوتا ہے کہ کریٹ نے شروع ہی سے دولت کے استعمال اور تقسیم کا بہتر بندوبست کیا تھا۔

ابتدائی آبادکاری کے زمانے سے جزیرے کی معیشت بنیادی طور پر زرعی تھی۔ جوں جوں وقت گزرتا رہا مویشی پروری، صنعت اور بالخصوص تجارت کی اہمیت بڑھتی چلی گئی۔ تجارت کے فروغ میں بادبانی کشتیوں نے بہت اہم کردار ادا کیا۔ یہاں سے سامانِ تجارت لے کر جانے والی کشتیوں نے تقریباً سارے بحیرہ روم پر قبضہ کررکھا تھا، اس طرح ملک کی خوشحالی میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ اور اگرچہ سماجی تشکیل کا آغاز لگ بھگ ۲۰۰۰ سال قبل مسیح میں شجرۂ مادری پرمبنی قبیلوں سے ہوا لیکن کریٹ کا معاشرہ زیادہ سے زیادہ مرکزگیر (centralized) ہوتا چلا گیا۔ سرآرتھر ایونز نے ان دو ادوار کو ''وسطی منوآن'' اور ''متأخر منوآن'' میں تقسیم کیا اور نکولس پلاٹن نے ''قدیم محل'' اور ''نئے محل'' کے ادوار کہا۔

لیکن مرکزگیری اپنے ہمراہ مطلق العنان حکمرانی لے کر نہیں آئی تھی۔ اور نہ ہی اس نے

ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کے استعمال کو چند طاقتوروں کے لئے مخصوص کر دیا اور نہ ہی وہاں عوام کا اس قسم کا ظالمانہ استحصال ہوا کرتا جیسا اس دور کے دیگر تہذیبوں کا عام وطیرہ تھا۔ اگرچہ کریٹ میں ایک خوشحال حکمران جماعت موجود تھی لیکن اس بات کی کوئی نشانیاں موجود نہیں ملتیں (ماسوائے دورِ متاخر کے یونانی قصے کہانیوں کے، جو تھیسیس کنگ مینوس اور مینوٹار سے وابستہ ہیں) کہ ان حکمرانوں کو بڑے پیمانے کی کسی مسلّح طاقت کی پشت پناہی حاصل تھی۔

نکولس پلاٹن جزیرے میں رسم تحریر کے حوالے سے لکھتا ہے کہ ''رسم تحریر کے ترقی پانے کے نتیجے میں اوّلین بیورو کریسی وجود میں آ گئی جیسا کہ "Linear A" میں لکھی گئی متعدد تختیوں (لوحوں) سے ظاہر ہوتا ہے'' پھر وہ کریٹ کی بڑھتی ہوئی دولت سے سرکاری محاصل اکٹھا کرنے کے طریقوں کا تذکرہ کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ سرکاری محاصل دانشمندانہ طریقے سے عوام کے حالاتِ زندگی بہتر بنانے کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ وہ حالات مغربی معیارات سے بھی بڑھ کر ''جدید'' تھے۔ تمام شہری مراکز میں نکاسی آب کا کامل نظام تھا اور، صفائی ستھرائی کا بندوبست بھی موجود تھا۔ وہ کہتا ہے کہ ''اس امر میں کوئی شبہ نہیں کہ منوآن کریٹ میں وسیع 'پبلک ورکس' تھے جن کی تعمیر و نگرانی کے اخراجات سرکاری خزانے سے کئے جاتے تھے اب تک اگرچہ بہت کم باقیات پر سے ملبے کے ڈھیرے اٹھائے جا سکے ہیں مگر جتنی صفائی ہو چکی ہے اس سے سامنے آنے والی چیزوں سے بہت سے انکشافات ہوئے ہیں مثلاً طویل پُل، پختہ سڑکیں، نگرانی کے لئے باہر بنی چوکیاں، سڑکوں کے کنارے سایہ دار جگہیں، پانی کے پائپ، فوارے اور پانی کے ذخیرے پائے گئے ہیں۔ آبپاشی کے انتظامات اور پانی پہنچانے اور تقسیم کرنے کے لئے نہروں کے شواہد بھی ملے ہیں۔ (۱۴)

بار بار آنے والے زلزلوں کے باوجود، جنہوں نے کہ پرانے محلات کو مکمل طور پر تباہ کر دیا اور نئے محلوں اور دیگر مرکزی عمارات کی تعمیر میں دوبار رخنہ اندازی کی، کریٹ کی محل سازی، تہذیب میں ایک منفرد مقام رکھتی تھی۔ یہ محلّات دیدہ زیبی اور آسائشاتِ زندگی میں اضافے کا شاندار امتزاج تھے۔ نہ کہ مصر، سُمر، اور روم وغیرہ طرح کی عمارات تھیں جو کہ محض اقتدار کے رعب و دبدبے کی مظہر تھیں۔ ان تہذیبوں کے طریقِ عمارت سازی میں جنگجوئی اور مرد کے تسلط کے حامل معاشروں کی خصوصیات دکھائی دیتی تھیں۔

کریٹ کے محلّات میں صحن وسیع اور سامنے والے حصے بے حد رعب دار ہوتے تھے اور

اندر سینکڑوں کمرے اس طرح منظّم ''بھول بھلّیوں'' کی شکل میں بنے ہوئے ہوتے تھے کہ بعد کی یونانی داستانوں میں زبان زد عام ہوگئے۔ ان پیچدار عمارتوں میں بہت سے اپارٹمنٹس ہوتے تھے جو ایک مرکزی صحن کے گرد اوپر نیچے مختلف بلندیوں پر غیر متشاکل انداز میں بنائے جاتے تھے، مذہبی رسوم کے لئے کئی کمرے مخصوص کر دیئے جاتے تھے۔ محل میں مصاحبوں کے لئے الگ کمرے ہوتے تھے یا انہیں قریب ہی دلکش مکانات دے دیئے جاتے تھے۔ محل کے خادمین کے لئے بھی کمرے ہوتے تھے۔ آپس میں ملے ہوئے کمروں کی طویل قطاریں تھیں، ان میں خوراک ذخیرہ کی جاتی اور قیمتی اشیا از قسم خزانہ محفوظ کی جاتی تھیں۔ بڑے بڑے ہال تھے جن میں خوش وضع ستونوں کی قطاریں تھیں۔ ان ہالوں میں استقبالیہ تقریب اور جلسے وغیرہ منعقد کئے جاتے تھے۔(۱۵)

باغات منوآن طرزِ تعمیر کی ایک لازمی خصوصیت تھے۔ اسی طرح خلوت، مناسب قدرتی روشنی اور گھریلو آسائشوں کے لئے عمارتیں ایک خاص وضع (ڈیزائن) کے تحت تعمیر کی جاتی تھیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان میں حُسن اور دیدہ زیبی کو خاص طور پر ملحوظ رکھا جاتا تھا۔ نکوس پلاٹن لکھتا ہے ''عمارت سازی کے لئے مقامی اور درآمدی' دونوں قسم کا سامان استعمال ہوتا تھا، سارا کام بڑی احتیاط سے انجام دیا جاتا: سنگِ رخام اور مسام دار چونے کا پتھر استعمال کیا جاتا ٹائلیں لگائی جاتیں دیوار سے باہر نکلے ہوئے مستطیل ستون بنائے جاتے، مسالے سے ملا کر مضبوط بنائے ہوئے سامنے کی حصے دیواریں، لائیٹ ویلز اور صحن، غرضیکہ ہر چیز کو درجۂ کمال تک پہنچانے کی کوشش کی جاتی۔ پردہ دیواروں کو خوبصورتی سے پلستر، یا بعض اوقات منقش کیا جاتا سامنے والے حصوں کو سنگ مرمر سے مزیّن کیا جاتا، ......نہ صرف دیواروں بلکہ چھت اور فرش پر بھی پینٹنگ کی جاتی۔ یہ شہروں تک ہی محدود نہیں تھا بلکہ دیہات ومضافات کی عمارتیں بھی خوشنما بنائی گئی تھیں۔ منظر کشی کے لئے سمندر میں پائی جانے والی اشیاء، خشکی کے پودے اور بیلیں وغیرہ، مذہبی رسوم، دربار کی خوشنما زندگی اور عوام کی بہبود کو پیش نظر رکھا جاتا، غرضیکہ ہر چیز میں فطرت کی پرستش کا اظہار ہوتا تھا۔(۱۶)

ایک بے مثل تہذیب

''نوسوس'' (Knossos) کا عظیم محل جو اپنے شاندار پتھر کے زینے، اپنے ستونوں پر

کھڑے برآمدوں اور بارعب استقبالیہ سوئٹ کی وجہ سے مشہور ہے یہ اپنے جمالیاتی پہلو سے بھی منوآن ثقافت کا ایک نادر مظہر ہے، اسے یہ اعزاز اپنے کمرۂ تختِ شاہی اور رائل اپارٹمنٹس کی اہمیت پر زیادہ زور دینے کی وجہ سے حاصل نہیں ہوا۔ ثقافت کے اس نادر مظہر کو مؤرخِ ثقافت جیکوئیٹا ہاکیز نے کریٹ کے فنِ تعمیر کا ''نسوانی جذبہ'' قرار دیا ہے۔ (۱۷)

''نوسوس'' جس کی آبادی غالباً ایک لاکھ تھی، اسے جنوبی ساحل سے ایک عمدہ پختہ شاہراہ کے ذریعے ملایا گیا تھا، یہ یورپ میں اپنی نوعیت کی پہلی شاہراہ تھی۔ اس کی گلیاں ''ملیا'' اور ''فیسطوس'' کے محلاتی مراکز کی طرح پختہ بنائی گئی تھیں اور ان میں پانی کے نکاس کا خیال بھی رکھا گیا تھا۔ ان کے بالمقابل مکانات صاف ستھرے دومنزلہ یا تین منزلہ تھے جن کے چھت چپٹی تھی بعض اوقات ان پر چھجے (Penthouse) بنے ہوتے تھے تاکہ انہیں گرمیوں کی راتوں میں استعمال کیا جاسکے۔ (۱۸)

ہاکیز نے محلات کے گردوپیش کے اندرونی قصبوں کا ذکر کیا ہے جو ''مہذب زندگی گزارنے کے لئے بے حد موزوں تھے'' اور پلاٹن نے اس دور کی ''نجی زندگی'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ ''یہ اعلیٰ درجے کی شائستہ اور پُرامن وآرامدہ زندگی تھی'' اس نے مختصراً انہیں یوں بیان کیا ہے: ''مکانات کو تعمیر کرتے ہوئے'' ان میں ہر قسم کی عملی ضرورتوں کا خیال رکھا گیا تھا ان کے اردگرد دلکش ماحول مہیا کیا گیا۔ منوآن کے باشندے فطرت کے نہایت قریب تھے اوران کا طرزِ تعمیر ایسا تھا کہ ان مکانوں کے مکین زندگی کا بھرپور لطف اٹھاسکیں اور جس حد تک بھی ممکن ہو آزاد رہیں'' (۱۹)

لوگ اپنے کپڑے بھی ایسے ڈیزائن پر بنواتے جن میں دیدہ زیبی کے ساتھ عملی اعتبار سے بھی آسانی رہے اور چلنے پھرنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے۔ جسمانی ورزش اور کھیلوں میں مرد عورت، دونوں حصہ لے سکتے تھے، ان کا مقصد تفریح کے مواقع پیدا کرنا ہوتا تھا، جہاں تک غذاؤں کا تعلق ہے، وہ متعدد اقسام کی فصلیں اُگاتے، مویشی پالتے، ماہی گیری کرتے، شہد کی مکھیاں پالتے اور انگور کی شراب بھی بناتے تاکہ متنوع غذائیں میسر آسکیں۔ (۲۰)

ان کی تفریح اور مذہب سے متعلق سرگرمیاں اکثر آپس میں خلط ملط ہوجاتی تھیں۔ فالتو اوقات کے مشاغل مسرت انگیز ہونے کے ساتھ ساتھ پُرمعنی بھی ہوتے تھے۔ پلاٹن

لکھتا ہے ''میوزک اور ڈانس ان کی زندگی کی لطافتوں میں اضافہ کرتے، بہت سی عوامی رسوم، زیادہ مذہبی نوعیت کی تھیں۔ وقتاً فوقتاً جلوس نکلا کرتے جن میں ناچنے گانے والے آگے آگے ہوتے تھے۔ اجتماعی دعوتیں منعقد ہوتیں۔ تھیٹروں میں قلابازیوں کے مقابلے کرائے جاتے تھے اس مقصد کے لئے ہال تعمیر کئے جاتے، بعض اوقات لکڑی سے بنے ہوئے اکھاڑوں میں تفریح طبع کا اہتمام ہوتا تھا۔ کریٹ میں بیلوں سے متعلقہ کھیل سب سے زیادہ دلچسپی کے حامل ہوتے تھے۔ (۲۱)

ایک اور سکالر رینالڈہگنز کریٹ کی زندگی کے اس پہلو کو مختصراً یوں بیان کرتا ہے:

''یہاں کے لوگوں کے لئے مذہب بہت پُرمسرت معاملہ تھا۔ محل سرا خانقاہوں، پہاڑوں کے اوپر بنی اوپن ائر خانقاہوں اور مقدس غاروں میں مذہبی تقریبات منعقد ہوتی تھیں...... ان کا مذہب عملِ تخلیق کے ساتھ گہرے طور پر منسلک تھا۔ بیل کے کھیل اہم ترین سمجھے جاتے جو غالباً محلّات کے مرکزی درباروں میں منعقد ہوتے تھے۔ نوجوان مردوں اور عورتوں کی ٹیمیں باری باری بپھرے ہوئے بیل کے سینگوں کو پکڑنے کی کوشش کرتیں اور بے خوف کھلاڑی اس کی پشت پر سوار ہوکر قلابازیاں کھاتے ہوئے نیچے گرتے، کچھ ہلاک اور کچھ زخمی ہوجاتے اور کچھ پھر اٹھ کر دوبارہ سوار ہونے کی کوشش کرتے۔ (۲۲)

عورتوں اور مردوں کی مساوی شراکت داری جو منوآن معاشرے کی ایک خصوصی پہچان تھی، بیل سے دھینگامشتی کے ان مقدس کھیلوں سے بڑھ کر کہیں بھی زیادہ نمایاں نظر نہیں آتی تھی۔ نوجوان عورتیں اور مرد انتہائی بے تکلفی سے ان میں حصہ لیتے اور اپنی زندگی کے لئے ایک دوسرے پر انحصار کرتے۔ ان رسموں میں ہیجان، چابکدستی اور مذہبی جوش وخروش کا بھرپور مظاہرہ ہوتا۔ ایسا لگتا ہے کہ منوآن سپرٹ کا مظاہرہ ایک اور اہم پہلو تھا جس میں صرف انفرادی حصولِ لذت یا خواہشِ نجات کا اظہار مقصود نہیں تھا بلکہ ان رسموں کے ذریعے سارے معاشرے کی بھلائی کے لئے الوہی طاقت سے مدد طلب کی جاتی تھی۔ (۲۳)

ایک بار پھر یہ واضح کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ کریٹ کوئی مثالی یا ''یوٹوپیائی'' معاشرہ نہ تھا بلکہ حقیقی طور پر انسانوں کا معاشرہ تھا جس میں مسائل بھی تھے انسانی کوتاہیاں بھی نمایاں تھیں۔ یہ ایک ایسا معاشرتی گروہ تھا جو ہزاروں برسوں سے ترقی کرتے کرتے یہاں تک پہنچا تھا، جبکہ وہ سائنس جس سے ہم آشنا ہیں، اس کا نام ونشان تک نہ تھا۔ اور

مختلف مظاہر فطرت کو روحوں کی خوشی یا ناخوشی پر محمول کیا جاتا اور انہیں خوش کرنے کے لئے کچھ مقررہ رسوم ادا کی جاتی تھیں۔ (۲۴) یہ معاشرہ ایسے حالات میں کام کررہا تھا جب گردوپیش کی دنیا میں جنگی جنون اور مردوں کا جابرانہ تسلط تیزی سے بڑھ رہا تھا۔

مثال کے طور پر ہم جانتے ہیں کہ اہل کریٹ کے پاس خوبصورت کلہاڑیاں اور مرصّع خنجر تھے اور ایسے اسلحے کے ستعمال کے لئے کچھ ٹیکنیکل صلاحیت بھی تھی۔ یہ ہتھیار غالباً اس لئے تھے کہ بحیرہِ روم میں قزاقی بڑھ رہی تھی۔ انہیں اپنا مال تجارت اِدھر اُدھر بھیجنا ہوتا تھا، بحری تجارت کے بچاؤ اور اپنے ساحلوں کے دفاع کے لئے انہیں بحری لڑائیاں لڑنا پڑیں۔ لیکن دیگر اعلیٰ تہذیبوں کے برعکس کریٹ کا آرٹ جنگ وجدل کو پسندیدہ طریقِ کار قرار نہیں دیتا۔ جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے کہ دیوی کی دومنہ والی مشہور کلہاڑی بھی زمین کی کریمانہ ثمر بخشی کی علامت تھی۔ ایسی کدال نما کلہاڑیاں فصل اُگانے کے لئے زمین کا جھاڑ جھنکار صاف کرنے کے کام آتی تھیں۔

اس امر کے بھی کوئی آثار نہیں ملے کہ کریٹ کے مادی وسائل ایسی ٹیکنالوجیز پر صرف ہوگئے جو تباہی پھیلانے کے لئے استعمال ہوتی تھیں (جیسے کہ آج ہمارے دور میں مادی وسائل استعمال کئے جارہے ہیں) اس کے برعکس شواہد یہ مل رہے ہیں کہ کریٹ کی دولت زیادہ تر ایسے امور پر خرچ ہوتی تھی جو ہم آہنگی اور خوش ذوقی کی زندگی کو فروغ دے سکتے تھے۔

جیسے کہ پلاٹن لکھتا ہے ''پوری زندگی فطرت دیوی پر غیر متزلزل ایمان سے عبارت تھی جو کہ جملہ تخلیق اور ہم آہنگی کا منبع تھی دیوی پر اس ایمان نے امن سے محبت، ظلم واستبداد سے نفرت اور قانون کے احترام کی طرف رہنمائی کی۔ حتیٰ کہ حکمران طبقوں میں بھی ذاتی امنگ نامی کوئی چیز دکھائی نہیں دیتی تھی۔ نہ ہم کسی بیش قیمت فن پارے کو کسی مصنف سے منسوب پاتے ہیں اور نہ ہی کسی حکمران کے کارناموں کا کوئی ریکارڈ ہمیں ملتا ہے''۔ (۲۵)

ہمارے وقت میں جب ''امن سے محبت ظلم واستبداد سے نفرت اور قانون کا احترام'' ہماری بقا کے لئے ایک لازمی ضرورت بن گئے ہیں کریٹ کے لوگوں کے جذبے اور اس کے ہمسایوں کے جذبے میں فرق تھا۔ یہ فرق محض ایک علمی فرق سے کہیں بڑھ کر تھا۔ کریٹ کے شہروں میں کہیں فوجی قلعہ بندیوں کا نہ پایا جانا، سمندر کے کنارے دیہی قیام گاہوں

(Villas) کے ''حفاظتی حصار'' نہ ہونا اور کہیں ایسے بورڈ دکھائی نہ دینا کہ اس جزیرے کی کون کون سی شہری مملکتیں ایک دوسری کے خلاف صف آراء رہیں اور کس کس نے جارحانہ جنگیں لڑیں (جبکہ بعض فصیل بندیوں والے شہروں اور جنگ زدہ ملکوں میں ایسے بورڈ لگنا ایک عام طریقہ تھا) ان کی امن پسندی کے واضح ثبوت ہیں۔ اس طرح ماضی کے مطالعہ سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ انسانوں کے پُرامن بقائے باہمی کی امیدیں ''یوٹوپیائی'' (خالی خولی امیدیں) نہیں ہیں۔ اور کریٹ کی داستانی شبیہوں (دیوی بطور مادرِ کائنات اور زمین پر انسانوں جانوروں پودوں، پانی اور کھلی فضا کا پایا جانا اسی کے مظاہر ہیں) سے پتہ چلتا ہے کہ ہم اور فطرت ایک وحدت(oneness) کی لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ یہ نظریہ آج، ماحولیاتی بقا کے لئے بطور شرطِ اول ازسرنو ابھر رہا ہے۔

معاشرے اور نظریئے کے مابین تعلق کے حوالے سے، بالخصوص منوآن دور کے حوالے سے، جو چیز سب سے زیادہ غور طلب اور قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ کریٹ کا آرٹ ایک ایسے معاشرے کی عکاسی کرتا ہے جس میں اقتدار غلبہ پانے، تباہی مچانے اور جبروتشدد کرنے کا ہم معنی نہیں تھا۔ جیکو ٹاہاکیز کے الفاظ میں، (جو کریٹ کے بارے میں لکھنے والی چند ایک خواتین میں سے ہے):

''یہاں جنگجو بادشاہ جو فتح کے شادیانے بجاتا پھر رہا ہو اور دشمن کو ذبح کئے بغیر دم نہ لیتا ہو، اس کا تو تصور ہی نہیں تھا۔ یہاں دولت مند طاقتور اور صاف طینت حکمران شاندار محلات میں خوب ٹھاٹ سے رہتے تھے، ان میں مردانہ تکبر اور بلاارادہ(unthinking) مظالم کا کوئی سراغ نہیں ملتا'' (۲۶)

کریٹ کی ثقافت کا ایک قابل ذکر پہلو یہ ہے کہ یہاں ''نوسس'' کے تخت یا کسی اور محل کے تخت پر بیٹھنے والوں کے کوئی مجسمے یا منقش یادگاریں نہیں ملتیں تحفہ بردار جلوس کے وسط میں دیوی کی آبی رنگوں میں نقاشی (فریسکو) کے علاوہ وہاں اور کسی بادشاہ یا ملکہ کی کوئی تصویر آخری مرحلے تک نہیں ملتی۔ اس وقت بھی واحد ممکنہ استثنیٰ پینٹ شدہ مجسمہ جسے نوجوان شہزادے کے طور پر شناخت کیا گیا ہے وہ لمبے بالوں والا غیرمسلح نوجوان ہے، جو کمر تک ننگا ہے۔ اس سر پر مور پنکھ کا تاج ہے اور اسے پھولوں اور تتلیوں کے درمیان ٹہلتا ہوا دکھایا گیا ہے۔

اسی طرح باعثِ حیرت یہ انکشاف ہے کہ منو آن دور کے کریٹ کے آرٹ میں کسی لڑائی یا شکار کا کوئی مرعوب کن منظر نہیں دکھایا گیا جیکو ٹا ہاکیز اس پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتی ہے ''ثقافتی ارتقا کے اس مرحلے اور اس دور میں ہمہ مقتدر مرد حکمران کے اظہار شان وشوکت کی عدم موجودگی تقریباً ایک ہمہ گیر رجحان تھا جو یہ نتیجہ اخذ کرنے کی وجوہات میں سے ایک ہے کہ منو آن کے قابضینِ تختِ شاہی شاید رانیاں ہوا کرتی تھیں'' (۲۷) ثقافتی بشر پیکری کی ماہر رُوبی روہرلچ لیویٹ بھی اس نتیجے پر پہنچی ہے۔ اس نے کریٹ کا نسوانی تناظر میں جائزہ لیتے ہوئے لکھا کہ یہ جدید ماہرین آثار ہیں جنھوں نے اس نوجوان کو ''نوجوان شہزادہ'' یا ''پریسٹ کنگ'' قرار دے دیا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ کوئی ایک آدھ شبیہہ بھی ایسی دریافت نہیں ہوگی جسے بادشاہ یا ایک جابر مذکر دیوتا مانا جاسکتا ہو۔ اس نے مزید لکھا کہ کریٹ میں مردانہ تشدد اور تباہ کن طاقت کی تصویر گری نہ ہونے کا رجحان اس حقیقت کے ساتھ ساتھ چلتا دکھائی دے رہا ہے کہ یہ ایک ایسا معاشرہ تھا جہاں ''۱۵۰۰ برس تک گھر اور باہر دونوں جگہوں پر امن و امان تھا جب کہ وہ مسلسل جنگوں کا زمانہ تھا۔ (۲۸)

پلاٹن، باوجود اس کے کہ وہ ''منو آن'' لوگوں کو غیر معمولی طور پر امن پسند'' قرار دیتا ہے، وہ بھی تختِ منو آن کے قابضین کو بادشاہ قرار دیتا ہے تاہم وہ یہ لکھنے پر خود کو مجبور پاتا ہے ''ہر بادشاہ نے اپنی سلطنت پر حکمرانی سب کے مابین مکمل ہم آہنگی اور پُرامن بقائے باہمی کے اصول کے مطابق کی تھی''۔ پلاٹن اس دور میں حکومت اور مذہب کے درمیان گہرے ربط کو قدیم سیاسی زندگی کی منفرد خصوصیت بتاتا ہے لیکن ایک بار پھر لکھتا ہے کہ دوسری شہری مملکتوں کے بالکل برعکس یہاں ''بادشاہ کے اختیارات کو غالبًا اعلیٰ حکام کی کونسل نے محدود کر رکھا تھا، جس میں دیگر سماجی طبقوں کو بھی نمائندگی حاصل تھی'' (۲۹)

قدیم کریٹ کی قبل از پدرسری تہذیب سے متعلق یہ معلومات، جنھیں اب تک نظرانداز کیا جاتا رہا ہے ہمیں حیرت انگیز منابع کا سراغ فراہم کرتی ہیں ان کا ہم بعد میں جائزہ لیں گے، یہ منابع وہ ہیں جنھیں ہم مغربی تہذیب میں قدر کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ان میں خاص طور پر حیرت خیز بات یہ ہے کہ ان لوگوں کو مغرب کے اس جدید تصور کا کیسے علم ہوا کہ حکومت سازی میں سب لوگوں کے مفاد کی نمائندگی ہونی چاہیے۔ ایسا لگتا ہے کہ منو آن کریٹ نے کلاسیکی یونان کے عہد میں جمہوریت کے جنم لینے سے بہت پہلے اس کا ادراک

MashalBooks.org

کرلیا تھا۔ مزید برآں اقتدار کے اس جدید تصوّر کا ظہور کہ ''یہ ایک غلبے کا نہیں بلکہ ایک ذمہ داری کا نام ہے''۔ عین ممکن ہے کہ یہ بھی قدیم تصورات کا ظہور ثانی ہو۔

کیونکہ جس بات کی شہادت سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ کریٹ میں اقتدار کو بنیادی طور پر مادریّت کے مترادف سمجھا جاتا تھا نہ کہ مردانہ جبر وتشدد کے خوف سے اظہارِ اطاعت کے معنوں میں لیا جاتا تھا۔ یہی چیز معاشرے کے ''پارٹنرشپ ماڈل'' کی تعریف مانی جاتی ہے جس میں عورت اور اس سے منسوب خصوصیات کو ایک خاص سسٹم کے تحت گھٹیا اور کمتر سمجھ کر پیش نہیں کیا جاتا۔ کریٹ میں اقتدار کی یہ تعریف اس وقت بھی مروّج تھی جب اس کے سماجی اور فنیاتی ارتقا نے زیادہ پیچیدگی اختیار کر کے اس کے ثقافتی ارتقا کو متاثر کیا۔

ایک خاص دلچسپی کی بات یہ ہے کہ کریٹ کے کانسی کے دور میں داخل ہونے کے بہت بعد جا کر اس وقت جب دیوی کو بطور زندگی دہندہ اور پرورش کنندہ بے حد احترام دیا جاتا تھا اور اسرار دنیا کی اعلیٰ ترین مجسم سمجھا جاتا تھا عورتیں کریٹ کے معاشرے میں بدستور امتیازی حیثیت کی مالک چلی آ رہی ہیں۔ یہاں جیسا کہ Rohrlich-Leavit لکھتا ہے عورتیں مرکزی حیثیت رکھتی ہیں، انہیں آرٹس اور مہارتوں کا موضوع بنایا جاتا ہے اور پبلک حلقوں میں نمایاں طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ (۳۰)

جہاں تک اس دعوے کا تعلق ہے کہ شہری ریاست یا جسے بعض ماڈرن سکالر ''ریاستیت'' (statism) کہتے ہیں، ساختیاتی طور پر جنگ وجدل، نظامِ مراتب اور عورتوں کی تسخیر کی متقاضی ہے اس طرح اس کی تصدیق نہیں ہوسکی۔ کریٹ کی شہری ریاستیں جو اپنی دولت، اعلیٰ آرٹس اور مہارتوں اور روزافزوں تجارت میں دن دوگنی رات چوگنی ترقی کر رہی تھیں، ان کے بارے میں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ نئی ٹیکنالوجیز اور ان کے ہمراہ وجود میں آنے والی بڑی اور زیادہ پیچیدہ سماجی تنظیم، بشمول بڑھتی ہوئی سپیشلائزیشن کے ،عورتوں کی حیثیت و مرتبے میں کوئی ابتری واقع نہیں ہوئی۔

اس کے برعکس، منوآن کریٹ میں فنیاتی تبدیلی کے ساتھ ساتھ فرض منصبی کے ازسرِ نوتعین نے عورتوں کی حیثیت کمزور نہیں بلکہ مستحکم کی تھی کیونکہ وہاں کوئی بنیادی اور نظریاتی تبدیلی واقع نہیں ہوئی، فنیاتی ترقی کے لئے مطلوب نئے فرائض منصبی نے کسی قسم کا تاریخی تعطّل پیدا نہیں کیا تھا جیسا کہ بعض خطوں میں ہم پاتے ہیں۔ جنوبی میسوپوٹیمیا کے

معاشروں میں سخت گیر سماجی طبقہ بندی اور ۳۵۰۰ قبل مسیح میں مسلسل جنگ وجدل کے ساتھ ساتھ ہم عورتوں کی حیثیت کا زوال بھی پاتے ہیں۔ منوآن کریٹ میں اگرچہ شہروں کی تعمیر کا سلسلہ جاری رہا اور سماجی طبقہ بندی بھی موجود تھی۔ جنگ وجدل نہیں تھا اور عورتوں کی حیثیت کو بھی زوال نہیں آیا تھا۔ (۳۱)

واضح حقائق سے چشم پوشی

موجود مثال میں جہاں درجہ بندی اوّلین تنظیمی اصول ہے اگر عورتیں بلند مرتبہ رکھتی ہیں تو اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مردوں کا مرتبہ لازماً پست تر ہونا چاہیے۔ اس سے قبل ہم نے دیکھا کہ کس طرح مادری وراثت اور سلسلۂ نسب کی شہادت کی بنا پر عورت مقام الوہیت رکھنے کی وجہ سے پادری اور ملکہ کے دنیاوی اقتدار پر فائز تھی، اس سے یہ تعبیر کی گئی کہ وہ مادری معاشرہ تھا لیکن آثاریاتی شہادت کی رُو سے یہ نتیجہ اخذ کرنا سراسر بے جواز ہے۔ نہ ہی کریٹ کی عورتوں کی بلند حیثیت سے یہ نتیجہ نکالا جاسکتا ہے کہ کریٹ کے مردوں کا مرتبہ، مردوں کے زیر غلبہ معاشرتی نظاموں میں عورتوں کے مرتبے کے برابر ہوتا تھا۔

منوآن کریٹ میں دونوں صنفوں کے درمیان تعلق (نہ صرف صنفی کرداروں کی تعریف اور اہمیت کے لحاظ سے بلکہ جنسی خواہشات کے حوالے سے بھی) واضح طور پر ہمارے لحاظ سے بالکل مختلف ہوتا تھا۔ مثال کے طور پر عورتوں کے لباس کی ایسی وضع جس میں چھاتیاں دکھائی دے رہی ہوں اور مردوں کے ایسے ناکافی کپڑے جن میں آلۂ تناسل نمایاں ہوجائے صنفی کشش میں اضافہ ہوجاتا ہے جس کی وجہ سے امکانِ جنسی تلذذ بڑھ جاتا ہے۔ انسان شناسی کی جدید نفسیات سے متعلق ہم جتنا کچھ جانتے ہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ''لذّت کے اس بندھن (pleaoure bond) نے مردوں اور عورتوں کے مابین بطور افراد باہمی کشش اور زیادہ بڑھا دی ہوگی۔ (۳۲)

باشندگانِ کریٹ کے جنس سے متعلق زیادہ فطری رویّوں نے جو اثرات مرتب کئے ان کا ادراک کرنا مروّجہ حالات میں اس لئے مشکل ہوگا کہ مذہبی عقیدہ عموماً جنس کو تشدد کی بہ نسبت زیادہ بڑا گناہ قرار دیتا ہے۔ جیسا کہ ہاکیز لکھتی ہے ''معلوم ہوتا ہے کہ کریٹ کے لوگوں نے آزادانہ اور اچھی متوازن جنسی زندگی کے ذریعے اپنی جارحیت کے جذبے کو کم

کرلیا اور اس کا رُخ بھی تبدیل کرلیا تھا''۔ اس کے ساتھ ساتھ کھیلوں، ڈانس، صلاحیتِ تخلیق اور حُبِ زندگی کے لئے ان کے جوش وخروش کی بدولت جنس سے متعلق ان کے بے تکلفانہ رویّوں نے ان کے اندر ایک عمومی طور پر امن پسندانہ اور یگانگت پسندانہ سپرٹ پیدا کردی تھی جو کریٹ کی زندگی میں بہت نمایاں تھی۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا کہ یہ اسی سپرٹ کا معاملہ ہے جو کریٹ کو اُس وقت کی دیگر اعلیٰ تہذیبوں سے ممیّز کرتا ہے۔ آرنلڈ ہاسر کے الفاظ میں ''منوآن کی ثقافت اپنے ہم عصروں کی ثقافت سے اسی سپرٹ کے فرق کی وجہ سے غیر معمولی طور پر مختلف ہے''(۳۴) لیکن اب ایک دائمی رکاوٹ آجاتی ہے، یہ وہ نقطہ ہے جہاں سکالرز ایسی معلومات سے دوچار ہوتے ہیں جو مروّجہ عالمی تناظر کے تحت خود بخود خارج ہوجاتی ہیں۔ کیونکہ جب اس لازمی فرق کو اس حقیقت کے ساتھ مربوط کرنے کا وقت آتا ہے کہ کریٹ آخری اور فنیاتی طور پر انتہائی ترقی یافتہ معاشرہ تھا جس میں مرد کے غلبے کا قطعاً رواج نہیں تھا، تو سکالرز کی بہت بڑی تعداد اچانک خالی الذہن ہوجاتی ہے یا ایک اور سمت میں چل پڑتے ہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہوتا ہے کہ وہ پہلو تہی کی حکمت عملی اختیار کرکے اس مشکل پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس بات تک پہنچ جائیں کہ دیگر قدیم اور ہمعصر تہذیبوں کے بالکل برعکس، کریٹ میں امن پسندی اور دوسروں کی ضرورتوں کا احساس کرنے کی ''نسوانی'' خصوصیات کو سماجی طور پر فوقیت دی جاتی تھی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ اس بات کو بھی نوٹ کرلیں کہ دیگر معاشروں کے برعکس کریٹ کی عورتوں کی سماجی، اقتصادی، سیاسی اور مذہبی حیثیتیں بہت بلند ہوا کرتی تھیں۔ لیکن وہ یہ باتیں بر سبیل تذکرہ کرتے ہیں، ان پر زور نہیں دیتے جس سے ان کی تحریروں کے قاری کو جوان کی بلند حیثیت کی وجہ سے ہمہ تن متوجہ ہوکر مطالعہ کرتا ہے، یہ پیغام ملتا ہے، کہ: یہ محض ایک ضمنی سی بات، یا ذیلی معاملہ ہے۔

کریٹ کے بارے میں پائے جانے والے بیشتر لٹریچر کا مطالعہ کرتے ہوئے ایک قاری کو "Descent of man" پر ڈارون کا ایک ذیلی حاشیہ یاد آجاتا ہے۔ اس نے اپنی اس سائنسی کلاسیک میں نسلی اختلاف پر ایک سیکشن قلمبند کرتے ہوئے اپنی ایک یادداشت کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا کہ اسے فرعون ایمونوف III کے مجسمے کے خدوخال بڑی حد تک نیگروؤں جیسے لگے تھے۔ اس نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا......اور جو اس وقت سے

یقینی طور پر مسلمہ حیثیت رکھتا تھا.....یہ تھا کہ مصر میں کالے رنگ کے فرعون ہوتے تھے۔ اگرچہ اس کے اپنے حساب سے اس کے مشاہدات کی توثیق دو ایسے آدمیوں نے کی جو اس وقت اس کے ہمراہ تھے۔ اس نے اپنے آپ کو اس موضوع کے دو معروف مصنفین کا حوالہ دینے پر مجبور پایا، یہ تھے J.C.Nott اور George R.Glidden جنہوں نے اپنی کتاب Types of Mankind میں فرعونوں کی خصوصیات کو ''اعلیٰ درجے کے یورپین'' قرار دیتے ہوئے دعویٰ کیا کہ مذکورہ مجسمہ یقیناً ''نیگرو اختلاط'' کا نتیجہ نہیں ہے۔ (۳۵)

اس باب کے شروع میں ہم نے اس قسم کے ریمارکس ''فرعون عورتوں'' سے متعلقہ شواہد کے ضمن میں بھی دیئے تھے، ان کے نام "Meruet Nit" اور "Nit-Hotip" تھے۔ لیکن جب علوم مصریات میں اس قسم کی معتبر بے بصری جگہ جگہ پائی جاتی ہے تو کریٹ سے متعلق بیشتر عالمانہ ادب میں بھی ایسی بے بصیرتی پائی جاتی ہے۔ ہر موڑ پر الٹا سیدھا مواد ملتا ہے۔ بعض مقامات کریٹ کے آرٹ کے بارے میں نہایت واضح پیغام موجود ہوتا ہے لیکن کوئی اسے توڑ مروڑ کر اور کوئی تخفیف کر کے پیش کرتا ہے۔ ڈارون کے بہت بعد جب مزید مجسمے اور سیاہ فام حکمرانوں کی تاریخی طور پر موجودگی کی بہت زیادہ واضح مرئی شہادت دریافت ہوئی تو ماہرین نے جن میں اکثریت سفید فام مردوں کی تھی، پھر بھی دعویٰ کیا کہ ''نیگرو اختلاط'' ہونا ممکن ہی نہیں۔ (۳۶) اسی طرح جب کریٹ کو اس وقت کے دیگر معاشروں سے ممیّز کرنے سے متعلق حیرت انگیز گواہی سامنے آئی تو بیشتر سکالروں نے اس کا باقاعدگی سے انکار کیا یا نظرانداز کر دیا۔

کریٹ کے معاشرے میں عورتوں نے جو مرکزی کردار ادا کیا وہ اتنا حیرت انگیز اور تحسین آفرین ہے کہ منوآن ثقافت کی بالکل ابتدائی دریافت سے ہی سکالرز اسے مکمل طور پر نظرانداز کرنے کی ہمت نہ کر سکے۔ تاہم ڈارون کی طرح انہوں نے خود کو مجبور پایا کہ انہوں نے جو کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا، اسے مروّجہ نظریئے کے اندر فٹ کریں۔ مثال کے طور پر جب سر آرتھر ایونز نے ۱۹۰۰ء کے اوائل میں جزیرے میں کھدائی شروع کی تو اس نے یہ بات دریافت کر لی کہ اہل کریٹ ایک نسوانی مورتی کی پرستش کیا کرتے تھے۔ اس نے یہ بھی دیکھ لیا کہ کریٹ کا آرٹ ''نسوانی اعتماد کے مناظر'' کی شبیہہ سازی کرتا ہے لیکن ایونز نے خود کو اس بات پر مجبور پایا کہ وہ ان کا فوری طور پر اس سے زیادہ کسی چیز سے موازنہ نہ

کرے جسے وہ خود ''سوسائٹی سکنڈلز'' کی ''فضول گپ شپ'' قرار دیتا تھا۔ (۳۷)

ایک طرف Vassos Karageorghis اور Hans-Gunther Buchholtz کی وضع قطع تھی جو عورتوں کے بارے میں جرمنوں کے فرسودہ طرزِ عمل کی مضحکہ خیز طور پر مسخ شدہ شکل (caricature) دکھائی دیتی تھی۔ دوسری طرف اگرچہ وہ اس وقت جب وہ یہ تبصرہ کرتے ہیں کہ دیوتاؤں کے معبد (Pantheon) میں ''زندگی کے ہر شعبے میں نسوانیت کی عظمت کی عکاسی ہوتی ہے'' اور بعدازاں وہ نسبتاً زیادہ مردانہ مائسینین تہذیب کے مذہب میں نسوانیت کی اعلیٰ قدرومنزلت کی جھلک پانے کا ذکر کردیتے ہیں۔ (۳۸) صرف ایک عورت جیکو ٹاہا کیز ہے جو کسی لگی لپٹی کے بغیر منوآن تہذیب کے نسوانی تہذیب ہونے کا برملا اعلان کرتی ہے۔ مگر وہ بھی اس اہم اور بصیرت افروز کے مکمل مضمرات کو آگے بڑھانے سے رک جاتی ہے۔

پلاٹن خصوصی طور پر کہتا ہے کہ ''ہر شعبۂ زندگی میں عورت کے اہم کردار ادا کرنے کی جھلک ملتی ہے''، پھر کہتا ہے ''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ عورت نے منوآن تہذیب میں قابل ذکر کردار انجام دیا ہے، معاشرے میں عورت کے اہم کردار کا اظہار اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ انہوں نے ''نیوپیلس لائف'' کے تمام پہلوؤں میں مستعدی کا مظاہرہ کیا ہے''۔ پھر کریٹ کی ثقافت میں عورت کی بلند حیثیت اور تمام شعبوں میں اس کے مستعد کردار کو اس ثقافت کی اہم خصوصیت کا اعتراف کرتے ہوئے، پلاٹن بھی یہ اضافہ کرنے پر خود کو مجبور پاتا ہے ''ممکن ہے کہ یہ اس لئے ہوا ہو کہ طویل سمندری مہمات میں مرد غیر حاضر تھے''۔ یہ بصورت دیگر ایک غیر معمولی عالمانہ تحقیق کا کام تھا جس میں اس نے خاص طور پر یہ نوٹ کیا کہ اس (کریٹ) کو مادرسری نظام قرار دینا گمراہ کن ہوگا، اس کے لئے وافر شہادتیں موجود ہیں (حتیٰ کہ بعد میں اہل یونان کے زمانے سے بھی) جانشینی عورت کے ذریعے ہوتی رہی تھی۔ (۳۹)

چنانچہ ہم بار بار دیکھ رہے ہیں کہ مروّجہ ضابطۂ کار کے تحت اپنے حقیقی ماضی (اور ہمارے ثقافتی ارتقا کا اصل راستہ) کو شیشے میں سے دیکھیں تو مبہم ہی پا سکتے ہیں لیکن ایک دفعہ اس حقیقت کے پورے مفہوم کو رُوبرو ہوکر دیکھیں جس کی طرف ہمارے اس ماضی نے اشارے دیئے ہیں تو ہم ایک دلگداز سوال سے دوچار ہوتے ہیں۔ ہمارے ثقافتی رُخ میں ایک انقلابی تبدیلی کون لایا' ہمیں ساغر (جام) کے پیش کردہ سماجی نظام کی راہ سے ہٹا کر خنجر

کے مغلوب کردہ نظام کی طرف کس نے پھینکا؟ یہ کب اور کیسے ہوا؟ اور یہ طوفانی تبدیلی ہمیں ہمارے ماضی اور ہمارے مستقبل کے بارے میں کیا بتاتی ہے؟

MashalBooks.org

باب 4

ابتدا سے قرونِ وسطیٰ تک

جام میں سے خنجر کیسے برآمد ہوا؟

ہمیں وقت ناپنے کا جوطریقہ سکھایا گیا ہے، اس کے تحت ہم ''انسانی تاریخ'' کا صدیوں میں شمار کرتے ہیں۔ لیکن اس سے پہلے ایک مختلف قسم کی تاریخ ہوتی تھی جسے ''ہزاریہ''(Millenium جمع Millenia)یعنی ایک ہزار برس، سے ناپا جاتا ہے۔ حجری دور (Paleolithic) ۳۰ ہزار برس پیچھے تک جاتا ہے جدید حجری(Neolithic) زرعی انقلاب کا زمانہ تھا جو ۱۰ ہزار سال پہلے ہوا کرتا تھا۔ سب سے زیادہ پرانی آبادی جو دریافت کی گئی وہ کٹل ہویوک (جنوب وسطی ترکی ،قونیہ کے جنوب مشرق میں) تھی، اس کا سراغ ۱۹۶۱ سے ۱۹۶۳ تک کی کھدائیوں سے ملا۔ اس آبادی کی داغ بیل ۸۵۰۰ سال پہلے پڑی تھی۔ اور کریٹ کی تہذیب صرف ۳۲۰۰ برس پہلے زوال کا شکار ہوئی۔

اس ہزاریئے میں بیشتر یورپی اورمشرقِ قریب کے معاشروں میں زیادہ تر زور ان ٹیکنالوجیز پر رہا جو معیار زندگی کو برقرار رکھنے اور بڑھانے میں ممد ومعاون ہوتی ہیں۔ جدید حجری زمانے کے ہزاروں برسوں میں کھیتی باڑی کے ذریعے اجناس پیدا کرنے کے علاوہ شکار، ماہی گیری اور مویشی پروری کے ذریعے بھی غذائیں حاصل کرنے کے لئے لمبے لمبے قدم اٹھائے گئے۔ فن تعمیرات کے سلسلے میں اختراعات کی بدولت ہاؤسنگ میں بہت پیش

رفت ہوئی۔ دریاں قالین، فرنیچر اور گھریلو استعمال کی دیگر اشیاء تیزی سے بننے لگیں اور شہروں کی منصوبہ بندی بھی (جیسے کٹل ہویوک میں) شروع ہوگئی۔ [۱] پارچہ بافی اور سلائی کی ایجاد کی وجہ سے کپڑے تیار ہونے کی وجہ سے چمڑے اور سمور کا زمانہ بہت پیچھے رہ گیا۔ اور جیسے جیسے اعلیٰ تہذیب کی مادی اور روحانی بنیادیں رکھی جارہی تھیں، آرٹس بھی فروغ پارہے تھے۔

بطور ایک عمومی اصول سلسلۂ نسب ماں سے چلتا تھا۔ زمین کے ثمرات کی پیداوار اور تقسیم کی سربراہ معمر عورتوں یا سربراہِ قبیلہ کی نگرانی میں ہوتی تھی۔ یہ ثمرات گروپ کے تمام ارکان کی ملکیت سمجھے جاتے تھے۔ اہم ذرائع پیداوار کی مشترک ملکیت کے ساتھ ساتھ سماجی اقتدار بطور ایک ذمہ داری یا امانت برائے استفادۂ عام کا تصور بھی پایا جاتا تھا۔ اس طرح امداد باہمی کے اصول پر ایک سماجی تنظیم وجود میں آچکی تھی۔ عورتیں اور مرد، دونوں، خواہ ان کا تعلق کسی بھی نسلی گروہ وذات سے ہوتا مشترک مفاد کے لئے یک جان ہو کر کام کرتے تھے۔ [۲]

یہاں سماجی جبر اور منظّم نبرد آزمائی مرد کی جسمانی قوت کی بنیاد نہیں تھی اور نہ نجی املاک مرد کے مضبوط ترین ہاتھوں میں مرتکز ہونے کی یہ بنیاد تھی۔ اس قوت نے نہ تو عورتوں پر مردوں کی برتری کی بنیاد فراہم کی اور نہ ہی ''نسوانی اقدار'' پر ''مردانہ اقدار'' کو برتری دلائی۔ اس کے برعکس وہاں مروّج نظریۂ حیات عورت کی مرکزیت کے گرد گھومتا تھا جبکہ الوہیت بھی پیکرِ نسوانیت میں ظاہر کی گئی تھی۔ فطرت کی تولیدی، پالنہار اور تخلیقی قوتیں جو کہ ''نسوانی جام'' یا منبعِ حیات کی علامات تھیں متاعِ گرانمایہ سمجھی جاتی تھیں۔ علاوہ ازیں عورت پادری اور مرد پادری کے فرائض مرد کے وحشیانہ مظہر کو مذہبی جواز عطا کرتے ہوئے کہیں بھی دکھائی نہیں دیتے تھے بلکہ وہ کمیونٹی کے مفاد کو پیش نظر رکھ کر اسی طرح استعمال ہوتے تھے جیسے قبیلوں کے سربراہ کمیونیٹی کی زمینوں کے لئے اپنے اختیارات کو بروئے کار لاتے تھے۔ [۳]

لیکن پھر ایک عظیم تبدیلی رونما ہوئی، یہ اتنی عظیم تھی کہ انسانی ثقافتی ارتقاء میں اتنے بڑے حجم کی کوئی اور تبدیلی دکھائی نہیں دی۔

انوکھے حملہ آور

شروع شروع میں ان لوگوں کی حیثیت بائبل کہاوت کے مطابق ''آسمان پر تیرتے ہوئے انسانی ہتھیلی کے برابر بادل کے ٹکڑے'' سے زیادہ نہیں تھی۔ یہ بے مایہ گڈریوں کے گروہ اپنے ریوڑوں کو ہانکتے ہوئے چراگاہوں کی تلاش میں گھومتے دکھائی دیتے تھے۔ یہ لوگ ہزاروں برس سے بے آب وگیاہ، ناگوار ٹھنڈے علاقوں میں زمین کے آخری کونوں کو چھان رہے تھے۔ جبکہ اوّلین عظیم زرعی تہذیبیں زرخیز وسطی علاقوں میں جھیلوں کے اردگرد اور دریاؤں کے کناروں پر پھیل رہی تھیں۔ ان زرعی باشندوں کے لئے، جوارتقائے انسانیت کے ابتدائی اُبھار کے مزے لوٹ رہے تھے امن اور خوشحالی ہی بنی نوع انسان کی دائمی منزل تھی، یہ خانہ بدوش ایک الگ تھلگ دنیا کے عجوبے سے بڑھ کر کچھ نہیں تھے۔

ہمارے پاس یقینی معلومات تو نہیں ہیں البتہ ہم قیاس کرسکتے ہیں کہ خانہ بدوشوں کے یہ گروہ اپنی تعداد اور اپنی وحشیانہ خصلتوں میں کس طرح بڑھتے چلے ہوں گے اور کتنا عرصہ اسی حالت میں رہے ہوں گے۔ (۴) لیکن پانچویں ہزاریئے کے دوران یا تقریباً سات ہزار سال پہلے کے بارے میں ہمیں شہادتیں ملنا شروع ہوچکی ہیں جسے میلارٹ مشرقِ قریب، قدیم اور جدید حجری ثقافتوں کی ٹوٹ پھوٹ کا ایک نمونہ قرار دیتا ہے (۵)۔ آثاریاتی باقیات اس دور میں کئی علاقوں میں انتشار پھیلنے کی واضح نشاندہی کرتی ہیں۔ حملوں، قدرتی آفتوں اور بعض جگہوں پر دونوں کے شواہد ملتے ہیں، جونہی کسی جگہ کوئی آفت آتی، ساتھ ہی وہاں وحشیانہ حملے بھی ہوجاتے۔ جس سے وسیع پیمانے پر تباہی مچتی اور لوگ ترک مکانی بھی کرجاتے تھے۔ بہت سے خطوں میں پرانے پینٹ شدہ ظروف کی روایت ختم ہوجاتی اور رفتہ رفتہ وہاں ماضی کی طرف رجعت اور تعطّل کا زمانہ چھا جاتا۔ بڑھتے ہوئے انتشار وبدنظمی کے ایسے زمانے میں تہذیب کا ارتقا تعطّل کا شکار ہوجاتا ہے۔ جیسا کہ میلارٹ لکھتا ہے کہ سُمر اور مصر کی تہذیبوں کے ظہور میں ابھی مزید دوہزار سال گزرنے تھے۔ (۶)

قدیم یورپ میں جدید حجری معاشرے، جو دیوی کی پرستش کرتے تھے ان کی مادی اور ثقافتی ٹوٹ پھوٹ بھی پانچ ہزار سال قبل مسیح میں شروع ہوتی ہوئی معلوم ہوتی ہے جسے مریجہ گمبوٹس ''کورگوں کی لہر نمبر ۱'' (Kurgan wave number one) کہتی ہے۔ وہ لکھتی ہے

''عمر کی نشاندہی کرنے والی ''کاربن ڈیٹس'' کا شکریہ کہ ان کی بڑھتی ہوئی تعداد کی بدولت یہ ممکن ہوگیا ہے کہ کورگنوں کے ہجرت کر کے آنے والوں کی کئی لہروں کی آمد کی تاریخیں معلوم کر لی گئیں جو قبل از تاریخ کے یورپ کو روندتے ہوئے گزر گئے۔'' یہ بار بار کی تاخت وتاراج، ان سے لگنے والے ثقافتی جھٹکے اور آبادیوں کی منتقلی تین بڑی بڑی یلغاروں میں مرکوز تھی: لہر نمبر ۱، ۴۳۰۰۔۴۲۰۰ قبل مسیح لہر نمبر ۲، ۳۴۰۰۔۳۲۰۰ قبل مسیح اور لہر نمبر ۳، ۔ ۳۰۰۰۔۲۸۰۰ قبل مسیح (یہ تاریخیں ''تاریخ شجریات'' "Dendochronology" میں محفوظ ہیں)

''کورگن'' وہ لوگ تھے جنہیں سکالرز انڈویورپین یا آرین زبان بولنے والی نسل قرار دیتے ہیں جسے جدید دور میں نٹشے اور پھر ہٹلر نے اپنی آئیڈیل بنایا اور اسے واحد خالص یورپی نسل قرار دیا۔ درحقیقت وہ اصلی یورپین نہیں تھی کیونکہ انہوں نے ایشیائی اور یورپی شمال مشرق سے اس براعظم پر یلغار کی تھی۔ نہ ہی وہ اصلی انڈین تھے۔ کیونکہ وہ اور لوگ تھے جنہیں ''دراوڑ'' کہا جاتا ہے جو آریائی حملہ آوروں سے پہلے ہندوستان میں رہتے تھے۔ (۸)

لیکن ''انڈویورپین'' کی اصطلاح الجھ گئی ہے۔ یہ ایشیائی اور یورپی شمال سے آنے والے خانہ بدوش قبائل کے حملوں کے ایک سلسلے کی نشاندہی کرتی ہے، جن پر طاقتور پادریوں اور جنگجوؤں کی حکمرانی تھی۔ وہ اپنے ساتھ جنگوں اور پہاڑوں کے مرد ''دیوتا'' لے کر آئے تھے۔ اور جب ہندوستان میں آریاؤں نے مشرقی بحیرہ روم سے خلیج فارس تک پھیلے ہوئے زرخیز علاقے ہلال اخضر میں حطیوں اور متانیوں نے اناطولیہ میں لووانیوں نے مشرقی یورپ میں کورگوں، اور یونان میں پہلے اکاینوں اور بعدازاں ڈورینوں نے اچھی طرح قدم جمالئے تو انہوں نے مفتوحین پر بتدریج اپنے نظریات اور طریق ہائے زندگی مسلّط کر دیئے۔ (۹)

کچھ اور خانہ بدوش حملہ آور بھی تھے۔ ان میں سب سے زیادہ مشہور سامی (Semitic) لوگ تھے جنہیں ہم عبرانی کہتے ہیں۔ وہ جنوبی صحراؤں سے آئے اور کنعان (جسے بعد میں پیلسٹائن یا فلسطین کہا جانے لگا) پر حملہ آور ہوگئے۔ جن اخلاقی اصولوں کو ہم یہودیت اور عیسائیت سے جوڑتے ہیں اور کئی جدید گرجاؤں اور سائناگاگز میں امن پر جو زور دیا جاتا ہے وہ اب اس تاریخی حقیقت کو نظر سے اوجھل کر دیتا ہے کہ یہ قدیم سامی الاصل لوگ جنگجو طبقہ تھے جن پر جنگجو پادری (موسیٰ، ہارون اور یوشع کے قبیلۂ لاوی کے

لوگ) حکمرانی کیا کرتے تھے۔ انڈو یورپیوں کی طرح یہ بھی اپنے ساتھ جنگ اور پہاڑوں کے غضبناک دیوتاؤں (جیہووا یا یہویہہ) لائے، اور رفتہ رفتہ جیسا کہ ہم بائیبل میں پڑھتے ہیں انہوں نے بھی علاقہ کے مفتوحین پر اپنے نظریات اور طرز زندگی مسلط کر دیا۔

انڈو یورپیوں اور قدیم عبرانیوں کے درمیان حیرت انگیز مشابہتوں کی وجہ سے بعض لوگوں نے یہ اٹکل پچو مارا کہ ممکن ہے کہ ان کے چند منابع مشترک ہوں یا کم از کم ان کے ثقافتی عناصر ایک دوسرے میں گڈ مڈ ہو گئے ہوں (۱۰) لیکن یہ حسب نسب یا ثقافتی رابطے نہیں ہیں جن کا سراغ نہ لگایا جا سکتا ہو۔ ان مختلف مقامات اور زمانوں کے لوگوں کو ملانا ایک ضروری امر ہے یعنی ان کے سماجی اور نظریاتی نظاموں کا ڈھانچہ قائم کیا جانا ایک اہم بات ہے۔

ایک چیز جو ان سب میں مشترک تھی وہ سماجی تنظیم کا تسلّط ماڈل تھا۔ یعنی ایسا سماجی نظام تھا جس میں مرد کی بالادستی تھی اور اس کی طرف سے تشدد کا بھرپور مظاہرہ ہوتا تھا جبکہ ایک ایسا نظامِ مراتب اور ایک حاکمانہ سماجی ڈھانچہ تھا جس میں مرد ہی کو تسلّط جمانے کا حق حاصل تھا۔ ایک اور اشتراک یہ تھا کہ ان معاشروں کے برعکس جنھوں نے مغربی تہذیب کی بنیادیں ڈالیں، انہوں نے جس طریقے سے مادی دولت حاصل کی وہ پیداوار کو بڑھانے والی ٹیکنالوجیز کے ذریعے کمائی نہیں گئی بلکہ تباہی پھیلانے کی موثر ترین ٹیکنالوجیز کے ذریعے کمائی گئی تھی۔

دھات کاری اور مرد کی برتری

اس سلسلے میں کلاسیک مارکسسٹ کتاب "The Origin of the Family, Private Property, and the State" کا مصنف فریڈرک اینجلز ان اوّلین لوگوں میں سے تھا جنھوں نے نجی املاک پر مبنی نظامِ مراتب اور سماجی طبقہ بندی کو عورت پر مرد کے غلبے کے ساتھ جوڑا۔ مزید برآں اینجلز نے مادری نسب کی پدری نسب کی طرف منتقلی کو تانبے اور کانسی دھات کاری کی ترقی سے بھی جوڑا۔ (۱۱) تاہم اگرچہ یہ ایک قائدانہ بصیرت تھی مگر ناپختہ کاری کی وجہ سے اس کا نشانہ صحیح نہ پڑا کیونکہ یہ حالیہ تحقیق سے ممکن ہوا ہے کہ ہم اس کی روشنی میں (سماجی طور پر مسحور کن بات) میں ان خاص طریقوں کو دیکھ سکتے ہیں جن کے ذریعے تانبے

اور کانسی کی دھات کاری نے یورپ اور ایشیائے کو چک میں ثقافتی ارتقا کے راستے کو کلیتاً نئی سمت میں موڑ دیا تھا۔

ان زبردست نئی تبدیلیوں کا جو بھی سبب بنا، اس کا ان دھاتوں کی دریافت سے کوئی تعلق دکھائی نہیں دیتا۔ بلکہ یہ ٹیکنالوجی کے بنیادی نقطے سے تعلق رکھتا ہے جو ہم وضع کرتے رہے ہیں: یہ وہ مصارف ہیں جن کے لئے ہم ان دھاتوں کو استعمال کرتے ہیں موجودہ تناظر میں مفروضہ یہ ہے کہ تمام ضروری فنیاتی دریافتوں کی ابتدا کا سہرا ''شکاری مرد'' اور ''جنگجو مرد'' کے سر ہے جس نے ہلاکت خیزی کو مزید مؤثر بنانے کے لئے نئے نئے طریقے سوچے تھے۔ ہمارے کالج کے نصابوں میں شامل ایک جدید رزمیہ آرتھر، سی کلارک کی فلم ''۲۰۰۱'' میں ہمیں پڑھایا گیا کہ یہ کام لکڑی اور پتھر کے ہتھیاروں سے شروع کیا گیا تھا پھر اسی منطق سے ڈنڈوں اور چھریوں کو دوسروں کو قتل کرنے کے لئے استعمال کیا جانے لگا۔ (۱۲) اس لئے یہ بھی فرض کرلیا گیا کہ دھاتیں سب سے پہلے ہتھیاروں کے لئے ہی استعمال ہوئی تھیں۔ تاہم آثاریاتی گواہی بتاتی ہے کہ جدید حجری دور کے لوگ بہت پہلے سے تانبے اور سونے جیسی دھاتوں سے باخبر تھے مگر وہ انہیں زیورات اور مذہبی مقاصد کے لئے اور آلات سازی کے لئے بھی استعمال کرتے تھے۔ (۱۳)

اشیا کی عمر جانچنے کی نئی تیکنیک اینجلز کے زمانے تک معلوم نہیں ہوئی تھی تاہم اندازہ ہوتا ہے کہ یورپ میں دھاتوں کی تیکنیک پہلے چھ ہزار سال قبل مسیح میں کارپیتھن پہاڑوں کے جنوب کے لوگوں اور ، ڈینارِیک اور ٹرانسلینن پہاڑوں کی قریبی آبادیوں میں رہنے والوں کو معلوم تھی، وہاں کے آثار میں سے جو دھاتی اشیا ملیں وہ زیورات، مورتیوں اور مذہبی عبادت میں کام آنے والی اشیا کی صورت میں تھیں۔ پانچویں اور چوتھے ہزاریئے کے اوائل میں تانبا بھی عام استعمال کی اشیا میں استعمال ہونے لگا اس سے چپٹے منہ والی کہلاڑیاں، مچھلیاں پکڑنے کے لئے کھونٹیاں، سوئیاں، چمڑے اور لکڑی میں سوراخ کرنے کے لئے نوکیلے اوزار ''آڑ'' وغیرہ بنتے تھے۔ لیکن جیسا کہ گمبوٹس لکھتی ہے قدیم یورپ میں لکڑی پر کام کے لئے تانبے کی کلہاڑی استعمال کی جاتی تھی۔ کلہاڑی، تاریخ کا زمانہ شروع ہونے کے ابتدائی برسوں اور اس کے بعد کے برسوں میں انڈو یورپین ثقافتوں کی طرح، جنگ وجدل کی علامت نہیں ہوتی تھی اور نہ ہی الوہی قوتوں کی علامت تھی۔ (۱۴)

اس طرح کھدائیوں سے ملنے والے شواہد اس نتیجے کی تائید کرتے ہیں کہ دھاتیں بجائے خود برائی نہیں تھیں بلکہ جنگ کو مزید مہلک بنانے میں ان کا استعمال ایک برائی تھا۔ جس کے لئے اینجلز نے کہا ہے کہ دھاتوں کے استعمال نے ''مونث جنس کی دنیا بھر میں تاریخی شکست میں تاریخی کردار'' ادا کیا تھا۔ (۱۵)

زمانہ قبل از تاریخ کے مغرب میں مرد کا تسلط بھی کوئی مروّجہ طریقہ نہیں تھا جیسا کہ اینجلز نے کہا ہے جب اکٹھے ہو کر شکار کرنے والوں نے شروع شروع میں جانوروں کو سدھا کر ان کی افزائش نسل کے طریقے سیکھے تھے (بہ الفاظ دیگر جب گلہ بانی ان کی اصل ٹیکنالوجی آف پروڈکشن بن گئی تھی)، بلکہ یہ اس کے بہت بعد میں جا کر اس وقت ہوا جب گلہ بانوں نے زرخیز علاقوں پر یورشوں کا سلسلہ شروع کر دیا جو ہزاروں سال جاری رہا، وہاں پہنچ کر انہوں نے کھیتی باڑی کو اپنی اصل ٹیکنالوجی آف پروڈکشن بنالیا تھا۔

جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے یورپ کے عہدِ جدید حجری کے کسانوں کے لئے تباہی پھیلانے والی ٹیکنالوجیز کوئی اہم سماجی ترجیحات نہیں تھیں۔ لیکن جنگجو خانہ بدوشوں کے لئے، جو شمال کے بنجر علاقوں اور جنوب کے صحراؤں سے گروہ در گروہ یلغار کرتے ہوئے آ رہے تھے یہ اہم ترجیحات تھیں۔ اور انسانی تاریخ کے اسی نازک موڑ پر دھاتوں نے اپنا مہلک کردار ادا کیا کیونکہ یہ قتل وغارت لوٹ مار اور دوسروں کو غلام بنانے کے لئے اسلحہ فراہم کر رہی تھیں جبکہ ٹیکنالوجی کی عمومی ترقی قابل اعتراض چیز نہیں ہے۔

گمبوٹس نے بڑی عرق ریزی کے ساتھ قدیم یورپ کے اس طریقِ عمل کا ذہنی وبصری نقش تیار کیا ہے، اس نے آغاز اس حقیقت سے کیا ہے کہ یہ خانہ بدوش جس خطے سے آئے تھے وہ بحیرہ اسود کے شمال کی خشک میدانی علاقہ تھا وہاں کوئی تانبا نہیں تھا ''اس سے ذہن اس مفروضے کی طرف جاتا ہے کہ اس خشک میدان کے گھوڑ سوار 'کرگن' دھات کاری کی ٹیکنالوجی سے واقف تھے جو پانچویں اور چوتھے ہزاریہ قبل از مسیح میں کاکیشیا کے پہاڑوں کے جنوب میں پائی جاتی تھی۔ غالباً ۳۵۰۰ قبل مسیح کے اردگرد انہوں نے ماورائے کاکیشیا کے علاقوں جارجیا، آذربائیجان اور آرمینیا سے دھات کاری کی تیکنیک سیکھی اور اس کے بعد بہت جلد وہ کاکیشیا کی کچ دھاتوں سے معدنیات نکالنے لگے تھے'' (۱۶) یا زیادہ صراحت کے ساتھ کہا جائے تو اس کے بعد جلد ہی وہ دھات سے مزید مہلک ہتھیار بنانے لگے تھے۔ (۱۷)

گمبوٹس کو یہ معلومات جنگ عظیم دوم کے بعد بڑے پیمانے پر کی گئی کھدائیوں اور عمر کا تعین کرنے والی ٹیکنالوجی متعارف ہونے کے نتیجے میں حاصل ہوئی تھیں۔ ان کا باریک بینی سے جائزہ لیا جائے تو ظاہر ہوتا ہے کہ تانبے سے کانسی کے عہد میں منتقلی (جب تانبے اور سنکھیا کے بھرت یا تانبے قلعی کے بھرت ظہور میں آئے) ۳۵۰۰ اور ۲۵۰۰ قبل مسیح کے درمیان عمل میں آئی۔ یہ قدیم سکالرز کی طرف سے عمومی طور پر بتائے گئے اندازے ۲۰۰۰ سال قبل مسیح سے کافی قدیم زمانہ بنتا ہے۔ مزید برآں براعظم یورپ میں کانسی کی میٹالرجی کے پھیلاؤ کا سلسلہ شمالی میدانوں سے آنے والے ان انتہائی متحرک جنگجوؤں کی یورشوں سے جا ملتا ہے جو نظام مراتب کے تحت مرد کے زیر تسلط معاشرے کے خانہ بدوش لوگ تھے جنہیں گمبوٹس "Kurgans" قرار دیتی ہے۔ ''کانسی کے ہتھیاروں خنجر بھالوں اور تیر، تیز دھار کلہاڑیوں اور نیم قیمتی پتھر جڑی جنگی کلہاڑیوں اور سنگ چقماق لگے تیروں کا تعلق کرگن لوگوں کے اختیار کردہ طریقوں میں سے ہے۔''(۱۸)

ثقافتی ارتقا میں تبدیلی

یہ ہرگز نہیں کہا جا سکتا کہ مغربی معاشرے کے ارتقا میں انقلابی تبدیلی آنا محض فتوحاتِ جنگ کا ماحاصل تھا، جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے کہ تبدیلی کا یہ عمل کافی زیادہ پیچیدہ تھا۔ تاہم اس میں یہ سوال نہیں کیا جا سکتا کہ جنگ شروع ہی سے ''شراکت ماڈل'' (partnership model) کو غلبہ ماڈل (dominator model) میں تبدیل کرنے کا ذریعہ رہی ہے اور جنگ اور سماجی تشدد کی دیگر شکلیں ہمارے ثقافتی ارتقا کو ''شراکت'' سے ''غلبے'' کی طرف موڑنے میں مرکزی کردار ادا کرتی رہی ہیں۔

جیسا کہ ہم دیکھیں گے کہ سماجی نظام کے ''شراکت'' سے ''غلبہ ماڈل'' میں تبدیل ہونے کا عمل تدریجی تھا اور کچھ عرصے کے بعد قابل پیشگوئی عمل بن گیا تھا۔ تاہم جو واقعات اس تبدیلی کے محرک بنے وہ کسی حد تک معاً رونما ہوئے اور اس وقت ناقابل پیشگوئی تھے۔ آثاریاتی ریکارڈ جو کچھ ہمیں بتاتا ہے وہ ناقابل پیشگوئی تبدیلی کے بارے میں ''سائنسی سوچ سے چونکا دینے کی حد تک مطابقت رکھتا ہے۔ یا نظاموں کی طویل عرصہ سے برقرار یا تقریباً برقرار حالتوں کا توازن کتنی تیز رفتاری کے ساتھ ایسی حالتوں تک پہنچ سکتا ہے

MashalBooks.org

جوتوازن سے بہت دُور ہوں یا بالکل حالتِ انتشار طاری ہو۔ اس سے زیادہ نمایاں اور قابل ذکر بات یہ ہے کہ ہمارے ثقافتی ارتقا کی بعض سمتوں میں یہ انقلابی ردّوبدل ، ایلڈریج اور گولڈ کے تجویز کردہ ''پابند توازن'' (punctuated equilibria) کے غیر مستقیم ارتقائی ماڈل میں کس طرح فٹ بیٹھتا ہے جبکہ نازک ''دوشاخہ نقاط'' (bifurcation points) میں ''دیہی گوشہ نشینوں'' (peripheral isolates) کا ظہور ہو چکا ہے۔

''دیہی گوشہ نشین'' جواب استعارۃً ہمارے کرۂ ارض کے جھالردار حاشیئے کے طور پر نمودار ہوئے (شمال کے چٹیل میدان اور جنوب کے بنجر صحرا) کوئی مختلف انواع نہیں تھے۔ بلکہ معاشرے کے شراکت داری پر مبنی ماڈل کی رہنمائی میں ہونے والی پیش قدمی میں رکاوٹ بنتے ہوئے وہ اپنے ہمراہ سماجی تنظیم کا ایک بالکل مختلف نظام لے کر آئے۔

حملہ آوروں کے نظامِ حیات کے اندرونی سانچے میں سب سے زیادہ قیمت اُس قوت کی تھی جو زندگی دیتی نہیں بلکہ لیتی ہے۔ یہ وہ قوت تھی جس کی علامت ''مذکر'' خنجر تھا۔ قدیم کرگن غاروں کی نقش کاریوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ انڈو یورپین حملہ آور حقیقتاً اسی ''مذکر'' خنجر کو پوجتے تھے۔ کیونکہ ان کے تسلّط پر مبنی معاشرے میں، جس پر دیوتاؤں (مردانِ جنگ آزما) کی حکمرانی تھی، یہ ان کی اعلیٰ ترین قوت تھا۔

قبل از تاریخ کے افق پر ان حملہ آوروں کے ظہور کی وجہ سے دیوی اور عورتوں کا مرتبہ بتدریج گھٹتے گھٹتے مردوں کی شریک حیات یا طوائفوں کے درجے پر آ گیا اور مرد کے غلبے، جنگ وجدل، عورتوں کو لونڈیاں بنانے کا رواج بڑھنے لگا۔

یہ دو سماجی نظام اپنی بنیاد ہی سے ایک دوسرے سے کتنے مختلف تھے اور رواجوں میں تغیر وتبدّل کتنا طوفان خیز تھا، یہ ان دیہی گوشہ نشینوں کی بڑھتی ہوئی طاقت کا نتیجہ تھا جواب دیہی حملہ آوروں کا روپ اختیار کر چکے تھے، گمبوٹس نے اپنی کتاب میں اسے مختصراً یوں قلمبند کیا ہے:

> ''قدیم یورپین اور کرگن ثقافتیں ایک دوسری کی نقیض تھیں۔ اول الذکر بیٹھ کر کام کرنے والے ماہرین باغبانی تھے جو وسیع علاقوں میں منصوبہ بندی کر کے شہر بسانے کی طرف رجحان رکھتے تھے۔ ان کے ہاں قلعہ بندیوں اور ہتھیاروں کی عدم موجودگی ان کے عقیدہ پُرامن بقائے باہمی اور اس

مساواتِ انسانی کی تصدیق کرتی ہے جو غالباً شجرۂ مادری اور مقامِ رہائش مادری پر مبنی تھا۔ کرگن نظام، شجرۂ پدری، سماجی طبقہ بندی، چھوٹے چھوٹے گاؤں میں بنے ہوئے مویشیوں کے باڑوں اور موسمی آبادکاریوں پر مبنی تھا جہاں وہ وسیع میدانوں میں اپنے مویشی چراتے تھے۔ ایک معیشت کاشتکاری پر اور دوسری مویشی پروری پر استوار تھی جنھوں نے دومتناقض نظریات کو جنم دیا۔ قدیم یورپی نظامِ عقائد زرعی سلسلۂ پیدائش وموت اور پھر جی اٹھنے پر مرتکز تھا جس کی تجسیم اصول مادری پر استوار تھی۔ کرگن نظامِ عقائد جو انڈو یورپی علم الاصنام کے متقابل عرفیت رکھتا تھا مردانہ قوت کی توصیف اور آسمان پر چمک اور کڑک لانے پر قادر جنگجو دیوتاؤں کی تحمید وتقدیس کا قائل تھا۔ قدیم یورپی شبیہات میں ہتھیار ناپید تھے جبکہ کرگنوں کے ہاں خنجر وکٹار اور جنگی کلہاڑی نمایاں علامات تھیں اور وہ تاریخی طور پر مشہور انڈو یورپیوں کی طرح تیز دھار خنجر کی قوتِ ہلاکت خیزی کی ستائش کرتے تھیں۔''(۲۱)

جنگ وجدل، غلامی اور قربانی

غالباً سب سے زیادہ نمایاں چیز پتھروں، قبروں کے کتبوں یا چٹانوں میں کندہ کئے گئے ہتھیار ہیں جو صرف کرگنوں کے حملوں کے بعد دکھائی دینے لگے ہیں۔ ہمیں اب وہ چیزیں ملی ہیں جنھیں گمبوٹس ''انڈین یورپین جنگجو دیوتاؤں کی اوّلین مرئی شبیہات'' قرار دیتی ہے۔ وہ اٹلی اور سوئٹزرلینڈ کے پہاڑوں اور چٹانوں کی کھدائیوں میں سے برآمد ہونے والی نقش کاریوں کے بارے میں لکھتی ہے کہ ان میں سے بعض شکلیں اور مجسمے نیم بشر پیکری عقیدۂ الوہیت کے مظہر ہیں۔ ان کے بازو اور سر نمایاں ہیں لیکن اکثریت تجریدی شبیہات ہیں جن میں دیوتا کو صرف اس کے ہتھیاروں سے ظاہر کیا گیا ہے جبکہ بعض شبیہوں میں دیوتا مع ایک کمر بند، گلے کے ہار، کانوں کے آویزوں سمیت دکھائی دیتا ہے، کہیں الوہی جانور، ایک گھوڑا یا بارہ سنگھا نظر آتا ہے۔ بہت سی نقش کاریوں میں اس جگہ بھی جہاں دیوتا کا سر ہونا چاہیے تھا ایک سورج یا بارہ سنگھا بنا ہوا ہے۔ جبکہ بعض میں دیوتا کے بازوؤں کو لمبے دستوں

والی کلہاڑیوں یا نیزوں سے ظاہر کیا گیا ہے۔ ایسی شبیہات کے وسط میں ایک ، تین سات یا نوخنجر رکھے گئے ہیں زیادہ تر بیلٹ کے اوپر باغیچے بنائے گئے ہیں۔ (۲۳)

گمبوٹس لکھتی ہے ''ہتھیار واضح طور پر دیوتا کے کاموں اور قوتوں کی نمائندگی کرتے تھے اس لئے ان کی پوجا کی جاتی تھی کہ وہ خود دیوتا ہیں۔ تمام انڈویورپین مذاہب میں بھی ہتھیار کے تقدس کی شہادت ملتی ہے۔ یونانی تاریخ دان ہیروڈوٹس سے پتہ چلتا ہے کہ ''سیتھیا'' (Scythians) کے باشندے اپنے مقدس خنجر اور نیزے کے سامنے قربانی پیش کرتے تھے۔ جدید حجری الپائن خطے سے ملنے والی شبیہات میں ہتھیاروں سے مسلح دیوتا کہیں بھی نہیں ملا''۔ (۲۴)

تیز دھار خنجر کی مہلک قوت کی یہ تقدیس اور مدح سرائی مع ایک طرزِ زندگی کے، جس میں دیگر انسانوں کو منظّم طریقے سے ذبح کیا جاتا، ان کی املاک کو تباہ کیا جاتا، لوٹا جاتا اور ان لوگوں کی عزتیں بھی پامال کی جاتیں یہ ایک معمول بن چکا تھا۔ آثاریاتی شہادت کے ذریعے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دورِ غلامی کا آغاز تھا جو ان مسلح حملوں کے ساتھ گہرے طور پر مربوط تھا۔

مثال کے طور پر ان شہادتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ کرگوں کے بعض کیمپوں میں عورتوں کی بہت سی تعداد پائی جاتی تھی جو کرگن نہیں تھیں بلکہ جدید حجری اور پرانی یورپی آبادی سے تعلق رکھتی تھیں۔ (۲۵) اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ کرگوں نے مقامی مردوں اور لڑکوں کو قتل کردیا اور چند عورتوں کو زندہ رہنے دیا تاکہ انہیں بیویاں یا لونڈیاں بنایا جاسکے۔ اس امر کی گواہی تھی کہ یہ ایک عمومی اور معیاری طرزِ عمل تھا جو کئی ہزار سال بعد عہد نامۂ قدیم میں ملتا ہے۔ جب خانہ بدوش عبرانی قبیلوں نے کنعان پر حملہ کیا تھا۔ مثلاً کتاب ''گنتی'' ۳۱:۳۲۔۳۵ میں ہم پڑھتے ہیں کہ حملہ آوروں نے مدائنیوں کو شکست دینے کے بعد وہاں سے مالِ غنیمت لوٹا تو اس میں، اس ترتیب کے ساتھ بھیڑیں، مویشی، گدھے، اور ۳۲ ہزار لڑکیاں شامل تھیں، جو بالکل کنواریاں تھیں۔

عورتوں کا مرتبہ اتنا شرمناک حد تک گھٹا دیا گیا تھا، کہ عورتیں اور ان کے بیٹے محض اشیاء رہ گئے تھے، اس کا ثبوت کرگوں کی رسومِ تدفین سے بھی ملتا ہے جیسا کہ گمبوٹس لکھتی ہے ''کرگنستان'' کے بودوباش کے اوّلین ثبوت چار ہزار سال قبل از مسیح کے زمانے کی متعدد

قبریں ہیں۔ بہ الفاظِ دیگر یہ قبریں یورپ پر کرگوں کے حملوں کی پہلی یلغار سے قبل کی ہیں۔ (۲۶)

انڈو یورپین اقوام کے ''سردار'' قسم کے لوگوں کی قبروں کا ایک مخصوص سٹائل ہوا کرتا تھا انہیں مرنے کے بعد ان کے مقام و مرتبے کے مطابق دفن کیا جاتا تھا، اس سے ان کے سماجی نظم میں بنیادی تبدیلی کا اظہار ہوتا ہے۔ سب سے زیادہ مضبوط اور ذی وقار شخص کی قبر سب سے اوپر بنائی جاتی تھی۔ گمبوٹس کے الفاظ میں ''یہ بدیسی کلچر کا ایک مظہر'' تھا جو ان کی رسوم تدفین کے آثار سے نمایاں ہوتا ہے۔ قدیم یورپی طریق تدفین کے برعکس جس سے سماجی عدم مساوات کا کوئی اظہار نہیں ہوتا تھا، یہاں قبروں کا سائز بھی نمایاں طور پر مختلف ہے اور ان کے اندر پائی جانے والی قیمتی اشیا کی مقدار اور معیار بھی بہت مختلف ہے۔ ماہرین آثاریات ان اشیا کو ''تحائف تدفین'' قرار دیتے ہیں۔ یہ تحائف دفن شدہ مردے کے علاوہ ہیں۔ (۲۷)

قبروں میں سے ملنے والے مواد میں سے، جو یورپین قبروں میں سے، پہلی بار برآمد ہوا ہمیں ایک غیر معمولی طور پر بڑی جسامت اور مضبوط ہڈیوں والا مرد کا ڈھانچہ اور عورتوں، رکھیلوں یا لونڈیوں کے ڈھانچے ملے۔ یہ مرنے والے مردوں کی عورتیں یا لونڈیاں تھیں جو قربان ہوئی تھیں۔ اس اسم کو ''ستی کی رسم'' کہا جاتا تھا (اس اصطلاح کو گمبوٹس نے ستی نے کہا ہے جو ہندوستان سے لی گئی ہے۔ جب ہندوستان میں کوئی ہندو مرجاتا تھا، اس کی بیوی بھی اسی کی چتا میں چھلانگ لگا کر موت کو گلے لگالیا کرتی تھی، یہ اسم بیسویں صدی تک چلتی آرہی ہے) یورپ میں یہ بظاہر انڈو یورپین کرگنوں نے متعارف کرائی۔ اس کا پہلی بار بحیرۂ اسود کے مغرب میں ڈینیوب ڈیلٹا میں ''سوووروؤ''(Survorovo) نامی گاؤں میں پتہ چلا۔ (۲۸)

مزید برآں طریقِ تدفین کی یہ دُور رس اختراعات اپنے اندر کرگنوں کے تینوں حملوں کی خصوصیات لئے ہوئے ہیں۔ مثال کے طور پر ''گلوبولر ایمفورا'' ثقافت جو کرگنوں کی آمد کی اوّلین لہر کے بعد تقریباً ایک برس تک چھائی رہی، اس میں یہی وحشیانہ طریق تدفین ہوتا تھا، جو اسی قسم کے سماجی اور ثقافتی نظم کی عکاسی کرتا تھا۔ جیسا کہ گمبوٹس لکھتی ہے ''ایک خاص انداز میں متعدد افراد کی ان اموات نے ہم زمانی اموات کے امکان کو خارج کردیا ہے۔

MashalBooks.org

عام طور پر مردانہ ڈھانچہ تابوتی قبر کے ایک سرے پر بمعہ اس کے تحائف کے دفن ہے جبکہ دو یا اس سے زائد افراد اس کے دوسرے سرے پر اکٹھے دفن ہیں۔ ''گلوبولرایمفورا'' مقبروں سے مرد کے غلبے کی تصدیق ہوتی ہے۔ کثیرالازواجی کا ثبوت ''وولنیا'' میں ''ووجنخیکا'' کی تابوتی قبر سے ملتا ہے جہاں ایک مردانہ ڈھانچے کی دو اطراف میں دو عورتوں اور چار بچوں کے ڈھانچے پڑے ہیں ایک نوجوان مرد اور ایک نوجوان عورت اس کے پاؤں کی طرف پڑے ہیں'' (۲۹)

یہ بلند مرتبت لوگوں کے مقبرے بہت سی دیگر اشیا کا خزانہ بھی ہیں جو حکمران طبقے کے افراد کی ضروریاتِ زندگی تھیں اور مرنے کے بعد بھی ان کے لئے کار آمد خیال کی جاتی تھیں۔ گمبوٹس لکھتی ہے۔ ''جنگجویانہ شعور جو اس سے پہلے قدیم یورپ میں ناپید تھا، اس کی تصدیق کرگن قبروں سے برآمد ہونے والی اشیا تیرکمان، نیزو، کاٹنے اور گھونپے جانے والے چاقوؤں سینگ سے بنی کلہاڑیوں اور گھوڑے کی ہڈیوں سے ہوتی ہے (۳۰)'' انہی قبروں سے ایسی علامتی اشیاء مثلاً سؤر کا جبڑا اور اس کے لمبے دانتوں، کتے کے پنجر اور بیل کے شانے کی ہڈی برآمد ہونا بھی اس بات کی مزید آثاریاتی گواہی ہے کہ نہ صرف ایک بنیادی سماجی تبدیلی بلکہ ایک بنیادی نظریاتی تبدیلی بھی آ چکی تھی۔

یہ رسوماتِ تدفین اب ان ٹیکنالوجیز کی بڑھتی ہوئی سماجی قدر کا اظہار کر رہی ہیں جو تباہی پھیلانے اور تسلط جمانے کی علامت ہیں ان میں اس امر کی شہادت بھی موجود ہے کہ دوسروں کو نظریاتی طور پر کس طرح مٹانے اور زیر قبضہ لانے کی حکمت عملی وضع کی جاتی ہے جو ہمیں آئندہ دیکھنا پڑ سکتی ہے: مرد اہم مذہبی علامات کو کس طرح اپنے تصرّف میں لاتے ہیں جو دیوی کی پوجا کے زمانے میں عورتوں کے ساتھ منسلک سمجھی جاتی تھیں۔

گمبوٹس لکھتی ہے کہ ''سؤر کا جبڑا'' کتا دفنانا یا بیل کی شانے کی ہڈی خاص طور پر مردوں کی قبروں میں رکھنے کی رسم کا سِرا بحیرہ اسود کے میدانی علاقوں میں کرگن I-II (سریج سٹاگ) کی قبروں تک جا پہنچتا ہے۔ سؤر کا گوشت اگرچہ ایک ذریعۂ خوراک ہے مگر اس کی اقتصادی اہمیت ان مویشیوں کی ہڈیوں کی مذہبی مضمرات سے مغلوب ہو جاتی ہے جو معاشرے کے سرکردہ مردوں کے زیر استعمال پائے جاتے ہیں۔ علامتی رشتے جواب مردوں اور سؤر وغیرہ کے ساتھ منسلک پائے جاتے ہیں اس مذہبی اہمیت کی ایک تقلیب یا استرداد

ہیں جو قدیم یورپ میں انہیں دی جاتی ہے، جہاں سؤر باز آفرینی کی دیوی (Goddess of regeneration) کا مقدس ساتھی تھا۔ (۳۱)

تہذیب کی تراش خراش

مغرب اور جنوب کی طرف پھیلتے ہوئے قدیم یورپ کا آثاریاتی ارضی منظر اب اذیتناک حد تک تبدیل ہو چکا ہے۔ گمبوٹس لکھتی ہے ''ہزار سالہ روایات کتر بیونت کا شکار ہوگئیں، قصبے اور دیہات پارہ پارہ ہوگئے۔ خوبصورت رنگ وروغن سے مزیّن فنِ ظروف سازی کے شاہکار برتن غائب ہوگئے جیسے کہ خانقاہیں، نقاشیاں، مجسمے، علامتیں اور تحریریں لاپتہ ہوگئیں'' (۳۲) ساتھ ہی ایک نئی زندہ جنگی مشین نمودار ہوگئی یہ گھوڑ سوار مسلّح شخص تھا جو اپنے وقت میں ہمارے ٹینک یا طیارے کا سا اثر رکھتا تھا۔ اور کرگنوں کی تباہ کاریوں کے پیچھے ہم جنگجو سرداروں کی مخصوص قبریں پاتے ہیں جو ان کی عورتوں اور بچوں کی قربانی، ان کے جانوروں کی قربانی اور ہتھیاروں سے گھری ہوئی مردہ سرداروں کی لاشوں سے بھری ہوئی تھیں۔ (۳۳)

۱۹۶۰ اور ۱۹۷۰ کے عشروں کی کھدائیوں سے پہلے اور گمبوٹس کی فراہم کردہ قدیم وجدید معلومات یکجا کرنے کے کارناموں کی روئداد سے پہلے، ''وی گورڈن چائلڈ'' نے اسی عمومی پیرائے میں اپنی تحقیق پیش کی ہے۔ وہ قدیم یورپین ثقافت کو ایسی ''پُرامن'' اور ''جمہوری'' روایات کی حامل قرار دیتا ہے جس میں معاشرے کی ساری دولت سمیٹنے والے سرداروں کی طرف ہلکا سا اشارہ بھی نہیں ملتا۔ (۳۴) مگر پھر وہ بتاتا ہے کہ رفتہ رفتہ وہ سب کچھ کیسے بدل گیا کہ جنگ وجدل کی نوبت آگئی اور خصوصاً دھات کے ہتھیاروں کا استعمال شروع ہوگیا۔

گمبوٹس کی طرح چائلڈ بھی لکھتا ہے کہ کھدائیوں کے دوران جتنی زیادہ تعداد میں ہتھیار برآمد ہوتے ہیں، اتنی ہی بڑی تعداد میں سرداروں کے مقبرے اور مکانات ملتے ہیں۔ یہ واضح طور پر سماجی طبقہ بندی کی شہادت ہے جس میں مضبوط ترین افراد کی حکمرانی ایک مروّجہ طریق کار سامنے آتی ہے۔ چائلڈ کے مطابق ''اکثر آبادیاں پہاڑیوں کی چوٹیوں پر واقع تھیں۔ یہ آبادیاں اور وادیوں میں قائم آبادیاں ''اکثر قلعہ بندیوں'' کی شکل میں ہوتی تھیں۔ مزید برآں اس نے اس بات پر بھی زور دیا کہ ''جونہی زمین کے لئے جاری مسابقت

MashalBooks.org

نے مخاصمانہ کردار اختیار کیا کلہاڑا جنگ وجدل کا خصوصی ہتھیار بن گیا''۔ یورپی معاشرے کے نہ صرف سماجی نظم میں بلکہ نظریاتی نظم میں بھی ایک بنیادی تبدیلی آگئی۔ (۳۵)

وہ اس سے بھی زیادہ تخصیص کے ساتھ بیان کرتا ہے کہ ''اس طرزعمل کے منطقی نتیجے میں جیسے نسوانی مورتیاں غائب ہوگئیں جنگ وجدل ایک عام چلن بن گیا۔'' وہ کہتا ہے کہ یہ نسوانی مورتیاں جو جگہ جگہ پائی جاتی تھیں ''اب کہیں بھی نمایاں نہیں ہیں''۔ پھر وہ اس نتیجے پر پہنچتا ہے کہ ''ہوسکتا کہ یہ صورتحال معاشرے کے نظم کی شجرہ مادری سے شجرۂ پدری میں تبدیلی کی عکاسی کرتی ہو''۔ (۳۶)

گمبوٹس اس سے بھی زیادہ وضاحت کے ساتھ اپنا موقف پیش کرتی ہے۔ قدیم یورپی تواریخ کے بنظر غائر مطالعہ، اپنے اور دیگر ماہرین آثاریات کے مشاہدات کی بنیاد پر بڑی دقتِ نظر سے وہ بیان کرتی ہے کہ حملوں کی ہرنئی لہر اپنے ساتھ نہ صرف مادی تباہی وبربادی لے کر آئی بلکہ بقول مؤرخین کے ثقافتی افلاس ودیوالیہ پن بھی لائی۔ حملہ نمبر ایک کی لہر سے ہی اتنی بڑی تباہی مچی تھی کہ قدیم یورپی آبادکاریوں(Settlements) کے خال خال حصے ہی بچ سکے تھے مثلاً اولٹینیا کی ڈینیوب آبادی کا ''کوٹوفینی کمپلیکس''، مغربی اور شمال مغربی ''منٹینیا'' اور ''بنات'' اور ''ٹرانسیلوینیا'' کا جنوب محفوظ رہ گئے مگر یہاں بھی خاصی تبدیلیوں کے نشانات ہیں، جن میں دفاعی طور پر کھدی ہوئی خندقوں اور دفاعی چار دیواریوں کے صرف آثار شامل ہیں۔ (۳۷)

قدیم یورپی آبادکاریوں کی اکثریت کے لئے کرگوں کے حملے گمبوٹس کے الفاظ میں تباہ کن تھے جن میں سے زیرین ڈینیوب کے ''کرانوؤ'' کاشتکار کی تباہی خاص طور پر قابل ذکر ہے ان کے مکانات، خانقاہیں اور انسانی ہنرمندیوں کے کمال نمونے، فنی شاہکار تہس نہس کردیئے گئے، جن کی وحشی حملہ آوروں کی نظر میں کوئی قدروقیمت نہیں تھی۔ ہزاروں افراد تہہ تیغ کر دیئے گئے، یا غلام بنالئے گئے یا انہیں بھاگ جانے پر مجبور کردیا گیا۔ اس کے نتیجے میں آبادی کی ادھر ادھر منتقلی کا سلسلہ در سلسلہ چل نکلا۔ (۳۸)

پھر بقول گمبوٹس ''دوغلی ثقافتوں'' کا ظہور شروع ہوگیا، یہ ثقافتیں قدیم یورپیوں کے باقی ماندہ گروپوں کو مطیع بنانے اور انہیں تیزی سے کرگوں کی خانہ بدوش معیشت اور ہم نسب طبقاتی [پدرسری پر مبنی] معاشروں میں ضم کرلیا گیا۔ (۳۹) لیکن یہ نئی دوغلی ثقافتیں فنی اور

تہذیبی طور پر اپنی پیشروؤں سے بہت کم معیار کی تھیں۔ ان کی معیشت زیادہ تر مویشی پروری پر مبنی تھی اور اگرچہ قدیم یورپینوں کی چند تیکنیکیں پھر بھی پائی جاتی تھیں لیکن ان کی ظروف سازی یورپینوں کی چند تیکنیکیں پھر بھی پائی جاتی تھیں لیکن ان کی ظروف سازی نمایاں طور پر یکسانیت کی شکار اور پست تھی۔ مثال کے طور پر ''سرنوادا III'' کی آبادکاریوں جو کرگوں کے حملہ نمبر ۲ کے بعد رومانیہ میں پائی گئیں ان میں برتنوں پر نقش ونگار یا قدیم یورپ کے علامتی نقوش کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ مشرقی ہنگری اور قدیم ٹرانسلووینیا میں بھی یہی صورت حال پائی جاتی ہے۔ گمبوٹس کے الفاظ میں معاشرتی اکائیوں کا حجم ۳۰ یا ۴۰ افراد پر مشتمل رہ گیا جس سے مویشیوں کے چھوٹے چھوٹے یونٹوں پر مشتمل نوتشکیل شدہ سماجی نظام کا اشارہ ملتا ہے اور ہر طرف قلعہ بندیاں دکھائی دینا شروع ہوگئیں (۴۰) اور ساتھ ساتھ پرانی بے فصیل آبادکاریوں کی جگہ پہاڑیوں پر تعمیر ہونے والے چھوٹے چھوٹے قلعوں نے لے لی۔

اور اس طرح جیسا کہ زمانہ قبل ازتاریخ کی کھدائیاں گواہی دیتی ہیں قدیم یورپ کے آثاریاتی زمینی منظر کی کایا پلٹ گئی۔ حملوں کی ہرلہر کے ساتھ ہم نہ صرف مادی تباہ کاری اور ثقافتی رجعت بڑھنے کے زیادہ سے زیادہ نشانات پاتے ہیں بلکہ ثقافتی تاریخ کی سمت میں بھی بہت تبدیلی آجانے کے نشانات ملتے ہیں۔

جیسے جیسے قدیم یورپین، وحشی حملہ آوروں سے آہستہ آہستہ اپنے دفاع کی ناکام مساعی بروے کار لارہے تھے معاشرے اور نظریۂ حیات دونوں کی نئی تعریفیں ابھر کر سامنے آنا شروع ہوجاتی ہیں۔ اب ہم ہر جگہ سماجی ترجیحات میں تبدیلی کو اس تیر کی طرح دیکھ رہے ہیں جو زمانے کے فاصلوں کو چیرتا ہوا اپنی ایٹمی نوک لئے ہوئے ہمارے عہد میں آپہنچا ہے۔ اس تبدیلی کا رُخ ہلاکت خیزی کی ٹیکنالوجی کو مزید موثر بنانے کی طرف ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ بنیادی آئیڈیالوجی میں بھی تبدیلی واقع ہوئی ہے۔ تیز دھار خنجر کے ذریعے تسلّط حاصل کرنے اور تباہ کرنے کی قوت رفتہ رفتہ اس نظریۂ قوت کی جگہ لے رہی ہے کہ یہ فروغِ زندگی اور پشت پناہِ زندگی کا ذریعہ ہونی چاہیے۔ کیونکہ مسلح فتوحات کی وجہ سے نہ صرف شراکت پر مبنی تہذیبوں کے ارتقا میں رخنہ اندازی ہوئی بلکہ وہ معاشرے جن کا بالکل صفایا نہیں ہوا تھا وہ اب کلیتاً تبدیل بھی ہوچکے تھے۔

اب ہرجگہ ہلاکت خیزی کی سب سے زیادہ طاقت رکھنے والے لوگ اعلیٰ ترین مقام پر پہنچ جاتے ہیں کیونکہ ہرجگہ سماجی ڈھانچہ زیادہ ''مبنی برنظام مراتب'' اور زیادہ تحکم پسندانہ ہوتا ہے اور عورتیں جو جسمانی طور پر کم جسامت اور کم زور ہوتی ہیں اور وہ قدیم نظریۂ اقتدار کے مطابق زندگی دہندہ اور جام زندگی کی علامت ہوتی ہیں اب بتدریج اس حیثیت کی طرف دھکیلی جارہی ہیں جہاں انہیں بالآخر پہنچنا ہے۔ یعنی پیداوار اور باز آفرینی کی ٹیکنالوجیز مرد کے کنٹرول میں رہے گی۔

ساتھ ہی ساتھ ''دیوی'' ازخود اپنے بلند مقام سے بتدریج محض بیوی اور ''دیوتا کی'' معشوق کی سطح پر آرہی ہے جہاں مرد دیوتا قوت واقتدار کی علامات تباہ کن ہتھیاروں یا ''بجلی کے کڑکوں'' کے ساتھ بلند مناصب پر براجمان ہیں خلاصتاً ہم سماجی اور نظریاتی تقلیب کے تدریجی عمل کا اگلے ابواب میں زیادہ تفصیل سے ذکر کریں گے جو تہذیب کی کہانی، زیادہ ترقی یافتہ سماجی اور مادی ٹیکنالوجیز کی اس پیش رفت کی کہانی ہے جو سمر تہذیب سے ہمارے دور تک ہوئی: یعنی تشدد اور تسلّط کی کہانی کے بعد اس کا ذکر آئے گا۔

کریٹ کی تباہی

کریٹ کا پُرتشدد خاتمہ خاص طور پر دلگداز اور سبق آموز ہے۔ کیونکہ یہ یورپ کے قطعۂ عظیم (mainland) کے جنوب میں واقع ایک ایسا جزیرہ تھا جسے کسی وقت مادرِ سمندر نے جنگجوؤں کے لشکروں سے تحفظ دینے کے لئے اپنی آغوش میں لے رکھا تھا۔ لیکن ایسا کب تک رہتا، آخر اس تہذیب کا بھی خاتمہ ہو کر ہی رہا جو تسلط کی بجائے شراکت پر مبنی آخری تہذیب تھی۔

اس خاتمے کا آغاز یورپ کے اس قطعۂ زمین کے نمونے کے مطابق ہوا۔ ''مائسینین'' (Mycenaen) عہد کے دوران جو انڈویورپین ''اکائینوں'' (Achaeneans) کے زیر کنٹرول تھا۔ کریٹ کے آرٹ میں بے ساختگی اور آزادئ اظہار کم ہوگئی۔ اور اب کریٹ کے آثاریاتی ریکارڈ میں یہ واضح طور پر دکھائی دیتا ہے کہ اس میں موت کی اہمیت پر بہت زیادہ زور دیا جانے لگا تھا۔ جیکو ٹاہا کیز لکھتی ہے کہ اکائینوں کے زیراثر آنے سے پہلے اہل کریٹ مزاجاً موت اور رسومِ تدفین کو زیادہ اہمیت نہیں دیتے تھے جبکہ اکائینوں کے طبقۂ اشرافیہ کے

طور طریقے دوسرے تھے۔ (۴۱) اب ہمیں وہاں شاہی خانوادوں اور سرداروں کے مردوں کی تدفین پر دولت اور محنت کا بے پناہ اسراف دکھائی دے رہا ہے۔ سب سے زیادہ نمایاں جو چیز وہاں موجود ہے وہ کچھ تو اکائینوں کے اثرات ہیں اور کچھ براعظم یورپ کی طرف سے حملوں کا ایک اور سلسلہ شروع ہو جانے کا خوف ہے۔ جبکہ فوجی سپرٹ بڑھ جانے کی بھی کھلی نشانیاں ظاہر ہو رہی ہیں۔

کریٹ میں ''مائسینین'' عہد کب اور کیسے شروع اور ختم ہوا بہت متنازعہ موضوع ہے اس کے بارے میں ایک نظریہ ہے کہ ''اکائینوں'' نے خود کریٹ اور یونانی قطعۂ عظیم پر ''منوآن'' نوآبادکاریوں پر ایسے حالات میں قبضہ کیا جب زلزلوں کے پے در پے جھٹکوں اور سمندری لہروں کے مسلسل ٹکراؤ نے ''منوآن'' تہذیب کو اس قدر کمزور کر دیا کہ وہ شمال کی طرف سے بار بار حملہ آور ہونے والے وحشی قبائل کے خلاف مزاحمت جاری نہ رکھ سکی۔ اس میں مشکل یہ ہے کہ ان بحرانوں کے لئے جس زمانے کا ذکر کیا گیا ہے وہ تقریباً ۱۴۵۰ قبل مسیح کا دورانیہ ہے۔ اور اس وقت کریٹ پر مسلح حملے کی کوئی شہادت نہیں ملتی۔ (۴۲) تاہم اگر یہ زلزلوں کے بعد فی الواقعہ ایک فتح تھی، فوجی بغاوت تھی یا اکائینوں کے سرداروں نے کریٹ کی شہزادیوں سے شادیاں کر لی تھیں اس کا کوئی پتہ نہیں۔ البتہ ہم یہ ضرور جانتے ہیں کہ کریٹی تہذیب کی آخری صدیوں کے دوران یہ جزیرہ یونانی زبان بولنے والے اکائینی بادشاہوں کے غلبے تلے آ گیا تھا۔ اور اگرچہ ان لوگوں نے مینوآنوں کے زیادہ مہذب طور طریقے اختیار کر لئے تھے اور وہ اپنے ہمراہ سماجی اور نظریاتی نظم وضبط بھی لائے تھے جن میں زندگی سے زیادہ موت سے متعلق باتیں تھیں۔

مائسینین عہد کے بارے میں ہمارا کچھ علم "Linear-B" تختیوں سے ماخوذ ہے جو کریٹ اور یونانی قطعۂ ارضی سے دریافت ہوئی تھیں، ان کی رمزی تحریروں کو اب قابلِ فہم بنا دیا گیا ہے۔ ''ناسوس'' اور ''پائلوس'' (یونان کے جنوبی کونے پر ایک نو آباد کاری) سے ملنے والی تختیوں پر ان کے دیوتاؤں کے نام لکھے ہوئے ہیں۔ اس صورت میں ان لوگوں کو یقیناً بہت اطمینان ہو جائے گا جو عرصۂ دراز سے یہ دعویٰ کر رہے تھے کہ کریٹ اور کلاسیکی یونان کے درمیان ایک تسلسل پایا جاتا ہے۔ ان تختیوں سے منکشف ہوتا ہے کہ دورِ متاخر کی اولمپیئن الوہی ہستیوں (زیئس، ہیرا، ایتھنا اور ہرمس وغیرہ) کی صدیوں پہلے سے پرستش ہو رہی

تھی، البتہ ان کی شکلیں اور سیاق وسباق مختلف تھے، شعرائے یونان ''ہیسیوڈ'' (Hesiod) اور ہومر (Homer) سے ہم نے بہت بعد جاکر ان کا ذکر سنا۔ (۴۳) ان آثاریاتی شواہد کے ساتھ ساتھ یہ تختیاں بھی وہی بتاتی ہیں جیسے جیکوٹا ہاکیز کہتی ہے ''کریٹ اور اکائین دیویوں اور دیوتاؤں کے درمیان متوازن ازدواجی رشتے قائم تھے'' (۴۴)

لیکن منوآن اور اکائین کلچر کے درمیان یہ مائسنین رشتۂ ازدواج بہت مختصر المیعاد تھا۔ پائلوس سے ملنے والی تختیوں میں سے بہت سی تختیاں جیکوٹا ہاکیز کے الفاظ میں ''تباہ کاریوں کا رُخ موڑنے کی ناکام کوششوں کے دوران امن کے آخری دنوں میں حاصل کی گئی تھیں''۔ پتہ چلتا ہے کہ مائسینین بادشاہ کو پیشگی وارننگ مل چکی تھی کہ پائلوس پر حملہ ہونے والا ہے۔ ہاکیز لکھتی ہے کہ ''ہنگامی صورتحال کا کسی اضطراری کیفیت کے بغیر سامنا کیا گیا، کلرک اپنے بنچوں پر بدستور بیٹھے رہے اور رونما ہونے والے واقعات کو ریکارڈ کرتے رہے'' ملاّحوں کو دفاعی بیڑہ فراہم کرنے کا حکم دے دیا گیا معماروں کو بھی بھیج دیا گیا تاکہ وہ طویل ساحل کے غیر محفوظ حصوں پر قلعہ بندیاں تعمیر کرنا شروع کردیں۔ سپاہیوں کو مسلح کرنے کے لئے تقریباً ایک ٹن کانسی اکٹھی کی گئی اور کانسی کے دو ہزار ماہرین جمع کرلئے گئے۔ حتیٰ کہ دیوی کی خانقاہوں میں لگی ہوئی کانسی بھی اتار لی گئی تاکہ وہ دفاع کے لئے استعمال ہوسکے ہاکیز کہتی ہے ''یہ حالتِ امن کے جنگ میں تبدیل ہونے کے بحران کی ایک دلگداز شہادت ہے'' (۴۵)

لیکن یہ سب کچھ بے سُود رہا۔ ہاکیز لکھتی ہے ''اس امر کا کوئی نشان نہیں کہ جن دیواروں کی اشد ضرورت تھی وہ بلند نہ ہوسکیں، تختیوں سے، جو بادشاہت کو بچانے کی مساعی کو ریکارڈ کرتی ہیں، ایک محقق کو شاہی ہال کے ڈھانچے کی طرف رجوع کرنا چاہیے تاکہ یہ معلوم ہوسکے کہ یہ کیوں ناکام رہا۔ وحشی جنگجو حفاظتی انتظامات کو توڑ کر اندر گھس گئے وہ روغن شدہ کمروں اور ان کے اندر موجود خزانوں کو دیکھ کر یقیناً ششدر رہ گئے ہوں گے...... جب انہوں نے لوٹ مار ختم کرلی تو انہیں عمارت اور اس کے اندر موجود غیر جنگجویانہ ساز وسامان اور غیر ملکی اندازِ تزئین وآرائش سے کوئی سروکار نہیں تھا، چنانچہ انہوں نے آگ لگادی، سارا ہال ایک آتش دان کی طرح جل اٹھا۔ اس سے اتنی حرارت پیدا ہوئی کہ اندر پڑے ہوئے ظروف پگھل گئے جبکہ پتھر جل کر چونا بن گئے۔ سٹور رومز اور ٹیکس آفس کے اندر غیر مستعمل

شدہ پتھر کی تختیاں جل کر سخت ہوگئیں جس کی وجہ سے وہ ہمیشہ کے لئے محفوظ ہوگئیں'' (۴۶)

اور اس طرح یونانی قطعۂ زمین اور جزیرے، دونوں یکے بعد دیگرے تباہ ہوگئے اور کریٹ میں اس تہذیب کی کامیابیاں جو ثقافتی ارتقا کے نقطہ عروج پر پہنچنے کے باعث حاصل ہوئی تھیں برباد ہوگئیں۔ گمبوٹس ہاکیز لکھتی ہے ''غالباً کہانی ہر جگہ ایک ہی تھی جیسے مائسنین، ٹریانز اور تمام دیگر شاہی قلعوں میں واقعات رونما ہوئے۔ ماسوائے ایتھنز کے، سب کو وحشیوں کی لہر اپنے ساتھ بہالے گئی۔ یونانی زبان بولنے والی اقوام ڈوریز نے آرکیڈیا کو چھوڑ کر سارے پلوپیز پر قبضہ کر کے کریٹ، رہوڈز اور تمام ملحقہ جزیروں کو فتح کر لیا، سب سے زیادہ زد پذیر نوسس کے شاہی محلات تھے، جو غالباً سب سے آخر میں تاراج کئے گئے'' (۴۷)

گیارہویں صدی قبل مسیح میں سب کچھ ختم ہوگیا۔ تمام لوگ پہاڑوں پر چلے گئے جہاں سے انہوں نے ڈورین آبادکاریوں کے خلاف کچھ عرصہ تک چھاپہ مار جنگ جاری رکھی، بالآخر کریٹ کی آخری مزاحمت بھی دم توڑ گئی۔ (۴۸) تارکینِ وطن کے ہجوم کے ساتھ وہ سپرٹ، جس نے کبھی کریٹ کو عظمت بخشی تھی، وہ ختم ہوگئی، ہومر کے الفاظ میں ''ایک ثروت مند پیاری سرزمین'' کے باسی اس جزیرے سے فرار ہوگئے۔ جو اتنے طویل عرصے تک ان کا گھر رہا تھا (۴۹) وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ منوآن کریٹ کی پُراعتماد عورتوں اور مردوں کا وجود بھی فراموش ہونے جارہا تھا جیسا کہ امن، موجدانہ صلاحیتیں، قوتِ تخلیق اور دیوی کی زندگی بخش قوتیں سب بھلادی گئیں۔

ایک منتشر ہوتی ہوئی دنیا

تقریباً تین ہزار سال پہلے ہونے والے سقوطِ کریٹ کو ایک عہد کا خاتمہ کہا جاسکتا ہے۔ یہ ایک ایسا خاتمہ تھا۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں اس کا آغاز ہزاروں برس پہلے ہوا تھا۔ اندازاً ۴۳۰۰ یا ۴۲۰۰ قبل مسیح میں یورپ میں شروع ہوتی ہوئی قدیم دنیا لگاتار وحشیانہ حملوں کے صدمے برداشت کرتی آئی تھی۔ تباہی اور انتشار کے ابتدائی عرصے کے بعد بتدریج ایسے معاشرے ابھرتے رہے جن کی یادیں ہم اپنے سکول وکالج کی نصابی کتابوں میں پڑھتے ہیں کیونکہ وہ مغربی تہذیب کی شروعات کا پتہ دیتے ہیں۔

لیکن اس کی مبینہ طور پر شاندار اور پُرعظمت شروعات کے اندر ایک دراڑتھی جو ہمارے زمانے میں آ کر ایک مہیب ترین غار میں بدل گئی۔ ہمارا فنیاتی سماجی اور ثقافتی ارتقا ہزاروں برس اوپر کی جانب حرکت جاری رکھنے کے بعد منحوس ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہوتا دکھائی دے رہا تھا۔ اُس زمانے میں زمین کی تُندوتیز جنبشوں کے باعث پیدا ہونے والے گہرے شگافوں کی طرح ایک طرف ہمارے فنیاتی اور سماجی ارتقا اور دوسری طرف ہمارے ثقافتی ارتقا کے درمیان رخنہ باقاعدگی سے وسیع ہوتا چلا جائے گا۔ ڈھانچے اور طریق کار میں بڑے پیمانے کی پیچیدگی کی جانب فنیاتی اور سماجی تحرک شروع ہو چکا ہے لیکن ثقافتی ارتقا کے امکانات میں رخنہ پڑتا دکھائی دے رہا ہے، جس کے آگے جا کر ایک تسلط مزاج معاشرے کی قیدوبند میں جکڑے جانے کا امکان ہے۔ (۵۰)

اب ہر جگہ معاشرہ مرد کی بالادستی، نظامِ مراتب اور جنگ پسندی پر استوار ہو رہا تھا۔ اناطولیہ جہاں کٹل ہویوک کے لوگ ہزاروں سال امن کی زندگی گزارتے رہے تھے ان پر حتیوں نے، جن کا ذکر بائیبل میں ایک انڈویورپین قوم کے طور پر آیا ہے، قبضہ کر لیا۔ اور اگرچہ ان کی آثاریاتی باقیات (جیسے نیر ہلکایہ کی عظیم خانقاہ) بتاتی ہیں کہ وہاں دیوی کی اب بھی پرستش کی جاتی ہے۔اب دیوی کی حیثیت کم کر کے اسے بیوی یا جنگ اور گرج چمک کے نئے مرد دیوتاؤں کی ماں کے مقام پر لا کھڑا کر دیا گیا۔ یورپ، میسوپوٹیمیا اور کنعان میں نمونہ ایک ہی قسم کا تھا۔ نہ صرف دیوی عظیم تر نہ رہی تھی بلکہ اسے جنگ کی سرپرست ظاہر کرنے کا بھی بندوبست کیا جانے لگا تھا۔

بلاشبہ ان دہشت ناک زمانوں میں زندگی گزارنے والوں کو یہ اگرچہ واقعی ایک جنت لگتی ہوگی جو کبھی سخی ان داتا دیوی کا مسکن ہوتی تھی، اس پر انسانیت دشمن مافوق الفطرت قوتوں نے روئے زمین پر ان کے ظالم نمائندوں سے اتحاد کر کے قبضہ کر لیا تھا۔ نہ صرف ''خدائی حکم'' کے تحت مقرر شدہ آہنی بازوؤں والے حاکم کا راج اور ہر طرف برپا جنگ وجدل ایک طرزِ زندگی تھا۔ اس بات کی بھی کافی شہادت ملتی ہے کہ ۱۵۰۰ سے ۱۱۰۰ قبل مسیح تک غیر معمولی طور پر شدید مادی اور ثقافتی انتشار برپا رہا تھا۔

یہی زمانہ تھا جس میں آتش فشاں پہاڑ مسلسل آگ اگلنے لگے، اور زلزلوں اور طوفانی موجوں نے بحیرۂ روم کی دنیا کو درہم برہم کر دیا جو بعدازاں پھر مرتّب ہو گیا۔ بس یہی

اٹلانٹس کی کہانی ہے کہ پورا براعظم اس ناقابل تصوّر اور تباہ کن قدرتی آفت سے دوچار ہونے کے بعد ازروئے قیاس غرق ہوگیا تھا۔

ان قدرتی ہیبتناکیوں کے بعد انسان کو اس کے اپنے پیدا کردہ خوف وہراس نے آلیا۔ شمال سے یونانی زبان بولنے والی قومیں دھکم پیل کرتی ہوئی یورپ کے اندر دور تک گھس گئیں۔ بالآخر یونان اور پھر یہاں تک کہ کریٹ بھی آہنی ہتھیاروں سے لیس لشکروں کا یلغار کے سامنے نہ ٹھہر سکے۔ اناطولیہ میں جنگجو ''حتیوں'' (Hittites) کی سلطنت نئے حملہ آوروں کے دباؤ کی تاب نہ لا کر ڈھیر ہوگئی اور اس کے بدلے ''حتیٰ'' جنوب کی طرف شام میں جا گھسے۔ سرزمینِ بحیرۂ روم بھی اسی عہد میں بے دخل شدہ لوگوں کے سمندر اور خشکی کی طرف سے حملوں کی شکار ہوگئی۔ ان حملہ آوروں میں وہ فلستی بھی شامل تھے جن کی کہانیاں ہم بائیبل میں پڑھتے ہیں۔

جنوب میں اب سلطنتِ الشوریہ اچانک زور پکڑ کر عالمی طاقت بن گئی اور اس کے لشکر فربجیہ، شام، فونیقہ اور حتیٰ کہ اناطولیہ کو بھی روندتے ہوئے مشرق میں زاگروس میں جا داخل ہوئے۔ ان کی انتہائے وحشت وبربریت کی جھلک آج بھی ''بیس ریلیف'' کے ابھرواں نقوش میں دیکھی جا سکتی ہے۔ یہ دور متاخر کے الشوری بادشاہ "Tiglath-pileser" کی منقش یاداشتوں میں محفوظ کی گئی ہے۔ یہ ظالم بادشاہ جن لوگوں کو ''مجرم'' قرار دیتا تھا انہیں زندہ سلاخوں میں اس طرح پرویا جاتا کہ سلاخیں نیچے سے داخل کی جاتیں جو جسم کو چیرتی ہوئی کندھوں میں سے جا نکلتیں۔

جنوب سے پرے مصر میں بھی اثرات نظر آتے ہیں جیسا کہ ''خط تصویر'' میں حملہ آوروں کو ''سمندر کے لوگ'' لکھا گیا جنھوں نے گیارہویں صدی قبل مسیح کے آغاز میں دریائے نیل کے ''دوشاخہ'' (Delta) پر قبضہ کرنے کی کوشش کی، انہیں رعمیسس III نے شکست دی تھی۔ لیکن ہم انہیں اب بھی ''تھیبس'' کے کفن دفن کے معبدوں میں دیواری تصویروں میں دیکھ سکتے ہیں جن میں وہ جہازوں، رتھوں اور بیل گاڑیوں میں یا پیدل بمعہ اہل خاندان گزرتے دکھائی دیتے ہیں۔

کنعان میں بائیبل کے سکالرز کی تحقیق کے مطابق ہجرت کرنے والوں کی تین لہریں تھیں۔ عبرانی قبیلے (جواب قبیلۂ لاوی کے جنگجو پادری کے طور پر معروف ہیں) نے جنگِ

فتوحات کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ [۵۱] جیسا کہ ہم اب بھی بائیبل میں ان کا تذکرہ پاتے ہیں۔ باوجودیکہ ان کے خدائے جنگ ''جیہوواہ'' نے انہیں فتح دلانے کا وعدہ کیا تھا مگر انہیں اہل کنعان کی مزاحمت پر قابو پانے میں سینکڑوں برس لگ گئے۔ بائیبل میں اس کی الگ الگ طریقوں سے وضاحت کی گئی ہے۔ مثلاً یہ کہ خدا نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ وہ اپنے بندوں کو جنگ کی مشق کے مواقع مہیا کرے گا، ان کی آزمائش کرے گا اور سزا دے گا یا کاشت شدہ رقبے کو ویران ہونے سے بچائے گا تاوقتیکہ حملہ آوروں کی تعداد کافی بڑھ جائے۔ [۵۲] جیسے کہ اس کو ہم بائیبل کی کتاب گنتی، میں ۳:۳۔۶ میں پاتے ہیں کہ آزمائش یہ تھی ''وحی خداوندی سے سرشار حملہ آوروں کو'' ہر شہر میں مردوں، عورتوں اور بچوں کو بالکل تباہ کرنے کی مشق کرائی جائے''

قدیم دنیا کے ہر حصے میں آبادیاں، آبادیوں کے خلاف صف آراء تھیں۔ مرد عورتوں اور دیگر مردوں کے مدمقابل کھڑے تھے۔ یہ سب لوگ منتشر ہوتی ہوئی دنیا کے طول وعرض میں پھیلے ہوئے جتھوں کے جتھے اپنے آبائی وطن سے فرار ہو رہے تھے اور اندھا دھند دوڑے جا رہے تھے کہ کہیں انہیں جائے پناہ نصیب ہو سکے۔

مگر نئی دنیا میں ایسی کوئی جگہ نہیں رہ گئی تھی کیونکہ یہ اب ایک ایسی دنیا تھی جس میں دیوی کو اور انسانیت کے نصف حصے کو متشددانہ طریقے سے کلی طور پر محرومِ اقتدار کر دیا گیا تھا، اور اقتدار دیوتاؤں اور جنگجو مردوں کے ہاتھ آچکا تھا۔ یہ وہ دنیا تھی جس میں آئندہ خنجر (Blade) کو، نہ کہ جام (Chalice) کو، حاکمیت اعلیٰ حاصل ہوگی۔ یہ ایسی دنیا ہوگی جس میں امن وآہنگی کی زندگی گزارنے کے زمانے کہانیوں اور افسانوں میں تلاش کرنا پڑیں گے۔

MashalBooks.org

باب5

بھولے بسرے زمانے کی یادیں: دیوی کا ورثہ

رومن ایمپائر کا سقوط ، تاریک ادوار، طاعون کی وبا، جنگ عظیم اوّل ودوم اور بظاہر بدنظمی کے دیگر ادوار کے واقعات جن سے ہم آگاہ ہیں، ان کا موازنہ اگر اس واقعے سے کیاجائے جوایک وقت رونما ہوا تھا جس کے بارے میں ہماری معلومات بہت کم ہے تو ان گزشتہ واقعات کی اہمیت بہت گھٹ جاتی ہے: وہ واقعہ ہمارے زمانۂ تاریخ سے قبل کے ارتقائی چوراہے سے تعلق رکھتا ہے جب انسانی معاشرہ ایک زبردست تقلیب (transformation) سے دوچار ہوگیاتھا۔اب ہزاروں برسوں کے بعد ہم ایک دوسری عظیم تقلیب کے قریب پہنچنے والے ہیں...... اب کی بار ایک تسلّط پرمبنی معاشرہ، شراکت پرمبنی معاشرے کی ایک مزید ترقی یافتہ شکل میں تبدیل ہورہا ہے...... ہمیں اپنے ضائع شدہ ماضی کے اس حیرت انگیز حصے کے بارے میں سب کچھ جان کر آگے بڑھنا چاہیے کیونکہ اس دوسرے ارتقائی چوراہے پر ہمارا بہت کچھ داؤ پر لگنے والا ہے۔ اس لئے کہ ہمارے پاس اس وقت ایسی ایسی ٹیکنالوجیز آچکی ہیں جو سب کچھ ملیامیٹ کرسکتی ہیں، ماضی میں ایسی تباہ کاریوں کو خدا سے منسوب کیا جاتا تھا۔ اب ہماری تمام انواع اور متاع کی بقا کا مسئلہ پیدا ہوچکا ہے۔

تاہم اس وقت بھی جب ہزارں سال کی انسانی تاریخ کے بارے میں نئی تحقیق، نئی آثاریات اور معاشرتی سائنسز کی جانب سے اس کی توثیق ان سب باتوں کی تردید کرتی ہے جوہمیں سکھائی یا پڑھائی گئی ہیں اس تردید کا ہمارے ذہنوں پر اثر،ریت پر لکھے ہوئے پیغام

کی طرح ہے، نیا علم ایک آدھ دن کے لئے یا حتیٰ کہ ایک ہفتہ تک بھی رہ سکتا ہے لیکن صدیوں سے پڑھے ہوئے علوم اس کی بنیادوں کو اتنے زوردار طریقے سے کھود دیتے ہیں کہ جو کچھ ذہنوں میں باقی رہ جاتا ہے وہ ہیجان اور امید کے محض ایک لمحۂ گزراں کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ صرف دیگر منابع (مانوس اور غیر مانوس، دونوں) سے ملنے والی کمک کی بدولت ہی ہوسکتا ہے کہ ہم اس علم کو اتنی دیر تک ذہن میں رکھیں کہ یہ ہمارا اپنا علم بن جائے۔

ارتقا اور تقلیب

اس کمک کا ایک ذریعہ یا منبع وہ ہے، جیسا کہ ہم کہہ چکے ہیں کہ وہ نظاموں کے استقلال اور نظاموں کے تغیرات کی نئی سائنسی تحقیق ہے۔ یہ حال ہی میں جنم لینے والی جانکاریوں کا مجموعہ ہے جسے عام طور پر ''نئی طبیعات'' اور بعض اوقات ''نظریۂ خود انتظامی'' یا ''نظریۂ انتشار'' کہا جاتا ہے۔ یہ مجموعہ پہلی بار ہمیں اس شعور کے لئے ایک فریم ورک مہیا کرتا ہے کہ زمانہ قبل از تاریخ میں ہمارے ساتھ کیا ہوا اور اب ذرا مختلف انداز میں دوبارہ ہمیں کیا کچھ پیش آ سکتا ہے۔اس نئے ذہنی تصور کے فریم ورک کے تناظر کے اندر، جیسا کہ نظریۂ ثقافتی تقلیب میں مشمول ہے، ہم جن چیزوں کا جائزہ لیتے رہے ہیں وہ سماجی حرکیات (social dynamics) کے دو پہلو ہیں۔ اوّلین پہلو کا تعلق سماجی یا معاشرتی استحکام سے ہے ...... کہ ہزاروں برس پہلے کے انسانی معاشرے ایسے انداز میں منظّم تھے جن کی ہیتِ تنظیمی اس سے بالکل مختلف تھی جیسی کہ ہمیں پڑھائی گئی تھی کہ تمام انسانی نظام کیسے تشکیل پاتے ہیں۔ دوسرے پہلو کا تعلق اس بات سے ہے کہ سماجی نظام دیگر نظاموں کی طرح بنیادی تبدیلیوں میں سے کیسے گزرتے ہیں اور گزر سکتے ہیں۔

پچھلے باب میں ہم نے اپنے ثقافتی ارتقا میں پہلی عظیم تبدیلی کی حرکیات کا جائزہ لیا ہے: کہ کسی نظام میں عدم توازن یا انتشار برپا رہنے کے عرصے کے بعد نازک دوشاخہ (critical bifurcation) وجود میں آنے کا ایک نقطہ ہوتا ہے جس میں سے ایک سراسر مختلف نئے نظام کا ظہور ہوا۔ ہم نظاموں کی اس اولین تقلیب میں جتنی چیزیں پائیں گے وہ اس امر کی بصیرت عطا کریں گی کہ بنیادی نوعیت کی ہلچل یا ''کلی انتشار'' والی تبدیلی کے زمانے میں کیا کچھ برپا ہوتا ہے۔ یہ بصیرت نہ صرف ماضی بلکہ ہمارے حال اور مستقبل کی بھی توضیح

MashalBooks.org

کردے گی۔

پھر بھی کوئی یہ پوچھ سکتا ہے کہ شراکت پر مبنی معاشرے سے تسلط پر استوار معاشرے میں تبدیلی ہماری نوع کے دورِ متاخر میں رونما ہوئی تو کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ تسلّط کا نظام پھر آگے کی طرف کا ارتقائی قدم ہے؟ یہاں ہم ان دونقاط کی طرف واپس جاتے ہیں جن کا ذکر ''تعارفِ کتاب'' میں کیا گیا تھا۔ پہلا نقطہ ''ارتقا'' کی اصطلاح کا سوءِفہم پر مبنی استعمال ہے۔ اس کی ''بیانیہ'' وضاحت اور ''مبنی پر معیار'' وضاحت، ان دونوں کو صحیح طور پر سمجھنے کی ضرورت ہوگی۔ بطور ایک لفظ کے یہ اس امر کی وضاحت کرتا ہے کہ ماضی میں کیا ہوا تھا۔ اور بطور ایک اصطلاح یہ ''زیریں'' سے ''اعلیٰ'' سطح کی طرف منتقلی کی نشاندہی کرتی ہے (جس میں یہ رائے مضمر ہے کہ جو کچھ بعد میں رونما ہوا وہ یقیناً بہتر تھا) دوسرا نقطہ یہ ہے کہ ہمارا فنیاتی ارتقا بھی خطِ مستقیم میں اوپر کی جانب نہیں تھا بلکہ یہ عمل باربار رونما ہونے والے تعطل کی صورت میں جاری رہا۔

ہم ایک اور مساوی طور پر اہم نقطے کی طرف بھی واپس آتے ہیں: یہ ہے ثقافتی اور حیاتیاتی ارتقا کے درمیان اساسی فرق کا مسئلہ۔ حیاتیاتی ارتقا میں لازماً رونما ہونے والی چیز جسے سائنسدان"speciation" (نوع بندی) کہتے ہیں یعنی عملِ ارتقا کے دوران زندگی کی مزید پیچیدہ اشکال کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ اس کے برعکس انسانی ثقافت کا ارتقا اعلیٰ درجے کی ''ایک'' نوع.... ہماری نوع.... سے متعلق ہے جس کی دومختلف شکلیں ہیں: نر اور مادہ۔

یہ انسانی دوشکلیت(dimorphism) یا اختلاف، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں ہماری سماجی نظم بندی کے احتمالات پر ایک بنیادی بندش کی حیثیت رکھتا ہے، جس کی بنیاد یا تو انسانیت کے دو نصفوں(two halves) کی ''درجہ بندی'' پر رکھی جاسکتی ہے یا ''ارتباط'' عمل پر۔ ایک نازک فرق، جس پر ضرور زور دیا جانا چاہیے، یہ ہے کہ نتیجے کے طور پر ظہور پذیر ہونے والی اشکال (ماڈلز) میں سے ہر ایک فنیاتی اور سماجی ارتقا کی ایک منفرد نوعیت رکھتی ہے۔ نتیجتاً ہمارے ثقافتی ارتقا کی ''سمت'' (اس خصوصیت کے لحاظ سے کہ کیا یہ پُرامن ہوگا یا جنگجو) کا انحصار اس پر ہوگا کہ ان دو احتمالی شکلوں(models) میں سے کون سی شکل ارتقا کی رہنما ہے۔

ہمارا سماجی اور فنیاتی ارتقا پہلے ایک شراکت پر مبنی معاشرے اور بعد میں تسلّط پر مبنی معاشرے کے تحت سادہ سطح سے زیادہ ترقی یافتہ پیچیدہ سطح تک جاسکتا ہے اور جیسے کہ ہم نے

دیکھا، یہ گیا ہے۔ تاہم ہمارا ثقافتی ارتقا جو اعلیٰ فنیاتی اور سماجی پیچیدگی کے ''استعمالات'' کی رہنمائی کرتا ہے، ہر ماڈل کے لئے بنیادی طور پر علیحدہ علیحدہ ہے۔ اور ثقافتی ارتقا کی یہ سمت ہمارے سماجی اور فنیاتی ارتقا کی سمت پر بہت زیادہ اثر انداز ہوتی ہے۔

اس کی واضح ترین مثال ٹیکنالوجی ہے۔ شراکتی نمونے کی ثقافتی رہنمائی کے تحت ٹیکنالوجی برائے پُرامن مقاصد پر زیادہ زور دیا جاتا تھا لیکن تسلّط نمونے کے ظہور کے بعد رُخ پورے طور پر ٹیکنالوجی برائے بربادی اور غلبہ کی طرف ہوگیا۔ جو صدیوں سے بڑھتے بڑھتے ہمارے خطرناک زمانے میں آدھمکا ہے۔

چونکہ ہم تاریخ پر معاشرے کے شراکتی یا غلبہ ماڈل کی اصطلاحوں کے حوالہ سے غور کرنے کے عادی نہیں ہیں (جو کہ ہمارے ماضی، حال اور مستقبل کی شکل طے کرتے رہے اور آئندہ بھی کریں گے) لہٰذا ہمارے لئے یہ دیکھنا مشکل ہے کہ ان دو ماڈلوں کا ہمارے ثقافتی ارتقا پر کیا اثر پڑنے والا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری ثقافتی سمت میں تبدیلی کے لئے پانچ ہزار برس پہلے ایک توثیقی منبع اتنی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ نظریہ ''انتشار'' کے برعکس یہ دوسرا منبع ہرگز نیا نہیں ہے۔ دراصل یہ ایسی چیز ہے جسے ہم پہلے سے جانتے ہیں، یہ ہمارے ذہنوں میں بہت پہلے پیوست کردی گئی تھی: یہ مغربی تہذیب کی مقدس، سیکولر اور سائنسی مائتھالوجی کا گودام ہے جسے اب صرف قدیم اور بہتر ماضی کی حقیقت کے اظہار سے ہی دیکھا جاسکتا ہے۔

ایک سنہری نسل اور اطلانتہ کا افسانہ

مغربی مؤرخین جس دور کو ''یونانی تاریک دور'' کہتے ہیں، وہ یونانی زبان بولنے والے حبشیوں کے حملوں کے تین یا چار سو سال کے بعد کا زمانہ تھا، اس زمانے کے اواخر میں یونانی شاعر ''ہسیوڈ'' لکھتا ہے کہ ایک ''سنہری نسل ہوا کرتی تھی، تمام اچھائیاں انہی میں تھیں، ثمر آور زمین اپنے ڈھیروں ثمرات ان پر نچھاور کرتی رہتی تھی۔ وہ اپنی پُرامن آسائشوں کی بدولت اپنی زمینوں کو اچھی حالت میں رکھتے، ان کے خوب پلے ہوئے موٹے تازے مویشیوں کے گلّے تھے اور وہ لافانی ہستیوں کو بہت پیارے لگتے تھے''(1)

لیکن اس نسل کے بعد وہ آئے جنہیں ہسیوڈ ''پاک روحیں'' اور ''دافعین شر'' کہتا ہے

پھر ایک نسبتاً کم درجے کی ''چاندی کی نسل'' آئی، جن کی جگہ بعدازاں ''کانسی کی نسل نے لے لی۔ جوکسی طرح بھی چاندی والوں کی طرح خوفناک اور قوی الجثہ نہیں تھی۔ یہ بادکشوں میں سے نکلنے والی راکھ کی طرح برآمد ہوئی''۔ ہسیوڈ عہد کانسی کے ''اکائینوں'' کا ذکر کرتے ہوئے لکھتا ہے کہ یہ لوگ اپنے ساتھ جنگ لے کر آئے۔ ''ایریز دیوتا کی تمام قابل مذمت بداعمالیاں ان کا اصل مشغلہ تھیں''۔ یہ اپنی دوپیشرو اقوام سے بالکل مختلف تھے انہیں پُرامن زراعت پیشہ لوگوں سے دور کا واسطہ بھی نہیں تھا۔ ''وہ اناج کھانے والے نہیں تھے، ان کا دل سنگ چقماق جیسا سخت تھا۔ یہ ہار نہ ماننے والے اور ناآشنائے شکست لوگ تھے'' (۲)

جان منسلے رابنسن ہسیوڈ کی نوشتہ تیسری ''مردوں کی نسل'' پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے ''ہم جانتے ہیں کہ یہ لوگ کون تھے۔ یہ تقریباً ۲۰۰۰ برس قبل مسیح میں شمال کی جانب سے کانسی کے ہتھیاروں سے لیس ہوکر آئے اور یہاں ایک بڑے قطعۂ ارضی پر آکر آباد ہوگئے۔ انہوں نے بڑے بڑے مائیکنی قلعے تعمیر کئے تھے اور اپنے پیچھے......Linear B رسم الخط میں لکھی ہوئی دستاویزات چھوڑ گئے۔ جو ہمارے خیال میں یونانی زبان کی کوئی قدیم شکل تھی...... ہم ان کے اقتدار کے آثار کریٹ کے جنوب اور ساحل ایشیائے کوچک کے مشرق کی طرف ڈھونڈ سکتے ہیں جہاں انہوں نے بارہویں صدی قبل مسیح کے اوائل میں سٹی آف ٹرائے کو تاراج کیا تھا۔ (۳)

لیکن ہسیوڈ کے خیال میں ''اکائنوں کی اولاد میکانین'' اور وہ لوگ جو انہوں نے فتح کئے تھے، ایک چوتھی اور مختلف ''نسل'' تھی۔ ہسیوڈ لکھتا ہے ''یہ نسل پچھلی نسل سے زیادہ انصاف پرور اور شریف تھی۔ (۴) ہومر کی طرح یہ بھی انہیں قابل ستائش مانتا ہے جنہوں نے مظالم کم کردیئے تھے اور کافی حد تک قدیم یورپیوں کی عادات واطوار سیکھ گئے تھے۔

مگر فوراً ہی یورپ کے افق پر وہاں ''مردوں کی ایک پانچویں نسل'' نمودار ہوگئی۔ یہ وہ لوگ تھے جو ہیسوڈ کے زمانے تک یونان پر حکمرانی کرتے آرہے تھے ہیسوڈ انہی کی اولاد میں سے تھا۔ وہ لکھتا ہے ''کاش میرا اس پانچویں نسل سے کوئی تعلق نہ ہوتا، کاش میں پیدا ہونے سے پہلے یا پیدا ہوتے ہی مرجاتا، کیونکہ اب وہ ایک شخص کے بدلے میں دوسرے شخص کے شہر کو تباہ کردیتے تھے..... کسی کو حق ملنے کا انحصار اس کی طاقت پر ہوتا تھا اور نیک دلی کا کہیں نام ونشان تک نہ ملتا تھا (۵) جیسا کہ رابنسن لکھتا ہے، یہ ''پانچویں نسل'' ڈوریز

MashalBooks.org

(Dorians) تھے ''جنہوں نے اپنے آہنی ہتھیاروں سے مائیسینیوں کے سب قلعے تباہ کر کے سارے علاقے پر قبضہ کر لیا تھا۔ (۶)

اہل علم ہسیوڈ کی لکھی ہوئی کانسی اور لوہے والی نسلوں کی تاریخ کو اتنی ہی معتبر گردانتے ہیں جتنی یونان پر حملہ آور ہونے والے ڈورنیز اور اکائینوں کی تاریخ کو وقیع سمجھتے ہیں۔ لیکن پُر امن کاشتکاروں کے ''سنہری'' عہد جسے اس کے زمانے کے لوگ اب بھی یاد کیا کرتے تھے اور جو دیوتائے جنگ "Ares" کی پرستش نہیں کرتے تھے، ان کے بارے میں ہسیوڈ نے جو کچھ لکھا تھا اسے محض خیال آرائی قرار دیا جاتا ہے۔

یہی رائے بڑے عرصے تک یونان کے قدیم اور بہتر زمانوں سے متعلقہ یونانی قصہ کہانیوں کے بارے میں رہی۔ ''اطلانتہ'' جو افلاطون کے مطابق ایک بے حد خوشحال اور عظیم تہذیب تھی اسے سمندر کی موجیں نگل گئیں۔

افلاطون نے اطلانتہ کی گمشدہ تہذیب کا مقام بحراوقیانوس (Atlantic Ocean) میں تلاش کیا غالباً یہ خیال یونانی مقنن اور سیاستدان Solon کے مصری خبر رسانوں کی اطلاعات پر مبنی ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ اطلانتہ ''مغربِ بعید'' میں ہوتی تھی۔ انہوں نے اس کی تاریخ وقوع بھی بہت بعد کی بتائی تھی۔ تاہم جیسا کہ J.V.Luce اپنی کتاب "The End of Altantis" میں لکھتا ہے افلاطون کی ''اطلانتہ'' کے بعض اجزا ''سولہویں صدی قبل مسیح کی منوآن سلطنت کا چونکا دینے کی حد تک درست خاکہ پیش کرتے ہیں'' (۷) یا جیسا کہ یونانی ماہر آثارِ قدیمہ نکولس پلاٹن لکھتا ہے ''افلاطون نے غرق شدہ اطلانتہ کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے ہوسکتا ہے کہ وہ منوآن کریٹ کی تاریخ اور اس کی اچانک تباہی کا کوئی حوالہ ہو'' کیونکہ افلاطون کے مطابق اطلانتہ ''شدید زلزلے اور سیلابوں سے تباہ ہوا تھا'' جیسا کہ اب سکالرز منوآن تہذیب کے حوالے سے خیال کرتے ہیں کہ اسے تباہ کن دھچکے لگے تھے جن کی وجہ سے آرکینوں کے لئے کریٹ اور یونان میں منوآن نوآبادیوں پر قبضہ کرنا آسان ہوگیا تھا۔ (۸)

یہ نظریہ سب سے پہلے ۱۹۳۹ء میں ڈائریکٹر گریک آرکیالوجیکل سروس پروفیسر سپائریڈن مارینا ٹوز نے پیش کیا تھا۔ نسبتاً زیادہ زمانۂ حال میں اس کی تائید ایک ارضیاتی شہادت سے ہوگئی کہ تقریباً ۱۴۵۰ قبل مسیح میں بحیرۂ روم میں اتنی شدید ارضیاتی آتش فشانی

MashalBooks.org

ہوئی کہ جزیرۂ تھیرا کا ایک حصہ منہدم ہو کر سمندر میں گر پڑا تھا (اب یہ زمین کی ایک پتلی سی پٹی ہے جسے بعض لوگ ''سانٹورونی'' کہتے ہیں) یہ ارضیاتی آتش فشانیاں مہیب زلزلوں اور بحری موجوں کو حرکت میں لے آتی ہیں۔ ان قدرتی تباہ کاریوں کا وقوع اور ان کی شدّت قطعۂ زمین، (جسے افلاطون نے اطلانتہ کا نام دیا ہے) کی غرقابی کے بارے میں عوامی یادداشتوں کی بنیاد معلوم ہوتی ہے۔ اس کی تصدیق ''تھیرا'' اور ''کریٹ'' کی کھدائیوں سے بھی ہوئی ہے۔ یہاں اسی زمانے میں زلزلے کی شدت سے ہونے والے نقصان اور بہت سے ساحلی علاقے کی تباہی کی شہادت ملی ہے۔ (۹)

جیسا کہ ''لُوس'' (Luce) کہتا ہے۔ اب پتہ چلتا ہے کہ ''درحقیقت'' بحری موجیں ہی سمندر سے برآمد ہونے والا وہ بیل تھیں جسے نوسس کے حکمرانوں کو طاعون میں مبتلا کرنے کے لئے بھیجا گیا تھا'' (۱۰) اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اطلانتہ کی کہانی دراصل عوام کی ایک مسخ شدہ یادداشت ہے نہ کہ ایک گمشدہ اوقیانوسی براعظم کی کہانی، بلکہ کریٹ کی منوآن تہذیب کی کہانی ہے۔ (۱۱)

باغِ عدن اور سومر کی تختیاں

میسوپوٹیمیا کی اساطیری کہانیوں میں بتکرار آنے والا ایک موضوع یہ بھی ہے کہ ایک زمانہ ایسا ہوتا تھا جب انسان آج کی نسبت بہت ہم آہنگی کی زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ ان کہانیوں میں اس بات کا بار بار حوالہ دیا گیا ہے کہ اس زمانے میں نعمتوں کی فراوانی تھی اور ہر طرف امن وامان کا ماحول تھا۔ وہ وقت عظیم طغیانی سے پہلے کا تھا جب عورتیں اور مرد ایک فرحت بخش باغ میں رہا کرتے تھے۔ علمائے بائیبل کا خیال ہے کہ باغِ عدن کا تصور جزوی طور پر ان کہانیوں سے اخذ کیا گیا ہے۔

آثاریاتی شہادتیں جو ہمارے زیرِغور رہی ہیں، ان سے پتہ چلتا ہے کہ باغِ عدن کی کہانی بھی واضح طور پر لوگوں کی یادداشتوں پر مبنی ہے۔ باغ، جدید حجری دور کا ایک تمثیلی نقشہ ہے جب عورتیں اور مرد پہلے پہل کاشت کرنے لگے تھے، اس طرح انہوں نے اوّلین ''باغ'' اگالیا۔ قابیل اور ہابیل کی کہانی جزواً گلہ بانوں اور زرعی لوگوں کے ٹکراؤ کی کہانی تھی جس میں ہابیل اول الذکر لوگوں کی علامت تھا (جس نے اپنی ذبح شدہ بھیڑ کا چڑھاوا

چڑھایا تھا) اور قابیل مؤخر الذکر لوگوں کی علامت تھا (جس نے زمین میں اُگایا ہوا پھل پیش کیا تھا) اسی طرح باغ عدن اور جنت سے اخراج کی داستانیں جزوی طور پر اصل تاریخی واقعات ہیں جن کا مفصل ذکر اگلے ابواب میں آئے گا۔ یہ کہانیاں اس انقلابی ثقافتی تبدیلی کی عکاسی کرتی ہیں جس کا ہم جائزہ لیتے رہے ہیں: یعنی مرد کے غلبے کا قیام اور نتیجتاً امن وشراکت داری سے پیچھے ہٹ کر تسلّط قائم کرنا جس سے چپقلش، تصادم اور نزاع نے جنم لیا۔

میسوپوٹیمیا کی داستانوں میں ہمیں ''دیوی'' کے حوالہ جات بطور اعلیٰ ترین مرتبۂ خداوندی پر فائز ہستی یا ''ملکۂ افلاک'' کے طور پر ملتے ہیں۔ یہ خطاب بعدازاں عہد نامۂ عتیق میں بھی پایا گیا لیکن اب یہ خطاب قدیم مذہبی عقائد کے احیاء کو روکنے والے پیغمبروں کے سیاق وسباق میں پایا جاتا ہے۔ بلاشبہ میسوپوٹیمیا کے قدیم ترین کتبوں اور نقوش میں دیوی کے بے شمار حوالہ جات ملتے ہیں۔ سمیریا کی ایک دعا میں باعظمت ملکہ ''نانا'' (دیوی) کا نام بطور ''بے پناہ طاقتور خاتون، تخلیق کار'' کے آتا ہے۔ ایک اور کتبے میں ''دیوی نمو'' بطور ''ماں کے ذکر کیا گیا ہے جس نے زمین وآسمان کو جنم دیا'' (۱۲)۔ سمیریا اور بعدازاں بابل کی داستانوں میں یہ ذکر آتا ہے کہ عورتوں اور مردوں کو دیوی نے کس طرح بیک وقت یا جوڑا جوڑا کر کے جنم دیا تھا (۱۳) یہ کہانیاں مرد کے تسلّط والے معاشرے میں اس زمانے کی محض ایک بازگشت محسوس ہوں گی جب عورتوں کو مردوں سے کمتر نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اس خطے میں جو اتنے طویل عرصے سے گہوارۂ تہذیب سمجھا جا رہا ہے ایک زمانہ آیا تھا جب سلسلۂ نسب ونسل ہنوز مادرسری تھا اور عورتیں ابھی تک مرد کے تابع نہیں سمجھی جاتی تھیں، اس کا استنباط دیگر تختیوں سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ مثال کے طور پر ۲۰۰۰ قبل مسیح میں بھی ہم ''ایلام'' (سمیر کی مشرقی جانب کی ایک شہری ریاست) میں ایک قانونی دستاویز پر یہ لکھا ہوا پاتے ہیں کہ ایک عورت نے اپنے شوہر کے ساتھ مشترکہ طور پر میراث چھوڑنے سے انکار کرتے ہوئے ساری جائداد اپنی بیٹی کے نام کر دی۔ یہاں بھی ہم یہ پاتے ہیں کہ صرف آخری ادوار میں ایلام کی دیوی ''عظیم بیوی'' کے طور پر مشہور ہوئی اور اپنے شوہر ''ہمم'' سے ثانوی حیثیت میں چلی گئی۔ حتیٰ کہ بعد کے بابل میں بھی جو پہلے ہی مرد کے تسلّط کا دور تھا، اس میں ایک دستاویزی شہادت ملی ہے کہ بعض عورتیں اس وقت بھی اپنی املاک کا انتظام وانصرام خود سنبھالتی تھیں بالخصوص خاتون پادری وسیع پیمانے پر تجارت کرتی تھی۔ (۱۴)

مزید برآں جیسا کہ پروفیسر ایچ ڈبلیو سیگز لکھتا ہے ''قدیم سمیرین مذہب میں دیوی ممتاز مقام رکھتی ہے جو بعدازاں عملاً غائب ہوجاتی ہے ماسوائے ایک استثنٰی کے جو ''اشتر'' کو بطور کسی خاص دیوتا کی محبوبہ کے حاصل ہوتا ہے''۔ یہ جُملہ اس نتیجے کی تائید کرتا ہے، وہ بھی سیگز ہی کے بقول ''قدیم سمیرین شہری ریاست میں عورتوں کا منصب ان کے بعد کے منصب کی بہ نسبت بہت بلند تھا'' [۱۵] ہلال اخضر کے خطے میں مرد کی بالادستی قائم تھی اور دہشت ناک ہونے کے باعث اسے بلند مرتبہ تسلیم کیا جاتا تھا جبکہ دیوتا کا مسلح ہونا ایک رواج بن گیا، اس سے قبل ایک ایسا وقت بھی تھا جس کا اظہار ''کوئین شب اد'' جیسی حکمرانوں کے مقبروں سے ہوتا ہے اور اس کا تعلق ''اُر کے اوّلین خاندان'' سے تھا کیونکہ یہاں (اگرچہ ماہرین آثاریات کا کہنا ہے کہ اس کے ساتھ والی قبر جس میں ایک مرد کا ڈھانچہ تھا وہ ایک بادشاہ کی قبر تھی) صرف اس ملکہ کے نام کا کتبہ ہے اور اس کا مقبرہ بادشاہ کی قبر سے کہیں زیادہ شاندار ہے۔ [۱۶] اسی طرح اگرچہ مؤرخین عام طور پر "Luglanda" اور Urukagina کی ''حکمرانیوں'' کا ذکر کرتے ہیں اور ان کی بیویوں کے ناموں Barananamtarra اور Shaghshag کا حوالہ سرسری طور پر دیتے ہیں۔ سرکاری دستاویزات پر نظر ڈالنے سے انکشاف ہوا کہ ان پر تاریخ دراصل دوملکاؤں کے ناموں سے درج ہے۔ [۱۷] اس سے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ عورتیں مردوں کے زیر غلبہ وتسلط نظام کے تحت ان کی ''بیویاں'' تھیں۔

یہ سوال بھی کھڑا کیا جاتا ہے کہ اگر ہم ۲۳۰۰ ق م میں سلطنت سمیریا کی ''یوروکاجینہ'' اصطلاحات کے متن کا بغور جائزہ لیں تو اس میں کہا گیا ہے کہ آئندہ سے معبد کی زمینوں پر لگے درختوں اور اگائی ہوئی فصلوں کے فوائد اصل ضرورت مندوں تک پہنچائے جائیں گے اور اس رواج کو ختم کر دیا جائے گا جس میں یہ فوائد صرف پادریوں کا حق ہوتے تھے۔ اس سے پہلے ان پر پادریوں کی اجارہ داری کیوں قائم رہی؟ یہ صرف اتنی بات نہیں کہ اصلاحات اس دور میں ہوئیں جب ملکائیں ہنوز (یا ایک بار پھر) مالکِ اقتدار تھیں جیسا کہ آرٹ کی تاریخ دان میرلین سٹون کہتی ہے اس سے یہ مراد بھی ہے کہ سمیریا کے سابقہ معاشروں میں نظامِ مراتب کم درجے کا تھا اور عام لوگوں کے مفاد کو ترجیح حاصل تھی۔ [۱۸]

علاوہ ازیں یہ ہمیں بتاتا ہے کہ ضرورت مند افراد کی مدد ودستگیری کا نظام اسی طرح شراکت پر مبنی معاشروں کے زمانے سے چلتا آ رہا تھا اور اس سلسلے میں 'یوروکاجینہ'' اصلاحات

MashalBooks.org

محض ایک اعادۂ رسمِ اخلاق کی تاکید کے طور پر کی گئی تھیں کہ ماضی میں جس طرح چلتا آ رہا تھا اسی کے مطابق چلتے رہئے گا۔ جیسا کہ میرلین سٹون کہتی ہے اس نتیجے کی تائید و تصدیق ان اصلاحات کو معنون کرنے کے لئے استعمال ہونے والے لفظ "amargi" سے ہوتی ہے جس کے دو معنی ہیں، ایک معنی ''آزادی'' اور دوسرے معنی ''ماں کی طرف واپسی'' کے ہیں۔ اس سے ایک بار پھر ایک سابق اور کم جابرانہ نظام کی یاد تازہ ہوتی ہے جب عورت سربراہ قبیلہ یا ملکہ ہوتی تھی، وہی بطور مقتدر ساری ذمہ داریاں نبھاتی تھی، نہ کہ کسی مطلق العنان کنٹرول کا محض ایک ذریعہ ہوتی تھی۔ (۱۹)

ہمیں یہ بات بھی سمیریا کی یادگاری تختیوں سے معلوم ہوئی ہے کہ دیوی "Nanshe of Legash" کی پوجا اس طور پر کی جاتی تھی.... ''یہ ہے وہ جو یتیم کو جانتی ہے، بیوہ کی جانتی ہے غریب کے لئے متلاشیٔ انصاف اور کمزور کے لئے متلاشی پناہ گاہ ہے۔''(۲۰) ''ساوَلِ نو کے دن'' وہی ساری بنی نوع انسانی کے حالات کا جائزہ لیتی تھی۔ اور قریبی شہر "Erech" سے ملنے والی تختیوں پر یہ لکھا پایا گیا ہے کہ "Goddess Nidaba" نے مقدس چیمبرز سے تعلیم پائی اور وہ فیصلے پڑھواتی ہے'' (۲۱) دیویوں کے تعارفی نام یہ ہوتے تھے ''قانون دہندہ'' ''انصاف پرور'' اور ''رحمت کی نشان'' اور اولین جج بھی کسی پہلے سے موجود نظام قانون کا حوالہ دیا کرتے تھے۔ ایسا نظام انصاف وضع کرنے والوں میں سمیریا کی پادری خواتین بھی شامل تھیں اور وہ جھگڑوں کو طے کراتیں اور انصاف کی تقسیم میں اہم کردار ادا کرتی تھیں۔

میسوپوٹیمیا کی تختیوں اور کتبوں کو پڑھنے سے ہمیں یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ دیوی ننلل (Ninlil) نے جس طرح لوگوں کو درخت کاری اور کاشت کاری کے طریقے سکھائے تھے، اس پر اس کا کس قدر اور کس طریقے سے احترام بجالایا جاتا تھا(۲۲) علاوہ ازیں اس بات کی لسانی شہادت بھی ملتی ہے کہ ان کے ہاں زراعت کے ماٰخذ کیا تھے۔ سمیری متون میں کسان، ہل اور سیاڑ کے جو الفاظ آتے ہیں وہ سمیری زبان کے نہیں ہیں۔ نہ ہی جولاہا، موچی، ٹوکری بننے والے، لوہار، ترکھان، راج اور کمہار کے الفاظ سمیرین ہیں۔ اس سے جو ظاہر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ تہذیب کی تمام بنیادی ٹیکنالوجیز جن پر حملہ آوروں نے قبضہ کیا وہ اس علاقے کے دیوی کے پجاریوں کی ایجاد تھیں جن کی زبان بھی بعد میں ناپید ہوگئی تھی۔ (۲۳)

تہذیب کے تحفے

یہ ایک عام مفروضہ ہے کہ سمیریوں اور اشوریوں کے زمانے میں خواہ جتنے بھی مظالم اور خون ریزیاں ہوتی تھیں وہ ٹیکنالوجی اور ثقافت میں ترقی کے لئے بدقسمتی سے ناگزیر پیشگی تقاضا تھے۔ اگر ''وحشی'' جو ہماری ''قدیم ترین'' تہذیبوں سے پہلے ہوا کرتے تھے وہ اگر مطمئن طبیعتوں کے مالک ہوتے تو ان میں فطری طور پر موزوں محرکاتِ عمل بہت کم پائے جاتے اور وہ دیرپا اقدار وضع نہ کرسکتے۔ کیونکہ جنگ کے لئے جو ترغیب گلی بازاروں میں پھرنے والے ''عام آدمی'' اور پینٹا گون کے'' نظریہ ساز'' کے پاس ہوتی ہے وہ ٹیکنالوجیز اور ثقافت میں ترقی کے لئے بھی بے حد ضروری ہوتی ہے۔تاہم ذخیرۂ معلومات(data) جس کا ہم جائزہ لے رہے ہیں اور قدیم قصے کہانیاں ہمیں وہی کچھ بتا رہی ہیں جو ہم آثاریاتی کھدائیوں سے سیکھ رہے ہیں۔ یہ تاریخ کے سربستہ رازوں سے ایک راز ہے کہ عملاً تمام مادی اور سماجی ٹیکنالوجیز جو تہذیب کے لئے بنیادی حیثیت رکھتی ہیں وہ تسلّط پر مبنی معاشرے کے نفاذ و قیام سے پہلے وجود میں آئی تھیں۔

جدید حجری دور میں دیوی کے جو پجاری تھے وہ غذائی اجناس اگانے، عمارتیں بنانے اور پارچہ بافی کی ٹیکنالوجی کے اصولوں سے باخبر تھے [۲۴] اور وہ قدرتی وسائل لکڑی، فائبر، چمڑے اور بعدازاں دھات سازی کو ترقی دینے میں بھی مصروف رہتے تھے۔ ہماری اہم ترین غیرمادّی ٹیکنالوجیز مثلاً قانون، حکومت رانی اور مذہب بھی اسی طرح گمبوٹس کی اصطلاح کے حوالہ سے قدیم یورپ سے مستعار تھا جسے ہم قدیم معاشرہ کہہ سکتے ہیں۔ اور علیٰ ہذاالقیاس اس سے متعلقہ تصوراتِ عبادت، قانون اور مذہبی پیشوائیت بھی وہیں سے لئے گئے ہیں۔ ڈانس، ڈراما اور لوک ادب فن تعمیر اور ٹاؤن پلاننگ بھی اسی طرح تسلّط معاشرے سے قبل کے ہیں۔ [۲۵]

تجارت براستہ سڑک اور بذریعہ سمندر اس سابق عہد کا ایک اور ورثہ ہے۔ [۲۶] اسی طرح نظم ونسق، تعلیم وتدریس، حتیٰ کہ مستقبل کے بارے میں پیشگوئی کرنا بھی اس زمانے کی دین ہے۔ کیونکہ فالِ نیک یا پیغمبرانہ قدرت کی پہلی شناخت دیوی کی خاتون پادری کے پاس ہوتی تھی۔ [۲۷]

مذہب اس سماجی نظم وضبط کو استحکام بخشتا ہے جس کی وہ عکاسی کرتا ہے بہت سے قدیم مذہبی متون میں یہ دیوی ہی ہوتی ہے جسے ''تہذیب کا تحفہ'' (۲۸) دینے والی ہستی تسلیم کیا جاتا ہے۔ اس دور کا کوئی مرد دیوتا یہ کام نہیں کرسکتا کیونکہ وہ پہلے ہی جبر کی علامت ہوتا ہے۔ بڑی بڑی مادی اور روحانی ایجادات کو کسی دیوی سے منسوب کرنے کی فرضی روایات سے یہ تاثر مل سکتا ہے کہ ان کی اصل موجد عورتیں ہی تھیں۔ (۲۹)

موجودہ حالات میں ایسا مفروضہ قائم کرنا تقریباً ناقابل تصور ہے کیونکہ یہ مفروضہ عورت کو مرد کی محتاج اور ثانوی حیثیت دیتا ہے۔ اسے نہ صرف ذہنی طور پر پست بلکہ بائبل کی رُو سے روحانی طور پر مرد سے گھٹیا اور اس کے لئے باعثِ رسوائی قرار دیتا ہے۔

مگر ایسے معاشروں میں، جنہوں نے کائنات میں عظیم ترین قوت کا تصوّر دیوی کی شکل میں قائم کیا، اسے دانائی اور ہماری تمام مادی اور روحانی نعمتوں کے منبعے کے طور پر عزت وتکریم دی۔ عورتوں میں یہ رجحان پیدا ہوا کہ وہ داخلی طور پر اپنا ایک بالکل مختلف تصورِ ذات قائم کرلیں چنانچہ ایسے طاقتور رول ماڈل کے ساتھ وہ اس بات کو اپنا حق اور فرض سمجھتی تھیں کہ وہ مادّی اور روحانی ٹیکنالوجیز کو ترقی دینے اور انہیں بروئے کار لانے میں پہل کریں اور اس کے لئے فعال کردار ادا کریں۔ ان میں یہ رجحان پیدا ہوا کہ وہ اپنے آپ کو قابل، خودمختار، بے حد خلاّق اور اختراعی صلاحیتوں کی مالک سمجھیں۔ بلاشبہ اس امر کی روزافزوں شہادتیں موجود ہیں کہ عورتوں میں مادی اور غیر مادی ٹیکنالوجیز کو ترقی دینے اور ان کا انتظام وانصرام کرنے میں شرکت اور قیادت کی بھرپور صلاحیت پائی جاتی ہے۔ جن پر بعدازاں ایک نظامِ تسلط منڈھ دیا گیا۔

سکالرز نے اس زمانے کی طرف رجوع کرتے ہوئے جب ہمارے روحانی منصب داروں نے پہلی دفعہ انسانوں کا روپ دھارا تھا، ہمارے ارتقا کا انتہائی متوازن نقطۂ نظر قائم کرنا شروع کردیا ہے، اس نقطۂ نظر کے مطابق ارتقا میں مرکزی کردار صرف مرد نہیں بلکہ عورتیں ادا کرتی ہیں۔ انسانی معاشرے کے آغاز کا ارتقائی ماڈل جو ''مرد کی صلاحیتِ شکار'' پر مبنی تھا وہ شکار کی صلاحیت میں اضافے کے لئے مرد کی غلامی پر مبنی نظام کا متقاضی تھا۔ اس کا دعویٰ یہ بھی ہے کہ ہمارے ابتدائی اوزاروں کو مردوں نے ترقی دی تھی تاکہ وہ اپنے شکار کو ہلاک کرسکیں اور اپنے مدمقابل اور کمزور انسانوں کو بھی موت کی گھاٹ اتارسکیں۔ اب نینسی

ٹینر جین لنکاسٹر، لیلالیبووٹز اور ایڈرینی زہلمن جیسی سائنسدانوں نے ایک متبادل ارتقائی ماڈل تجویز کر دیا ہے۔ (۳۰)

یہ متبادل نظریہ یوں ہے کہ انسان کے سیدھا کھڑے ہو کر چلنے کا تعلق اس بات سے نہیں تھا کہ وہ اپنے ہاتھ آزاد کر کے ان سے شکار مار سکے بلکہ اس امر سے تھا کہ وہ چلتے پھرتے کھانے کی بجائے غذا اکٹھی کر کے اپنے ہمراہ لے جائے اور اسے جمع کر کے بھی رکھے۔ مزید برآں ہمارے بہت بڑے اور فعال ذہن کی قوتِ محرکہ برائے ارتقا کا دباؤ بڑھنے، اس کے اوزار سازی کے لئے استعمال ہونے اور دوسروں کے ساتھ تبادلۂ اطلاعات کا مقصد ہرگز یہ نہیں تھا کہ آپس میں جوڑ پیدا ہونے سے میسر آنے والی مشترکہ قوت کو ہلاکتوں کے لئے ستعمال کیا جائے بلکہ یہ ماؤں اور بچوں کے مابین جوڑ تھا جو اس لئے درکار تھا کہ اگر اولاد کی بقا کا تقاضا ہو تو اسے بروئے کار لایا جائے۔ اس نظریئے کے مطابق انسان نے سب سے پہلے جو چیز بنائی وہ ہتھیار نہیں تھے بلکہ ایسے برتن تھے جو بچوں (اور شیرخواروں) کے لئے غذا اکٹھی کرنے کے کام آتے تھے۔ یا ایسے اوزار تھے جن سے مائیں پودوں اور بیلوں کو کانٹ چھانٹ کر کے نرم کرتیں تا کہ وہ کھانے کے قابل ہو جائیں کیونکہ ننھے بچوں کو دودھ کے ساتھ ساتھ ٹھوس غذا کی بھی ضرورت تھی۔ (۳۱)

یہ نظریہ اس حقیقت سے بہت مطابقت رکھتا ہے کہ "primates" (اپنے بچوں کو دودھ پلانے والے) بندر لنگور وغیرہ اور قدیم قبیلے بنیادی طور پر غذا اکٹھی کرنے والی (food gathering) مخلوق تھے، نہ کہ شکار کرنے (hunting) والی مخلوق۔ اور یہ نظریہ اس مشاہدے سے بھی مطابقت رکھتا ہے کہ گوشت خوری قدیم ترین آباؤ اجداد کا صرف ایک حقیر سا جزو تھی۔ اس نظریئے کو اس حقیقت سے مزید تقویت ملتی ہے کہ بندر لنگور وغیرہ پرندوں اور دیگر انواع سے اس خصوصیت کی بنا پر مختلف تھے کہ ان میں صرف مادہ بچوں کو اپنی غذا میں شریک کرتی تھی۔ بندر وغیرہ میں ہم یہ بھی دیکھتے ہیں کہ ان کو میسر آنے والے اوّلین ہتھیار، کسی کو مارنے کے لئے ''نہیں'' تھے بلکہ غذا اکٹھی کرنے اور اسے کھانے کے لئے لائق بنانے کے کام آتے تھے۔ ان ''پرائمیٹس'' میں سے ہم نے جس جانور کا خاص طور پر مشاہدہ کیا وہ چیمپنزی تھا جس کی مادہ ان ہتھیاروں کو بکثرت استعمال کرتی ہے۔ (۳۲)

چنانچہ نینسی ٹینر اس سے بھی زیادہ قدیم ادوار کا ذکر کرتی ہے جو ہمارے زیر مشاہدہ

قدیم ''معاشرے'' کے لئے بنیاد فراہم کرتے ہیں۔ اس کا کہنا ہے کہ ''اکٹھا کرنے والی'' عورت نے ''شکار مارنے'' والے مرد کی بہ نسبت ہماری انواع کے ارتقا میں زیادہ اہم کردار ادا کیا ہے۔ (۳۳) ''ماں کی ذہانت سے مستفید ہونے والی اولاد خوراک کی تلاش اور اسے جمع کرنے کی بہتر تیکنیک استعمال کرتی ہے۔ پھر اس کے ساتھ مل کر کافی مقدار میں جمع کی ہوئی خوراک میں سب شریک ہوتے ہیں۔ ٹینر مزید کہتی ہے کہ ماں کے بعد زندہ رہنے والے یہ بچے سیکھنے کی بہترین صلاحیتوں سے متصف ہوتے ہیں۔ وہ اپنی ماں کی تکنیک کو ترقی دیتے ہیں۔ اور وہ جو ماں کی طرح دوسروں کو اپنے ساتھ شریک کرنے پر آمادہ رہے انہیں اتنی لمبی زندگی ملی کہ انہوں نے بھی زیادہ بہتر اولاد پیدا کی۔ (۳۴)

ٹینر نے مزید لکھا ''یہ بالکل ناممکن ہے کہ ہتھیار اس وقت جانوروں کو مارنے کے لئے استعمال کئے گئے تھے کیونکہ شکار چھوٹا اور بے مدافعت تھا جیسے پکڑا اور ہاتھ سے مارا جاسکتا تھا۔'' مزید برآں ''اس امر کا قوی امکان ہے کہ یہ بااولاد عورتیں ہی تھیں جنہوں نے اشیاء کو اکٹھا کرنے کی نئی ٹیکنالوجی وضع کی تھی''......یہ ہتھیاروں کا کمال نہیں بلکہ انسان کے دو پیروں پر چلنے کی وجہ سے، یا ہاتھوں اور پاؤں کے ایک دوسرے بے نیاز ہونے کی وجہ سے ممکن ہوا تھا.....اس طرح وہ بہ آسانی، غذا اکٹھی کرنے لگا تھا۔ عورتوں کے فری ہاتھ ہونا اور بھی زیادہ ضروری تھا تا کہ وہ غذا کو اٹھائیں اور ساتھ بچوں کو اٹھا کر چلتی رہیں''۔ (۳۵)

یہ امکان بھی بہت زیادہ ہے کہ تمام مادی ٹیکنالوجیز کے لئے درکار چند بنیادی چیزیں بھی عورت ہی نے فراہم کی ہوں، کیونکہ ان کے بغیر تہذیب وجود ہی میں نہیں آسکتی تھی۔ یہ چیزیں تھیں گھروں میں پودے اُگانا اور جانور پالنا۔ (۳۶) ہم جہاں سے ''قدیم انسان'' کی تاریخ کے بارے میں کچھ سیکھتے ہیں وہ یا تو کتابیں ہیں یا کلاسیں ہیں مگر وہاں بمشکل ہی یہ کبھی بتایا جاتا ہے۔ آج کے بیشتر سکالرز اس بات پر متفق ہیں کہ آج کے زمانے میں جو اشیا اکٹھی کرنے اور شکار کرنے والوں کے معاشرے ہیں ان میں غذاؤں کو کھانے کے قابل بنانے کا جتنا کام (process) ہو رہا ہے، اس کے انچارج مرد نہیں بلکہ عورتیں ہیں۔ اس بات کا امکان بہت زیادہ ہے کہ ابتدائی لوگوں نے جہاں جہاں اپنے خیمے قائم کئے تھے وہاں زمین میں سب سے پہلے جس نے بیج ڈالا وہ عورتیں تھیں اور انہوں نے چھوٹے چھوٹے جانوروں کے آگے کھانے پینے کی چیزیں رکھیں۔ ان کی اپنے بچوں کی طرح نگہداشت کی

اور اس طرح انہیں اپنے پاس رہنے کے عادی بنایا۔ ماہرین علوم بشریات اس حقیقت کا بھی ذکر کرتے ہیں کہ ''ترقی پذیر'' قبیلوں اور اقوام کی پھل اور سبزیاں کاشت کرنے کی معیشتیں، مغربی تصورات کے برعکس عورتوں کی بدولت وجود میں آئیں اور آج کے دن زمینوں کی کاشت بنیادی طور پر عورتوں کے ہاتھوں میں ہے۔ [۳۷]

اس قیاس کو مزید کئی قدیم مذہبی داستانوں کی تائید حاصل ہے جو واضح طور پر دیوی کو زراعت کی موجد قرار دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر مصر کے تاریخی ریکارڈ میں دیوی ''عیسس'' (Isis) کا بار بار بطور موجد تذکرہ آتا ہے۔ میسوپوٹیمیا کی تختیوں میں دیوی ''ننلل'' (Ninlil) کا نہایت ادب کے ساتھ ذکر آتا ہے کہ اس نے اپنے پیروکاروں کو کھیتی باڑی سکھائی تھی۔ [۳۸] آثاریات اور روایتی قصے کہانیوں میں دیوی اور زراعت کو بے شمار جگہوں پر آپس میں جوڑا گیا ہے۔ یہ کہانیاں اور آثار کٹل ہویوک سے لے کر کلاسیکل یونانی کا ادوار تک پھیلی ہوئی ہیں۔ کہیں یہ ذکر آتا ہے کہ دیوی کے سامنے اناج کی قربانی پیش کی جاتی تھی اور کہیں کہا جاتا ہے کہ ''ڈیمیٹر'' اور ''ہیرا'' دیویوں کے روبرو اب بھی غلّے کی نذر و نیاز دی جاتی ہے۔ [۳۹] رابرٹ بریفالٹ اور ایرخ نیومن جیسے سکالرز بھی اپنی وسیع تحقیق کی بنیاد پر اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ ظروف سازی کی موجد عورتیں تھیں۔ ایک وقت ایسا بھی تھا کہ اس کو دیوی کی پرستش سے منسلک ایک مقدس چیز سمجھا جاتا تھا۔ اسی طرح قدیم ترین داستانوں میں سوت کا تنا اور کپڑا بُننا بھی عورت سے منسوب اور مقدس دیویوں سے منسلک تھا جو اب تک یونانی دیوی ''فیٹس'' کی طرح مردوں کی تقدیروں کو کاتتی ہیں۔ [۴۰]

مصر اور یورپ اور ہلال اخضر کے خطے سے ملنے والی شہادتوں سے پتہ چلتا ہے کہ نسوانیت کی انصاف، دانش اور ذہانت کے ساتھ رفاقت، قدیم زمانوں سے چلی آرہی ہے۔ ماٹ، مصر کی دیویٔ انصاف ہے۔ مرد کے غلبے کے قیام کے بعد بھی مصر کی دیوی ''عیسس'' (Isis) اور یونان کی دیوی ڈیمٹر کو قانون دہندہ اور حکمت عطا کنندہ تسلیم کیا جاتا رہا جو اپنے پیروکاروں کو راست بازی، دانائی، مشورے اور انصاف عطا کرتی رہیں۔ مشرق وسطیٰ کے شہر ''نمرود'' کے آثاریاتی ریکارڈ سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''وہاں جنگی'' اشتر'' کی پرستش پہلے سے ہی چلی آرہی تھی تب بھی چند عورتیں جج اور مجسٹریٹ کے فرائض انجام دے رہی تھیں۔ آئر لینڈ کے قبل از عیسائیت کی داستانوں سے بھی پتہ چلتا ہے کہ سیلٹ (Celt) قوم، ''سیریڈ وین''

MashalBooks.org

(Cerridwen) کی بطور ذہانت اور علم وبصیرت کی دیوی کے پرستش کرتی تھی۔ [۴۱] "Greek Fates" بطور نافذ کنندۂ قانون اور "Greek Muses" بطور عطا کنندہ بصیرتِ تخلیق، بھی مؤنث تھیں۔ اسی طرح ''صوفیہ'' یا ''وزڈم'' کی شبیہہ جو عہد متوسط کے مسیحی زمانے میں بہت مقبول تھی یہ دیوی کی شبیہہ بطور ''میڈونا آف مرسی'' کے ساتھ ساتھ مرجعِ عقیدت بھی رہی تھی۔ [۴۲]

اس امر کی بھی وافر شہادتیں موجود ہیں کہ روحانیت بالخصوص وہ روحانی قوت جو پیشگوؤں کی خصوصیت سمجھی جاتی تھی ایک زمانے میں عورت کے ساتھ وابستہ تھی۔ میسوپوٹیمیا کے آثاریاتی ریکارڈ سے معلوم ہوتا ہے کہ ''اناناٗ' (Innana) کی جانشین ''اشترآف بائیبلون'' کو ''لیڈی آف ویژن'' مانا جاتا تھا وہ دارالاستخارہ کی طرف سے پوچھے گئے سوالات کے جواب دیا کرتی تھی۔ بابل کی تختیوں میں پادری عورتوں کے بے شمار حوالہ جات ہیں جو ''اشتر'' کی خانقاہ میں پیشگوئیوں پر مبنی تقاریر کررہی تھیں، ان میں سے بعض پیشگوئیاں سیاسی واقعات کے نمایاں ریکارڈ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ [۴۳]

قدیم مصری ریکارڈ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ کوبرا سانپ کی شکل لفظ ''دیوی'' کی خطِ تصویر میں علامت تھی۔ اور کوبرا بطور ''آنکھ'' (Uzait) باطنی بصیرت اور دانش کی علامت سمجھا جاتا تھا۔ کوبرادیوی کو "Uazit" کہا جاتا تھا جو خاندانی نظم حکومت سے قبل زیریں مصر کی ایک دیوی تھی۔ بعدازاں ''تہجور'' اور ''ماٹ'' دونوں دیویاں بدستور ''آنکھ'' کہلاتی رہیں۔ مصری بادشاہوں کی پیشانیوں پر عموماً ایک ایستادہ سانپ دیکھا جاتا ہے۔ مزید برآں ایک خانقاہ جو غالباً دیوی "Ua Zit" کی ہے مصری شہر "Per Uto" میں پائی گئی جسے یونانی Buto کہتے تھے، یہ خود کوبرادیوی کا یونانی نام ہے۔ [۴۴]

ڈیلفی کے مقام پر مشہور دارالاستخارہ خانقاہ ہوا کرتی تھی، اس مقام کو دیوی کی عبادت گاہ کے طور پر شناخت کیا گیا ہے۔ اور کلاسیکی یونانی زبان میں بھی اسے اپالو کی پرستش کے لئے حاصل کرلیا گیا تھا اس دارالاستخارہ میں ایک عورت کے ہونٹوں سے جواب دلوائے جاتے تھے۔ یہ عورت ایک پادری تھی جسے Pythia کہا جاتا تھا اور وہ تین پایوں والے سٹول پر بیٹھی ہوتی تھی جس کے گرد پائتھین نامی سانپ لپٹا ہوا ہوتا تھا۔ علاوہ ازیں ہم "Aeschylus" میں پڑھتے ہیں کہ اس مقدس ترین خانقاہ میں دیوی کی پرستش بطور ایک ''نبیہ''

MashalBooks.org

(prophetess) کی جاتی تھی۔ اس سے ایک بار پھر واضح ہوتا ہے کہ یونان کے اس کلاسیکی عہد میں بھی شراکت پر مبنی معاشرے کی یہ روایت موجود تھی کہ خدا کی وحی کا انتظار کیا جاتا تھا اور پیغمبرانہ ہدایت ایک عورت کی معرفت وصول کرنے کو ابھی تک فراموش نہیں کیا گیا تھا۔ (۴۵)

ایک صدی قبل مسیح میں ''ڈایوڈورس سیکولس'' کی تحریروں میں ہم پڑھتے ہیں کہ ان بعد کے زمانوں میں بھی نہ صرف انصاف بلکہ علاج معالجہ بھی عورتوں سے وابستہ تھا۔ جب اس نے مصر کا سفر کیا تو وہاں اسے پتہ چلا کہ "Ua Zit"اور"Hathor" کی جانشین دیوی"Isis" کی اب بھی نہ صرف بطور انصاف وقانون کی دیوی کے بلکہ علاج معالجے کی دیوی کے بھی پرستش کی جارہی ہے۔ (۴۶) اس سلسلے میں ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ آپس میں بل کھائے ہوئے سانپ اور ان کی مادائیں'' ، کیڈوسیس''(Caduceus) اب جدید میڈیکل پروفیشن کی علامت کے طور بھی استعمال ہوتے ہیں داستان میں بتایا گیا ہے کہ یہ روایت سانپوں کے یونانی دیوتاAsclepins کے کاہنوں کی شناخت ہونے سے اخذ کی گئی ہے۔ لیکن یہ تسلیم کیا جاسکتا ہے کہ سانپوں اور علاج معالجے کے آپس میں گہرے تعلق کی روایت اس سے بھی زیادہ پرانی چلی آرہی تھی۔ سانپ کا دیوی سے متلازم ہونا، جیسا کہ موجودہ صورت میں دیکھا گیا ہے، اس کا اطلاق علاج معالجہ اور الہامِ غیبی، دونوں پر ہوسکتا ہے (۴۷)

لکھائی جس کی ایجاد کے بارے میں عام مفروضہ یہ رہا ہے کہ اس کا آغاز ۳۲۰۰ قبل مسیح میں ہوا تھا مگر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ سُمیر میں یہ سلسلہ بہت پہلے سے چل رہا تھا۔ سمیریا کی تختیوں پر دیوی ''ندابا''(Nidaba) کو افلاکِ سمیریا کی خطاط قرار دیا گیا ہے، اسے مٹی کی تختیوں اور فنِ تحریر کی موجد بھی ظاہر کیا گیا جبکہ ہندوستانی علم الاصنام میں دیوی سرسوتی کو نئے حروف تہجی کی موجد قرار دیا گیا ہے۔ (۴۸) اور اب قدیم یورپ کی آثار یاتی کھدائیوں کی بنیاد پر گمبوٹس نے انکشاف کیا ہے کہ مرتب تحریر کے اوّلین آغاز کا سرا جدید حجری دور سے جاملتا ہے۔ مزید برآں ان شروعات، سے سمیریا کی طرح ''تجارتی ضرورتیں'' پوری نہیں ہوتی تھیں۔ یعنی کتنی اشیا فروخت ہوئیں اور کتنی بچ گئیں اس کا ریکارڈ تحریری طور پر نہیں رکھا جاسکتا تھا بلکہ انسان کے باہمی رابطوں کا یہ طاقتور وسیلہ ایک مقدس رسم الخط تھا جو صرف روحانی کاموں اور دیوی کی پرستش سے متعلقہ معاملات میں کام دیتا تھا۔ (۴۹)

غالباً سب سے زیادہ مشہور دریافتیں جو اس نظریئے کی تائید کرتی ہیں وہ یوگوسلاویہ کے شہر بلغراد کے مشرق کی جانب ۱۴ میل کے فاصلے پر ''ونکا'' نامی جگہ پر پائی گئیں۔ اس علاقے میں مختلف جگہوں پر جو کھدائیاں کی گئیں ان میں سے یہ سب سے زیادہ حالیہ تھی۔ یہ یورپی ونکا کی حقیقی تہذیب کی نمائندگی کرتی تھیں کیونکہ ان میں اعلیٰ ترین درجے کی مہارت کا اظہار پایا جاتا تھا۔ پروفیسر ایم ویسک جس نے ۱۹۰۸ اور ۱۹۳۲ کے درمیان ''ونکا'' میں بارہا کھدائیاں کی تھیں، پہلے اس نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ یہ دوسرے ہزاریہ قبل مسیح میں ایجین تہذیب (Aegean Civilization) کا مرکز تھا، پھر اس نے یہ فیصلہ کیا کہ یہ اس سے بھی بعد کے دور کی نمائندہ ہے، یہ یقیناً ایک یونانی نوآبادی ہوتی تھی اس طرح اور بھی کئی نتیجے اخذ کئے گئے۔ گمبوٹس کہتی ہے کہ ایسے نتیجے بلقان کی بعض تواریخ میں بھی مسلسل اخذ کئے جاتے رہے۔ (۵۰)

یہ نظریئے، آثاریات میں عمروں کے تعین کے طریقوں کی دریافت سے پہلے مروّج ان خیالات سے مطابقت رکھتے ہیں کہ قدیم بلقان میں کوئی ترقی یافتہ دیسی ثقافت نہیں ہوا کرتی تھی لیکن عمروں کے تعین کے طریقوں سے ''ونکا'' ثقافت کے مختلف ادوار جو سات ہزار برس (۵۱) قبل سے تعلق رکھتے ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ سارا زمانہ دیوی کی حکمرانی اور پرستش کا زمانہ تھا، اس میں شراکت پر مبنی معاشرہ ہوتا تھا۔ متعدد دیگر آثاریاتی تحقیقات نے بھی اس کی تائید کی ہے۔

''ونکا'' سے ہی ''ترتارا'' (Tartara) تختیوں اور مورتیوں اور برتنوں پر کندہ شواہد برآمد ہوئے ہیں جن سے گمبوٹس نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ وہاں عموماً گہری روحانی فضا موجود تھی۔ (۵۲) اس سے ایک اور نظریہ بھی سامنے آتا ہے جو کسی قدر اس نتیجے سے ہم آہنگ ہے کہ بلقان میں کوئی ترقی یافتہ ثقافت نہیں پائی جاتی تھی، اس نظریئے کے مطابق ''ونکا'' ثقافت اناطولیہ سے درآمد کی گئی تھی۔ حتیٰ کہ کچھ میسوپوٹیمیا سے آمدہ بھی تھی۔ لیکن اب یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ ''ونکا'' بلقان کی دیسی ثقافت تھی۔ اس طرح اگر جدید حجری دور کی تختیوں، ونکا اور دیگر یورپین مقامات کی کھدائیوں سے برآمد شدہ مورتیوں اور دوسری اشیا پر کندہ کاریوں کا بغور مشاہدہ کیا جائے تو وہ ابتدائی قسم کی خط دار تحریر (linear script) دکھائی دیتے ہیں۔ اس سے تحریر کے منابع اس سے کہیں زیادہ قدیم معلوم ہوتے ہیں جتنے کہ اب تک

سمجھے جاتے رہے ہیں، یُوں ان کا سِرا زمانۂ تسلّط سے بھی بہت آگے چلا جاتا ہے۔ (۵۳)

اس نتیجے کی تائید میں آنے والی شہادتوں کی تعداد یقیناً بڑھ رہی ہے۔ پروفیسر گمبوٹس نے ۱۹۸۰ء میں کہا تھا ''اس وقت تک ساٹھ سے زیادہ مقامات (s(ites کی کھدائی میں کندہ شدہ اشیا برآمد ہوئی ہیں۔ کھدائی کے بیشتر مقامات ''ونکا'' اور ''ٹیسزا'' (Tisza) ثقافت کے گروپ ہیں جبکہ وسطی بلغاریہ میں کرانو (Karanovo) ثقافتی گروپ ہے۔ ڈومینی، کوکوٹینی، پیٹیرسٹی، لنجل بٹمیر، بک اور لنئیر پاٹری سرامکس پر بھی کندہ کاری بارنگ وروغن کے نشانات پائے جاتے ہیں''۔ ان برآمد شدہ اشیائے ظاہر ہوتا ہے کہ ''ونکا رسم الخط'' یا 'تارتارا' کی تختی کی بات کرنا مناسب نہیں ہوگا کیونکہ اب بات واضح ہوچکی ہے کہ یہ رسم الخط قدیم یورپی تہذیب کا ایک ہمہ گیر مظہر تھا''۔ (۵۴)

مزید برآں یہ رسم الخط اس پرانی روایت میں ایک قسم کی بڑھوتری تھی جس میں آرٹ کو اہم تصورات کی تشہیر کے لئے بطور ایک بصری ''شارٹ ہینڈ'' استعمال کیا جاتا تھا۔ سارے قدیم یورپ میں دیوی کی ''طرحدار'' مورتیاں پائی جاتی تھیں جنہیں آڑی ترچھی لکیروں، دائروں اور متوازی یازاویہ بناتے ہوئے خطوں سے سجایا گیا ہوتا تھا۔ جیسا کہ گمبوٹس لکھتی ہے، یہ شبیہیں اپنے اپنے زمانے میں عام مسلمہ اور فہمیدہ تصورات کی وضاحت کرتی تھیں۔ جب اس قسم کے علامتی ابلاغ نے ایک قدم آگے بڑھایا تو غالباً اس سے انسانی تحریر کی پہلی شکل وضع ہوگئی۔ یہ وہ غیر صوتی یا مجرّد اشکال تھیں جن میں علامتی نشانات (جو قدیم حجری اور جدید حجری ادوار میں بھی مستعمل تھے) کو لکیروں، قوسوں اور نقطوں کے ذریعے ترمیم شدہ شکل میں پیش کیا جانے لگا۔

گمبوٹس جو قدیم یورپی رسم الخط کی رمز کشائی کے لئے کام رہی ہے۔ اس کا یہ خیال بھی ہے کہ ان میں سے بعض علامتی نشانات نے رفتہ رفتہ صوتی اہمیت حاصل کرلی تھی۔ وہ انگریزی کے حرف "v" کا ذکر کرتے ہوئے کہتی ہے کہ مورتیوں اور دیگر عباداتی اشیا پر "V" کا نشان بکثرت ملتا ہے۔ ''میرا خیال ہے کہ اس حرف کو اس کی صوتی افادیت کی وجہ سے استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ غالباً چھ ہزار سال قبل مسیح سے مصری زبان میں پانی کے لئے استعمال ہونے والے کسی حرف "M" سے ماخوذ تھا۔ (۵۵)

مجسموں اور بعدازاں برتنوں، قرصوں اور سلیٹوں پر پائے جانے والے نشانات اور

علامات کے گہرے مشاہدے کے حوالے سے گمبوٹس نے ان کی رموز کی عقدہ کشائی کی کوشش کی ہے۔ مثال کے طور پر اس نے "V" کو دیوی کی مظہر قرار دیا جو پرندے کا قالب اختیار کر لیتی تھی اور خیال ظاہر کیا کہ ہوسکتا ہے کہ جن اشیاء پر یہ نشان ڈالا گیا وہ دیوی کی خدمت میں ایک چڑھاوے کی شکل ہو۔اس کا مزید کہنا ہے کہ بعد کے نشانات جو قطاروں کی صورت میں ہیں ان کا بار بار "Vs"(یا Ms، Xs اور Ys) کی شکل میں آنا' ہوسکتا ہے کہ یہ دیوی کے سامنے حلف لینے، مناجات پڑھنے اور تعمیلِ احکام کو ظاہر کرتا ہو۔ (۵۶)

گمبوٹس قدیم یورپی کرداروں اور 'Crypto-Minoan Linear A' (۵۷) اور قدیم قبرصی کرداروں کے مابین ناقابل تردید مشابہت کی طرف توجہ دلاتے ہوئے کہتی ہے کہ اس امر کا قوی امکان ہے کہ منوآن کریٹ میں پائی جانے والی Linear A عبارت جو سرِ دست ناقابل وضاحت ہے، بعد میں مرورِ ایّام سے بچی ہوئی حجری دور کی کوئی عبارت ہو۔ اور وہ نہ ہو جیسا کہ فرض کر لیا گیا ہے کہ یہ کریٹ کے باشندوں سے مستعار لی گئی ہوگئی جن کے ایشیائے کوچک اور مصر کے ساتھ تجارتی روابط تھے۔ (۵۸)

ماضی کا ایک نیا منظر

گمشدہ ماضی کے بارے میں یہ مجموعۂ معلومات ہمارے اپنے ذہنوں میں قدیم اور جدید کے مابین ایک ناگزیر کشمکش برپا کر رہا ہے۔ قدیم نظریہ یہ تھا کہ سب سے اوّلین انسانی قربت نے (اور بعدازاں اقتصادی تعلقات نے) شکار کرنے اور ہلاک کرنے سے جنم لیا جبکہ نیا نظریہ یہ ہے کہ سماجی نظم کی بنیادیں ماؤں اور بچوں کے اشتراکِ عمل سے وجود میں آئیں۔ (۵۹) زمانہ قبل ازتاریخ کے بارے میں پرانا نظریہ یہ تھا کہ ''انسان ایک جنگجو شکاری'' تھا۔ جبکہ نیا نظریہ یہ ہے کہ عورتیں اور مرد مل جل کر اپنی عدیم النظیر صلاحیتیں زندگی کے نشوونما اور اسے آگے بڑھانے کے لئے استعمال کرتے رہے ہیں۔

جس طرح کہ بعض بعید ترین معاشرے مثلاً "Ba Mbuti" اور "Kung" جنگجو، غارنشینوں اور عورتوں کو بالوں سے پکڑ پکڑ کر گھسیٹنے والوں میں سے نہیں تھے اور اب واضح ہو چکا ہے کہ حجری زمانہ بے حد پُرامن دور تھا اور جس طرح ہنرخ اور صوفیہ شلیمن نے اپنے دور کی فاضلانہ تحقیق کو للکارا اور ثابت کیا کہ ٹرائے کا شہر ہومر کا تخیلاتی شہر نہیں تھا بلکہ زمانہ قبل

MashalBooks.org

ازتاریخ کی ایک حقیقت تھا۔ نئی آثاریاتی دریافتیں اس وقت کی داستانوں کی تصدیق کرتی ہیں کہ جب دیوتا مردعورتوں کو ہمیشہ مرد کے تابع رہنے کی تلقین کیا کرتا تھا، اس سے پہلے ایک وقت ہوتا تھا جب پوری انسانیت امن وخوشحالی کی زندگی گزار رہی تھی۔

مختصراً یہ کہ ثقافتی ارتقا کے نئے نظریئے کے مطابق مرد کا غلبہ، مرد کا تشدد اور حاکمانہ اختیار ''حتمی الوقوع لازمی عطیات''(Inevitable givens) نہیں ہیں بلکہ محض ''یوٹو پیائی خواب ہیں''۔ اور مساوات پر مبنی دنیا ہمارے مستقبل کے ایک حقیقی امکان کی حیثیت رکھتی ہے۔

لیکن ان دیوی کے پجاری معاشروں سے ہمیں ملنے والی میراث نہ صرف اس وقت کی دلگداز یادداشت ہے جب ''شجرِ زندگی'' اور ''شجرعلم'' کو اس وقت بھی مادرِفطرت کی طرف سے عورت اور مرد، دونوں کے لئے تحفہ سمجھا جاتا تھا اور نہ ہی یہ ایک تکلیف دہ احساس ہے کہ اس وقت کیا ہوجاتا اگر انسانیت کو بالغ ہونے کی اجازت دے دی جاتی کہ وہ ان تحائف سے لطف اندوز ہوسکتی۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ بنیادی ٹیکنالوجیز جن پر بعد کی ساری تہذیب کی تعمیر ہوئی ہے وہ ان شراکت پر مبنی معاشروں سے ہمیں ملنے والی میراث ہیں۔

یہ کہنے کی یہ مرادنہیں کہ یہ معاشرے مثالی تھے۔ اگرچہ انہوں نے انسانی ثقافت کوعظیم تحائف دیئے اور انہیں بعد کے ادوار میں زیادہ بےضرر اور زیادہ بہتر زمانے کے طور پر یاد کیا گیا، مگر وہ ''یوٹوپیائی'' ہرگزنہیں تھے۔ اس امر کا اظہار بھی بہت ضروری ہے کہ ایک پُرامن معاشرے کی یہ نشانی نہیں ہے کہ اس میں تشدد کا عنصر بالکل ہی مفقود ہونا چاہیے۔ آخر وہ گوشت پوست سے بنے ہوئے انسانوں کے معاشرے تھے ان میں تمام انسانی کمزوریاں موجود تھیں اور انہیں ناکامیاں بھی ہوتی رہتی تھیں۔

مزید برآں جدید حجری دور کے لوگ تمام اختراع پسندیوں اور صلاحیتوں کے باوجود اپنی مادی ٹیکنالوجیز کے حوالہ سے آج ہمارے زمانے کے مقابلے میں بالکل ابتدائی حالت میں تھے۔ اگرچہ ان کے ہاں رسم الخط کی شہادت ملتی ہے مگر کوئی تحریری ادب وجود میں نہیں آسکا تھا اور اگرچہ ان کے پاس زراعت سے لے کر فلکیات تک بہت کچھ معلوم تھا مگر غالباً کوئی ایسی سائنس نہیں تھی جیسی آج ہمارے پاس ہے۔

MashalBooks.org

درحقیقت جدید حجری زمانے کے مذہبی آرٹ کے بارے میں ہم اب دیکھ سکتے ہیں کہ وہ ہماری قسم کے سائنسی علوم میں کتنی کمی سے دوچار تھے۔ ہمارے آباؤاجداد مظاہر کائنات کی وضاحتیں پیش کرنے اور اپنے اس علم سے اپنے گردوپیش کو متاثر کرنے کی کوشش کرتے رہے مگر وہ ہمارے زمانے میں بالکل بھونڈی اور توہماتی سوچیں لگتی ہیں۔ اور اگرچہ بعد کے تسلط پر مبنی معاشروں میں انسانی قربانی کی بے شمار شہادتیں ملتی ہیں مگر اس سے پہلے کے معاشرے میں انسان کو مذہبی رسم کے طور پر قربان کردیئے جانے کے بہت کم اشارے ملتے ہیں۔ (۶۰)

شہادتوں سے اس قدیم زمانے کے مخصوص ذہنی معیار کے بارے میں کئی مثبت اور منفی نقاط کا ایک منظر سامنے آجاتا ہے۔ جدید حجری دور کے آرٹ کو بعض اوقات نا معقول قرار دے دیا جاتا ہے کیونکہ اس میں اس قسم کی شبیہات کی بھرمار دکھائی دیتی ہے جسے ہم پریوں کی کہانیوں، ڈراؤنی فلموں اور حتیٰ کہ سائنسی تخیل کا بے لگام مظہر قرار دیتے ہیں۔ لیکن اگر ہم ''معقول'' کی تعریف کسی رحمدلانہ معیار سے اس معنی میں کریں کہ یہ ہمارے ذہنوں کو فطرت کی تباہ کاری اور وحشیانہ پن سے کچھ ماورا ہو کر استعمال کرنے کا نام ہے اور غیر معقول کی تعریف تباہ کن سوچ اور عمل سے کریں تو یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ جدید حجری آرٹ کچھ زیادہ نامعقول نظریۂ عالم کی عکاسی نہیں کرتا۔ (۶۱) یہ مقابلہ اس سوچ کے جو ہمارے سیکولر دور میں زیادہ وقعت رکھنے والی تجرباتی اور مشاہداتی سوچ کہلاتی ہے، یہ آرٹ اس ذہن کی پیداوار تھا جو تخیلاتی، وجدانی اور متصوفانہ میلان رکھتا تھا۔

یہاں وہ مراد نہیں جیسا کہ ماہر نفسیات جولین جینز کا کہنا تھا کہ ان قدیم زمانوں کے لوگوں کے دماغوں کا جھکاؤ ''دائیں'' طرف تھا۔ جینز نے دعویٰ کیا کہ حقیقی انسانی شعور (جو کہ زیادہ منطقی یا ''بائیں'' طرف کی سوچ ہوتی ہے) ان طبعی جھٹکوں کے نتیجے میں جنم لیتا ہے جو خونریز حملوں اور قدرتی آفات کی وجہ سے لگتے ہیں جن کا ہم پیچھے جائزہ لے چکے ہیں۔ درحقیقت اس کا دعویٰ یہ تھا کہ جب تک ایسا نہ ہو ہم ''دائیں'' طرف سے کام کرنے والے دماغ رکھنے والوں سے کچھ ہی بہتر سوچ کے تحت یا خدا کی عطا کردہ خودکارانہ سوچ کے تحت کام کرتے رہتے ہیں۔ (۶۲) مگر ہمیں صرف ''سٹونہنج'' اور ''ایوبری'' کی خانقاہوں کو دیکھنے کی ضرورت ہے جن سے پتہ چلے گا کہ جدید حجری دور میں پہلے سے ہی منطقی، مربوط اور متوازن سوچ سے کام لیا جارہا تھا جو ''بائیں'' طرف کے دماغ کی کارکردگی تھی۔ یہ بالکل

واضح امر ہے کہ ان بڑے بڑے پتھروں کی سورج اور چاند کی حرکت کے ساتھ مطابقت کے علاوہ ان کی تشکیل، نقل وحمل اور تنصیب علم ریاضی، فلکیات اور انجینئرنگ کی ترقی یافتہ سوچ کی متقاضی تھی۔ (۶۳) اور اسی طرح کریٹ کے باشندے (جونالیاں بناتے، سڑکیں ہموار کرتے، بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرتے، گھروں کے اندر پلمبنگ کرتے، تجارت کرتے اور جہاز رانی کے بارے میں کافی معلومات رکھتے تھے) سوچ بچار کے لئے یقیناً دماغ کی دونوں اطراف کو بھرپور طریقے سے استعمال کرتے ہوں گے۔ کیونکہ کریٹ کے مادی کارنامے جدید معیارات کے لحاظ سے بھی حیرت انگیز تھے۔ یہ کہنا مبالغہ نہ ہوگا کہ وہ آج کے کئی ترقی پذیر معاشروں سے بھی بہت آگے تھے۔

ہمارے جدید دور سے مقابلہ کیا جائے تو اس سے بھی زیادہ حیران کن بات یہ سامنے آتی ہے کہ ان قبل از تاریخ ادوار کے شراکت پرمبنی معاشروں میں ٹیکنالوجی کی پیش رفت کو بنیادی طور پر زندگی کو زیادہ پُرآسائش بنانے کے لئے بروئے کار لایا جاتا تھا، نہ کہ دوسروں کو مغلوب کرنے اور برباد کرنے کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ اس سے تسلّط پسند معاشرے اور شراکت پرمبنی معاشرے کے ثقافتی اور ارتقا میں بنیادی فرق سامنے آتا ہے۔ اس سے اس نتیجے کی بھی نشاندہی ہوتی ہے کہ اس اہم پہلو سے ہمارے سابقہ فنیاتی اور سماجی لحاظ سے کم ترقی یافتہ شراکتی معاشرے نے موجودہ دنیا کے اعلیٰ فنیاتی معاشروں کی بہ نسبت زیادہ ارتقائی منازل طے کی تھیں۔ جس کا ثبوت یہ ہے کہ آج ہر سال لاکھوں افراد کو بھوک سے مرجانا پڑتا ہے اور اربوں ڈالر کے سامانِ ہلاکت کو زیادہ سے موثر بنانے کی صنعتوں میں جھونک دیا جاتا ہے۔

اس تناظر میں ضائع شدہ قدیم روحانیت کو ایک نئی اور بے حد سودمند روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے۔ مختصراً یہ کہ آج کے لوگوں کو سابقہ زمانے کی جس صوفیانہ دانش کی تلاش ہے وہ دراصل تسلّط پسند معاشرے کی نہیں بلکہ شراکتی معاشرے کی مخصوص روحانیت کی تلاش ہے۔

اساطیری اور آثاریاتی شہادتوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ تسلّط سے قبل کی معاشرتی ذہنیت کی انتہائی قابل ذکر کوالٹی یہ تھی کہ یہ ساری فطرت کے ساتھ ہماری یگانگت (oneness) کو تسلیم کرتی تھی جو کہ جدید حجری اور کریٹ انداز پرستش کی تہہ میں پائی جاتی تھی۔ متعدد جدید ماہرین ماحولیات نے اپنی تصانیف میں بکثرت اس رائے کا اظہار کیا ہے کہ سابق دور کی یہ

ذہنی کوالٹی جو ہمارے زمانے میں اکثر کسی قسم کی مشرقی روحانیت سے منسلک پائی جاتی ہے آج کے بربادیٔ ماحول نظریئے (آئیڈیالوجی) سے کہیں زیادہ ترقی یافتہ تھی۔ درحقیقت یہ نظریہ ان نئے سائنسی نظریات کی پیشگی علامت ہے کہ کرۂ ارض کے تمام زندہ اجسام بمعہ فضا، سمندر اور مٹی ایک پیچیدہ اور آپس میں مربوط نظام زندگی ہیں۔ ماہر کیمیا جیمز لوّلاک اور ماہر خوردحیات (مائیکروبیالوجسٹ) لین مارگولس نے اسے ''نظریۂ گیا'' (Gaia hypothesis) قرار دیا ہے۔ ''گیا'' دیوی کے قدیم یونانی ناموں میں سے ایک نام ہے۔ (۶۴)

قدیم معاشرے کا کائنات پر حکمرانی کرنے والی مہربان وپرورش کنندہ ماں کا تصور نفسیاتی طور پر بھی بہت ڈھارس بندھاتا ہے اور وہ تادیب کنندہ (punitive) مرد دیوتاؤں سے کہیں زیادہ بہتر حکمرانی کرسکتی ہے جو اب تک ہماری زمین کے بیشتر حصے پر قابض چلے آرہے ہیں۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ مغربی تاریخ کے ہزاروں برس جس تسلسل سے عورتیں اور مرد، دونوں مسیحی کنواری مریم کے مجسمے کی آڑ میں شفیق اور رحمدل ماں کے تصور کے ساتھ چمٹے رہے ہیں وہ اس بھوک کی توثیق ہے جو انسان ایک دلاسہ دینے والی شبیہہ کے لئے اپنے اندر رکھتے ہیں تاہم بہت سے دیگر پہلوؤں سے تاریخ کے معمہ قسم پہلوؤں کی طرح یہ تسلسل اس سیاق وسباق میں قابل فہم ہے جو ہم زمانہ قبل از تاریخ میں دیوی پوجا کی ہزاروں سال پرانی روایت میں پاتے ہیں۔

لیکن یہ بعینہٖ اس لئے ہے کہ ہمارے ثقافتی ارتقا کی اصل سمت ہمارے ماضی اور ہمارے امکانی مستقبل پر ایسی غیر معمولی روشنی ڈالتی ہے کہ ہمارے لئے اس سے عہدہ برآ ہونا بہت مشکل ہوجاتا ہے اور چونکہ یہ مروّجہ نظام کے لئے اتنے بڑے خطرے کی نشاندہی کرتی ہے اس لئے اس کو دبانے کے لئے بے پناہ قوتیں صرف کردی جاتی ہیں۔

اس تحقیق کے باعث جس نے اب ہمیں اتنے بڑے آثاریاتی شواہد مہیا کر دیئے ہیں، انہیں تسلّط پر مبنی معاشرہ ٹھنڈے پیٹوں برداشت نہیں کرسکتا، چنانچہ ایسی بہت سی مثالیں سامنے آئی ہیں جو کہ اس معاشرے کے دست وبازو ان شواہد کو دبانے کے لئے بے حدوحساب کوششیں بروئے کار لارہے ہیں۔ اس کی ایک نمایاں مثال یہ ہے کہ کھدائی کی کم سے کم ابتدائی سطحوں تک رسائی نہ ہو پائی تھی کہ جیمز میلارٹ کو ہسلر کی جدید حجری سائیٹ

پر کھدائی کا کام فوراً روک دینے کا حکم دے دیا گیا۔ اور اس کا سبب یہ بتایا گیا کہ اس پر مزید کام سے وہی نتائج سامنے آئیں گے جو پہلے بھی موجود ہیں، اور اس کی کوئی سائنسی افادیت نہیں ہوگی۔ (۶۵) یہ فیصلہ میلارٹ کے احتجاج کے باوجود برقرار رہا۔ اگر چہ یہ اس وقت کیا گیا جب ڈھیر کے بیرونی حصوں کا (بشمول اردگرد واقع قبرستانوں کے) ابھی تک تفصیلی جائزہ نہیں لیا جاسکا تھا۔ آثاریاتی نقطۂ نظر سے یہ اس نوعیت کی تحقیق کے لئے ایک مثالی جگہ تھی۔ چونکہ مزید مالیاتی یا اداراتی سپورٹ حاصل نہیں رہی تھی، اس لئے کھدائیاں روک دینا پڑیں اس کے بعد سے خزانوں کے شکاریوں نے یہاں غیر سائنسی کھدائیاں جاری رکھیں جس کی وجہ سے یہ سائیٹ آثاریاتی لحاظ سے بے کار ہوگئی۔

ان اہم آثاریاتی کھدائیوں کو جلد بازی کا مظاہرہ کرکے روک دینے کے فیصلے میں بلاشبہ دیگر عوامل کا بھی دخل تھا، میلارٹ نے اس فیصلے کو تاریخِ آثاریات کے افسوسناک ترین ابواب میں شمار کیا ہے (۶۶) لیکن یہ سوال اپنی جگہ موجود ہے کہ اس فیصلے کے پیچھے اس نئے سامنے آنے والے علم کا دخل کس حد تک تھا کہ ہیسلر میں وافر اور متنوع آرٹسٹک سرگرمیوں کی شہادتیں موجود تھیں جیسا کہ میلارٹ نے لکھا ''وہاں سرشار کردینے والی ایک زبردست قوت، اناطولیہ کی عظیم دیوی کے مذہب کے آثار پائے جاتے تھے'' (۶۷)

جیسا کہ ہم اگلے ابواب میں دیکھیں گے دانشوروں کی مساعی جو حقیقت کو ایک عالمگیر نقطۂ نظر سے ہم آہنگ کرنے کے لئے کی جارہی ہیں، زمانہ قبل از تاریخ میں جاتی ہیں۔ یہ یقینی امر ہے کہ ہمارے ثقافتی ارتقا میں ڈرامائی تبدیلی کا بڑا ہتھیار ''خنجر'' تھا، مگر وہاں ایک اور ہتھیار بھی تھا جو اس سے بھی زیادہ طاقتور تھا، یہ ہتھیار خوش نویس اور سکالر تھا، اسے قلم کہیۓ یا آلۂ کندہ کاری جو کتبوں پر الفاظ کندہ کرتا تھا۔ خاص طور پر ہمارے زمانے میں جب ہم ایک پُرامن معاشرہ قائم کرنے کی کوشش کررہے ہیں یہ جاننے سے بہت فائدہ ہوگا کہ قلم تلوار سے زیادہ طاقتور ہوسکتا ہے کیونکہ آخر کار ظاہری طور پر یہی کمزور آلہ تھا جو حقیقت کو سر کے بل کھڑی کرنے والا تھا۔

باب6

تکذیبِ حقیقت: حصہ اول

''اوریسٹیا'' (Oresteia) یونان کے مشہور ترین اور بار بار دیکھے جانے والے ڈراموں میں سے ہے۔ اس کلاسیکل ڈرامے کے کردار ''اوریسٹیس'' پر اس الزام میں مقدمہ چلا تھا کہ اس نے اپنی ماں اور اس کے عاشق کو اس لئے قتل کر دیا تھا کہ ان دونوں نے مل کر اس کے باپ کو قتل کیا تھا۔ ''اپالو'' دیوتا وضاحت کرتا ہے کہ بچوں کی اپنی ماؤں سے کوئی رشتہ داری نہیں ہوتی۔ ''ماں اس کی والدہ نہیں ہوتی کہ اسے اپنا بچہ کہے وہ صرف اس بیج کی نگہدار ہوتی ہے جو اس کے اندر بویا گیا ہوتا ہے اور وہ وہیں اُگتا ہے'' (۱)

اپالو نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا ''میں نے جو وضاحت کی ہے، میں تمہیں اس کا ثبوت دکھاؤں گا، ایک باپ ماں کے بغیر بھی باپ ہوسکتا ہے، وہ جو سامنے کھڑی ہے وہ ایک زندہ گواہ ہے، یہ اولمپین ''زیئس'' کی بیٹی ہے۔ یہ وہ ہے جس کی افزائش کبھی رحم کی تاریکی کے اندر نہیں ہوئی تا ہم وہ ایک ایسی بچی ہے جسے کوئی دیوی نہیں لا سکی'' (۲)

وہ بات کرتے ہوئے یہاں تک پہنچا تو دیوی ''اتھن'' (ایتھنا) جو قدیم یونانی مذہب کی رُو سے اپنے باپ کے سر میں سے پوری کی پوری برآمد ہوئی تھی وہ اندر داخل ہوتی ہے اور اپالو کے بیان کی تصدیق کرتی ہے، بچوں سے صرف باپوں کا رشتہ ہوتا ہے۔ وہ کہتی ہے ''مجھے کسی ماں نے جنم نہیں دیا مگر جہاں تک شادی کا معاملہ ہے میں ہمہ تن مرد کے لئے تیار ہوں اور بھرپور طریقے سے باپ کی ہمنوا ہوں (۳)

چنانچہ ''یومینائڈز'' یا ''فیوریز'' نظامِ کہنہ کی نمائندگی کرتے ہوئے خوفناک انداز میں ہم

آواز ہوکر کہتی ہیں ''اے نوجوان نسل کے خداؤ تم نے پرانے زمانے کے قوانین کچل دیئے اور میرے ہاتھ سے چھین کر پھاڑ دیئے'' (۴) ایتھن اپنا فیصلہ کن ووٹ ڈالتی ہے اور ''اوریسٹس'' اپنی ماں کے قتل سے بری الذمہ قرار پاجاتا ہے۔

قتلِ مادر جُرم نہیں ہے

کوئی پوچھ سکتا ہے کہ کوئی شخص تمام انسانی رشتوں میں سے ایک مضبوط ترین اور واضح ترین انسانی رشتے سے انکار کیوں کرتا ہے؟ ''ایسکائیلس''(Aeschylus) جیسے ذہین وفطین ڈرامانویس کو اس موضوع کو مرکز بنا کر تین سلسلہ وار المیہ ڈراموں کا مجموعہ (Trilogy) لکھنے کی کیا ضرورت پڑ گئی تھی۔ یہ ''ٹرائیلوجی'' (تین ڈراموں کا مجموعہ) ایتھنز کے اس وقت کے تھیٹر میں کیوں دکھائے گئے (اس وقت کا تھیٹر ہمارے آج کے تھیٹر سے بالکل مختلف ہوتا تھا بلکہ حقائق پر مبنی ہوتا تھا) یہ ڈرامے دکھانے کا مقصد جذبات کو مروّجہ روایات کے عین مطابق ابھارنا تھا اور انہیں دیکھنے والوں میں عورتیں اور غلام بھی شامل تھے۔

اس سوال کے جواب میں کہ ڈرامہ ''اوریسٹیا'' کا صحیح معیار کے حوالے سے مقصد اور طریق کار کیا ہونا چاہیے تھا؟ اس کا ایک عالمانہ جواب یہ دیا گیا کہ اس کا مقصد ''یونانی اریوپیگس''(Greek Areopagus) یا ''قتل انسان'' کے مقدمے کا فیصلہ دینے والی اس عدالت کے منابع کی تفصیلات پر روشنی ڈالنا تھا۔ ازروئے قیاس یہ عدالت اپنے زمانے کے اعتبار سے نئی تھی، اس سے انصاف کا حصول بذریعہ غیر مشخصہ(impersonal) دستاویزاتِ مملکت ہونا چاہیے نہ کہ قبیلے کے انتقامی جذبے کی تسکین کے تحت دیا جانا چاہیے (۵) لیکن برطانوی ماہر عمرانیات جون راک ڈیل اس تعبیر کو مہمل و بے معنی قرار دیتے ہوئے کہتی ہے کہ یہ تو اس سوال کے مرکزی نقطے کے قریب بھی نہیں جاتی کہ ''قتلِ انسان کی یونانی عدالت'' کے سامنے بیٹے کے ہاتھوں ماں کے قتل کا اوّلین مقدمہ کیوں پیش ہوا اور نہ ہی اس میں اس سوال کے مرکزی نقطے کی طرف دھیان دیا گیا ہے کہ مملکت کے زیرانتظام قیامِ انصاف کے معاملے میں اس بیٹے کی حمایت میں ایک ''اخلاقی سبق'' یاد دلایا گیا ہے جس کی رُو سے اس کو جذبۂ انتقام کے تحت سوچے سمجھے اور سفاکانہ قتلِ مادر کے الزام سے بری کردیا گیا اور پھر واضح طور پر ایک بے ہودہ بنیاد گھڑی گئی کہ اس کا مقتولہ سے کوئی رشتہ

نہیں تھا۔ (۶)

اس سوال کے جواب میں کہ ''اوریسٹیا'' کس قسم کے رویوں کا اظہار اور توثیق کرتا ہے ہمیں ''ٹرائلوجی'' (تین سلسلہ وار ڈراموں) پر بحیثیت مجموعی نظر ڈالنا ہوگی۔ ان میں سے پہلے ڈرامے "Agamemnon" میں ملکہ کلٹمنسٹرا اپنی بیٹی کے خون کا بدلہ لینے کا فیصلہ کرتی ہے۔ ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس کے شوہر اگامنن نے ''ٹرائے'' کا سفر شروع کرنے سے پہلے اسے دھوکا دے کر اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ اپنی بیٹی ہمراہ لے جائے جہاں وہ اس کی شادی ''اکائیلز'' (ٹروجن وار کے جنگجو لیڈر) کے ساتھ کردے گا لیکن اس کا اصل مقصد یہ تھا کہ بحری سفر کے دوران اگر کشتیوں کا بیڑہ کہیں پھنس گیا تو اس کی قربانی دے کر بادبانوں کے لئے موافق ہوا کی دعا کی جائے گی۔ ٹروجن وار سے واپس آکر جب وہ اپنے گناہوں کو دھونے کی رسم کے طور غسل کرنے لگا تو ملکہ کلٹمنٹرا نے اس پر جال پھینکا، جس میں اس کے بازو الجھ گئے اور اس نے اسے چھرا گھونپ کر ہلاک کرڈالا۔ اس کے بعد ملکہ نے واضح کیا کہ اس نے یہ اقدام اپنی ذاتی رنجش اور نفرت کی بنا پر نہیں کیا بلکہ بطور سربراہ قبیلہ کے ایک رشتہ دار کا خون بہائے جانے کا بدلہ لینے کا سماجی کردار ادا کیا ہے۔ مختصراً یہ کہ اس نے یہ کام مادرسری معاشرے کی رسم پوری کرتے ہوئے کیا جو بطور ایک ملکہ اس کا فریضہ تھا کہ وہ انصاف ہوتا ہوا دیکھے۔

دوسرے ڈرامے "The Liberation-Bearers" میں اس کا بیٹا ''اوریسٹس'' بھیس بدل کر ''آرگوس'' میں پہنچتا ہے۔ وہ اپنی ماں کے محل میں بطور مہمان داخل ہوتا ہے اور ماں کے نئے عاشق ''ایجس تھس'' کو قتل کردیتا ہے اور پھر ذرا جھجکنے کے بعد اپنی ماں کو بھی قتل کردیتا ہے۔ تیسرے ڈرامے میں ''یومینائڈز'' ڈیلفی کے اپالو معبد میں ''اوریسٹس'' پر مقدمہ چلتا ہوا دکھاتا ہے۔ ہمیں بتایا جاتا ہے کہ یومینائڈز پرانے نظام کے نمائندوں کے طور پر اور محافظین معاشرہ کے طور پر اپنے کردار اور عدل گستری کے لئے ادائیگی فرض کے طور پر ''اوریسٹس'' کا تعاقب جاری رکھے ہوئے ہیں۔ اور اب ایتھنز کے بارہ شہریوں پر مشتمل جیوری، کو جس کی سربراہ ''ایتھین'' دیوی ہے یہ فیصلہ صادر کرنا ہے کہ کیا اسے بری کردینا ہے یا موت کی گھاٹ اتاردینا ہے اور چونکہ جیوری کے ووٹ برابر برابر ہیں ''ایتھین'' فیصلہ کن ووٹ دے دیتی ہے جس پر ''اوریسٹس'' کو اس بنا پر بری کردیا جاتا ہے کہ اس نے رشتے دار

کا خون نہیں بہایا۔

اس طرح ''اوریسٹیا'' ہمیں پیچھے اس زمانے میں لے جاتا ہے، وہاں جو کچھ ہوتا تھا اسے ''ایچ ڈی ایف کیٹو'' اور ''جارج تھامپسن'' جیسے کلاسیکی سکالرز مادرسرانہ نظام اور پدرسرانہ نظام کی چپقلش کہتے ہیں۔ (۷) اور ہماری اصطلاح میں یہ نظام شراکت داری سے نظام تسلط میں منتقلی ہوئی تھی اور اس کا جواز پیش کیا گیا تھا۔ جیسے کہ راک ویل لکھتا ہے، ''یہ صورت حال ہمیں پہلے ڈرامے میں کلٹمنسٹرا کے انصاف کو رضامندی سے قبول کرنے سے لے کر اس نقطے پر جا پہنچاتی ہے جہاں اس کی بیٹی کو فراموش کر دیا جاتا ہے، اس کی روح کے چراغ کو گل کر دیا جاتا ہے اور اس کے کیس کو کالعدم قرار دے دیا جاتا ہے کیونکہ عورتیں وہ حقوق اور صفات نہیں رکھتیں جن کا وہ خود دعویٰ رکھتی ہے (۸) اس لئے کہ اگر کلٹمنسٹر جیسی طاقتور مخلوق اپنی بچی ایفیگنیا کے قتل پر پیدا شدہ اشتعال کے باوجود حقِ انتقام نہیں رکھتی تو ایک عام عورت کیا حق رکھتی ہے؟''

اس ''مغرور و رخودسر'' عورت کے ساتھ جو کچھ ہوا جو اتنا جائز دعویٰ بھی رکھتی تھی، اس سے ملنے والے سبق کی وجہ سے تمام عورتوں کو حتمی طور پر اس سے روک دیا گیا ہے کہ وہ باغیانہ اقدامات کا کبھی خیال بھی دل میں لائیں۔ مزید برآں اس ناصحانہ ڈرامے میں ایتھین کا کردار بقول راک ویل ''ثقافتی سیاست کاری (ڈپلومیسی) کا ایک ماہرانہ فعل ہے جو ایک اہم ترین منتقلی (shift) کا مظہر ہے اس میں ایک عظم شخصیت کو بطور ایک شکست خوردہ فریق دکھایا گیا ہے جو نئی قوت کو تسلیم کر رہی ہے'' (۹)

ایتھین دو حیثیتیں رکھتی ہے، وہ دیوی کی براہ راست جانشین اور ایتھنز شہر کی روحانی سرپرست بھی ہے۔ اس نے مرد کی بالادستی تسلیم کر لی اس کے بعد اس بالادستی کو تسلیم کرنا ایتھنز کی ہر عورت کا فریضہ بن گیا۔ اسطرح اقتدار اور املاک جو پہلے پورے قبیلے یا معاشرے کی ملکیت تھیں وہ نجی ملکیت میں چلی گئیں ساتھ عورتیں بھی مردوں کی ملکیت بن گئیں۔ جیسا کہ جون راک ویل لکھتی ہے ''اگر قتلِ انسان کی اس نئی عدالت کا پہلا مقدمہ ثابت کرتا ہے کہ قتلِ مادر ایک گھناؤنا جرم نہیں ہے کیونکہ شجرۂ مادری پر مبنی رشتہ کوئی رشتہ نہیں ہوتا تو بلاشرکتِ غیرے باپ کے توارث پر مبنی رشتے کے حق میں کونسی کوئی بہتر دلیل لائی جاسکتی ہے'' (۱۰)

MashalBooks.org

''اوریسٹیا'' میں ایتھنز کا ہر شہری دیکھ سکتا تھا کہ بالآخر قدیم ''فیوریز'' یا ''فیٹس'' نے کس طرح اعترافِ شکست کیا۔ مرد کے غلبے پر مبنی نظام قائم ہوگیا نئے طور طریقوں نے پرانے طور طریقوں کی جگہ لے لی، ان کا غم وغصہ بے جا اور بے سود تھا۔ مکمل شکست کھانے کے بعد ''فیوریز'' قدیم قلعے ''ایکروپولس'' کے نیچے غاروں میں منتقل ہوگئیں کیونکہ ایتھین نے ان سے ''اصرار'' کیا تھا کہ وہ ایتھنز ہی میں قیام کریں۔ اس نے غیر معمولی موقف کا اعادہ کرتے ہوئے کہا کہ کسی کا اپنی ماں کو قتل کر دینا رشتۂ خون کا ضیاع نہیں اور نہ ہی فیصلہ کن ووٹ ڈالنا کوئی غلط بات ہے۔ اب واضح طور پر ماتحتی قبول کرنے کے بعد وہ اپنے پرانے اختیارات، دیوی کے اختیارات کو واپس لینے کی التجا کرتی ہیں اور وعدہ کرتی ہیں کہ وہ ایتھین کی تابع فرمان بن کر ''اس شہر کی حفاظت کریں گی جس پر عظیم دیوتا Zeus اور دیوتائے جنگ Ares کی حکمرانی قائم ہے۔'' (۱۱)

چونکہ اولمپئین زمانے سے پہلے دور کے نسوانی اقتدار کی آخری نشانیوں کے طور پر ''فیوریز'' اب بھی عورتوں اور مردوں کی تقدیریں بنائیں گی وہی فیصلہ کریں گی کہ نئی مخلوق کو کب جنم لینا اور کب مرنا ہے۔ جیسا کہ راک ویل لکھتی ہے ''ہندو علم الاصنام کی رُو سے جس میں کالی ماتا زندگی وموت کے فیصلے کرتی ہے، عورت ہی جنم دیتی ہے اور موت کا سبب بھی بنتی ہے'' (۱۲) لیکن اب عورت کے اقتدار کی ان باقی ماندہ نمائندوں کو دھکیل کر زیر زمین کر دیا گیا ہے کیونکہ یہ نئے مرد دیوتاؤں کے زیرِ تسلّط نظام میں کم درجے کی مخلوق ہیں۔

غلبہ وتسلط کا ذہن بمقابلہ شراکت دار ذہن

''اوریسٹیا'' کا مقصد لوگوں کے تصورِ حقیقت کو متاثر کرنا اور اس کو تبدیل کرنا تھا۔ اس میں حیرت انگیز امر یہ ہے کہ پانچویں صدی قبل مسیح میں ''اکائینوں'' کے ایتھنز میں برسرِاقتدار آنے کے تقریباً ایک ہزار برس بعد بھی یہ تبدیلی ضروری سمجھی جاتی تھی۔ اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ اس کے آخر میں گایا جانے والا کورس جو خود یومینائیڈز کی ترجمانی کرتا ہے اسے ''اوریسٹیا'' کا خلاصہ کیسے پیش کرنا چاہیے: ''کہ کیا انہیں مجھ سے یہی سلوک کرنا چاہیے کہ میں جو گزرے زمانے کا شعور ہوں اسی قابل ہوں کہ مجھے بے خانماں کر کے مٹی کی طرح زمین کے اندر دھکیل دیا جائے۔'' (۱۳)

اگرچہ ایسکائیلس کے زمانے میں ماضی کا یہ ذہن ابھی تک مکمل طور پر تباہ نہیں کر دیا گیا تھا، اب یہ امکان موجود تھا کہ کسی بہت اہم تقریباتی موقعے پر یہ اعلان کر دیا جاتا کہ مردوں نے عورتوں کی جتنی حق تلفیاں کی ہیں۔ حتیٰ کہ ایک بیٹی اپنے حقیقی باپ کے ہاتھوں قتل ہوئی ہے، ان سب کو فراموش کر دیا جائے۔ لوگوں کا ذہن پہلے ہی سے اس حد تک تبدیل ہو چکا تھا کہ اب یہ کہا جا سکتا تھا کہ درحقیقت ماں اور بچے کے درمیان کوئی رشتہ نہیں۔ یعنی حقائق کی دنیا میں شجرۂ مادری کی کوئی بنیاد نہیں جبکہ اس کے برعکس شجرۂ پدری ایک بنیاد رکھتا ہے۔

اس سے تقریباً دو ہزار سے زائد عرصے کے بعد مغربی سائنس کی چند جغادری ہستیاں مثلاً انیسویں صدی میں ہربرٹ سپنسر جیسے لوگ یہ دعویٰ کر کے مردانہ اقتدار پر یوں ''روشنی'' ڈال رہے تھے کہ عورتیں مردوں کے نطفے کی افزائش و پرورش کی ''مشین''(Incubators) سے زیادہ کوئی اہمیت نہیں رکھتیں (۱۴) اس سائنسی گواہی کی روشنی میں کہ ایک بچہ اپنے باپ اور ماں سے برابر برابر ''جینز'' وصول کرتا ہے، یہ تصوّر کہ بچے اور ماں کے درمیان کوئی اشتراکِ خون(Kinship) نہیں ہمیں سکولوں اور یونیورسٹیوں میں اب نہیں پڑھایا جاتا اور ہمارے اب بھی طاقتور ترین مذہبی لیڈر اور ہمارے بے حد قابل احترام سائنسدانوں میں سے بھی بہت سے سائنسدان ہمیں بتا رہے ہیں کہ خدا نے عورتوں کو دنیا میں بس ایک ہی مقصد کے لئے بھیجا ہے کہ وہ مردوں کو بچے اور ترجیحاً بیٹے مہیا کریں۔

ہم اپنے زمانے میں بچوں کی شناخت بدستور آبائی ناموں سے کرتے ہیں اور ان کا صرف باپ کے ساتھ رشتہ ظاہر کرتے ہیں۔ علاوہ ازیں لاکھوں مغربی خاندان منبر پر سے ہونے والی بائیبل خوانی سننے کے عادی ہیں، گھر میں بھی باپ کی زبانی بائیبل سنتے ہیں۔ ہم بائیبل میں بے شمار پیدائشیں باپ کے ذریعے ہونے کا تذکرہ پاتے ہیں، ہم بائیبل کے صرف ان ابواب کا ذکر کرتے ہیں جن میں کسی اہم فرد کی شناخت کراتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ یہ اپنے باپ کا بیٹا ہے۔ حتیٰ کہ بنی اسرائیل (جُملہ انسانیت اور خودنجات دہندہ مسیحا) کی شناخت خداوند خدا کے بچوں کے طور پر کی جاتی ہے۔ (۱۵)

ہزاروں برسوں کی سرتوڑ کوششوں اور مسلسل تلقین کے بعد جو عقیدہ ہم پر ٹھونس دیا گیا وہ ہمارے لئے ''محض ایک حقیقت'' بن گیا۔ لیکن وہ ذہن جسے بھگا دیا گیا (وہ ذہن جو دیوی کی پرستش کرتا اور اسے جُملہ زندگی کی خالق بلکہ جانوروں اور درختوں کی بھی خالق سمجھتا تھا)

اس کے نزدیک حقیقت بالکل ایک دوسری چیز ہوگی۔

ایسا ذہن جو مادریؔت پر استوار معاشرت میں ڈھلا ہو جس میں حسب ونسب ماں سے چلتا ہو، عورتیں ؤ ہی سربراہ قبیلہ، پادری اور عزت اور وقار کے سارے مناصب پر فائز ہوں، اس کو پدریت پر استوار طرز معاشرت، جس میں عورت کی حیثیت گھٹا گھٹا کر مرد کی نجی ملکیت بنادی گئی ہو، بمشکل ہی ''فطری'' دکھائی دے گی۔ جہاں تک ایک بیٹے کا تعلق ہے جسے قتلِ مادر پر مبنی پر انصاف سزا نہیں ملی ایسے ذہن کے لئے حقیقت بالکل ماورائے فہم رہے گی جیسا کہ ''ایسکائلس'' کے ڈرامے میں ''یومینائیڈز'' کے لئے تھی۔ اسی طرح یہ تصور بعید الفہم اور حقیقتاً کافرانہ ہوگا کہ کائنات پر حکمرانی کرنے والی عظیم ترین قوتوں کو ہتھیاروں سے لیس اور منتقم دیوتاؤں کی صورت میں متشکل کردیا جائے جو نہ صرف بھیانک جرم کو نظرانداز کردیتے ہیں بلکہ راست بازی اور اخلاقیات کے نام پر یہ فیصلہ دے دیتے ہیں کہ مرد قتل وغارت، لوٹ مار اور عصمت دری جیسے اقدامات عادتاً کرتے ہیں۔

مختصراً یہ کہ یہ قدیم ذہن نئے نظامِ تسلّط کے اندر رہ کر کام کرنے کے لئے بالکل غیر موزوں تھا۔ ایک خاص وقت کے لئے شاید وحشیانہ قوت اور دھمکیوں سے اس کا راستہ روکا جاسکتا تھا لیکن آخر کار لوگوں کے احساسات اور ادراکِ حق میں مکمل تقلیب سے کمتر کوئی چیز کام نہیں دے گی۔

لیکن یہ کیسے کیا جاسکتا ہے؟ ذہنوں کی یہ تقلیب کیسے ہوسکتی ہے؟ یہ ایک مسحور کن بات ہے کہ ہم ایک بار پھر اپنے ثقافتی ارتقا میں بھاری بھرکم تبدیلی کی دہلیز پر آ کھڑے ہوئے ہیں۔ اس سوال پر کہ انتہائی عدم توازن کے ادوار میں نظام کیسے منہدم ہوتے ہیں اور مختلف نظام ان کی کیسے جگہ لیتے ہیں، سائنسدان اس کا گہری نظر سے مطالعہ کر رہے ہیں۔ (١٦) ایک سماجی نظام دوسرے سماجی نظام کی جگہ کیسے لیتا ہے، اس پر چلّی میں ''ہُمبر ٹومیچورانا'' اور ''فرانسیسکو وریلا'' کام کر رہے ہیں جبکہ اس نقطے پر ہنگری میں ''ویلموس سانی'' اور ''جیورجی کمپس'' زندہ نظاموں کی خودتنظیمی کی صلاحیت کے حوالہ سے تحقیق کر رہی ہیں، اور وہ اسے ''خودزائیدگی''(antogenesis) کا مظہر قرار دیتی ہیں۔ (١٧) ''سانی'' کہتی ہے کہ جس طرح مختلف نظام خود کو ایک خاص شکل اور طریق کار کے تحت برقرار رکھتے ہیں یہ ''عملِ اعادہ'' (replication) ہوتا ہے۔ درحقیقت اس کا ''حیاتیات'' کی سطح پر اچھی طرح مشاہدہ کیا جاسکتا

ہے۔۔ اس میں ''خلیئے'' (cells) مسلسل حرکت میں رہتے ہیں اور بنتے چلے جاتے ہیں، پرانے خلیوں کی جگہ نئے خلئے لے لیتے ہیں۔ بگاڑ اور بناؤ کا یہ سلسلہ ''جنیاتی ضابطے'' (DNA) کے مطابق چلتا ہے۔ مگر یہ عمل تمام سطحوں پر رونما ہوتا ہے: مالیکولر، حیاتیاتی اور سماجی سطحوں پر مشاہدے میں آتا ہے کیونکہ ہر نظامَ کا اپنا اپنا نوعی ضابطہَ اعادہ ہوتا ہے جو ایک مخصوص طریقے سے خود کو برقرار رکھتا، توسیع پاتا اور استحکام حاصل کرتا رہتا ہے۔ (۱۸)

''سانی'' کا کہنا ہے کہ سماجی نظاموں کی تشکیل اور پھر ان کی حالتِ قرار سے قبل ان سے بھی زیادہ ضروری چیز ان کا اوّلین وجود ہوتا ہے۔ اور ان کی خاص قسم کی ''معلوماتِ اعادہ'' (replicative informations) ہوتی ہیں جو شراکت پراستوار معاشرے یا سماج کے لئے موزوں ہوتی ہیں (مثلاً مساوات کا بنیادی تصور) لیکن تسلّط پر مبنی معاشرے یا سماج کے لئے کلیتاً غیرموزوں ہوتی ہیں۔ ان دونوں قسم کی سماجی تنظیمات کے لئے جو جو باتیں درست اور مطابقِ معمول'' ہوتی ہیں، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں، ایک دوسری سے بقدر قطبین مختلف ہوتی ہیں۔

چنانچہ ایک شراکتی سماج کو طاقت وجبر پر مبنی سماج میں بدلنے کے لئے ''معلوماتِ اعادہ'' میں بنیادی نوعیت کی تبدیلیاں لانا پڑتی ہیں۔ علم الحیات (بیالوجی) کے حوالہ سے ایسے کام کے لئے مکمل طور ایک مختلف ضابطہَ اعادہ (replicative code) درکار ہوتا ہے اور یہ ہر مرد، عورت اور بچے کو ذہن نشین کرنا پڑتا ہے تاکہ اُن کے تصورِ حقیقت میں اتنی تبدیلی آجائے کہ وہ جبر وتسلّط پر مبنی سماج کے تقاضوں کو اچھی طرح سمجھ کر خود کو اس کے مطابق ڈھال سکیں۔

ایک طریقِ عمل جو ہزارہا برسوں سے چلتا آیا ہے اور آج ہمارے دور میں بھی چل رہا ہے، اسے پوری طرح بیان کرنا تو درکنار اس کے آغاز کی کہانی تک یہاں ان صفحات میں نہیں سموئی جاسکتی۔ اس طریق عمل میں انسانی ذہن پر کبھی بربریت کے دورے پڑرہے ہوتے اور وہ عیّاری اور پُراسراریت سے کام لے رہاہوتا، کبھی جان بوجھ کر اور کبھی بے شعوری کے ساتھ نئے قسم کا ذہن بنارہاہوتا جوکہ ہمارے ثقافتی ارتقا میں زبردست تبدیلی کے لئے درکار ہوتا تھا۔ یہ ایک ایسا طریقہ تھا، جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں وہ اپنے ساتھ بے پناہ ماڈی تباہ کاریوں کو لے کر مختلف تاریخی ادوار میں سے گزرتا رہا۔ جیسا کہ ہم اب بھی بائبل

میں پڑھ سکتے ہیں کہ عبرانی اور بعدازاں عیسائی اور پھر مسلمان بھی عبادت گاہوں کی توڑ پھوڑ کرتے رہے۔ مقدس درختوں کے جھنڈ کے جھنڈ کاٹے جاتے رہے اور بت پرستوں کے بتوں کو ریزہ ریزہ کردیا جاتا رہا۔ (۱۹) اس میں روحانی تباہی بھی شامل تھی۔ یا پھر ایک ایسا طریقہ تھا جو تاریخ کے مختلف ادوار میں تسلسل کے ساتھ جاری رہا وہ یہ تھا کہ جو لوگ حقیقت کو مروجہ طریقے کے مطابق تسلیم نہیں کرتے تھے ان کی کتابوں کو نذر آتش کردیا جاتا بدعتیوں اور ملحدوں کو جلایا جاتا اور نت نئی ایذائیں پہنچائی جاتیں۔ اس طرح ان سے حقیقت جبراً منوالی جاتی۔

اس کے دو طریقے تھے، ایک براہ راست ذاتی جبر کا طریقہ تھا اور دوسرا بالواسطہ۔ انہیں تھوڑی تھوڑی دیر کے بعد مجرموں پر مقدمہ چلنے کی کاروائی یا انہیں پھانسی دیئے جانے کے مناظر دکھا کر خوفزدہ کیا جاتا۔ جو لوگ تسلط پر مبنی معاشرے کے اطوار پر ایمان نہ لاتے ان کی ایک مخصوص طریق کار کے تحت حوصلہ شکنی کی جاتی۔ یہ طریقے روزمرہ کی زندگی کے تمام پہلوؤں بچوں کی پرورش ونگہداشت، قوانین اور تعلیمی اداروں کا حصہ بن گئے۔ سماجی زندگی کو ڈھالنے کے ان طریقوں سے ایک قسم کی معلوماتِ اعادہ (replicative information) جو تسلط پر مبنی معاشرے کے قیام اور استقراء کے لئے درکار ہوتیں پورے وَسماجی نظام کی تمام سمتوں میں بکھیر دی گئیں۔ ہزاروں برسوں میں اس سماجی نظام کے اہم ہتھیاروں میں سے اہم ترین ہتھیار ''روحانی تعلیم'' تھی جس کا سلسلہ قدیم طبقۂ پادریاں تھا، یہ ریاستی قوت کا جزوِ لاینفک تھا، یہ سارے کا سارا مردوں پر مشتمل ہوتا تھا اور اس کے ارکان معاشرے میں بلند مقام رکھتے تھے۔ یہ ہر کہیں حکمرانی کرتے اور اپنے ماننے والوں کا خوب استحصال کرتے رہتے۔

اب پادری جو کچھ کہتے اس، خدا کے کلام کے طور پر پھیلاتے گویا کہ کلامِ خدا انہیں جادوئی طریقے سے موصول ہوا تھا۔ انہیں فوجوں، عدالتوں اور جلاّدوں کی بھرپور پشت پناہی حاصل تھی لیکن ان کی حتمی کمک دنیاوی نہیں بلکہ روحانی تھی۔ ان کے قوی ترین ہتھیار ''مقدس'' کہانیاں، رسمیں اور جاری کردہ فرمان تھے جن کی ''عظمت'' خاص خاص طریقوں سے عقیدت مندوں کے ذہنوں میں ڈرخوف اور ترغیبات پیدا کرکے بٹھائی گئی تھی۔ ان روحانی احکامات کو خداوندی مرتبے کی پُراسرار ہستیوں کے فرمان کے طور پر قبول کیا جاتا تھا۔

کیونکہ لوگوں کر بڑھادیا گیا تھا کہ آسمانی ہستیوں نے یہ اپنے ارضی نمائندوں کے ذریعے ارسال کئے ہیں، ان کی اطاعت ہی میں خدا کی اطاعت مضمر ہے جس کے ہاتھ میں موت، زندگی، خوش قسمتی ور بدقسمتی کے فیصلے ہیں۔ اس وقت سے آج تک ان کی بات ''خدا کی مرضی'' کے طور پر مانی جارہی ہے۔

آج بھی لوگ انہی مقدس کہانیوں سے یہ معلوم کرتے ہیں کہ ان کے لئے کیا اچھا ہے اور کیا بُرا ہے، کس چیز کی تقلید کی جائے اور کس سے نفرت کی جائے۔ کس چیز کو خدا کا حکم سمجھ کر قبول کیا جائے، نہ صرف اپنے لئے بلکہ دوسروں کے لئے بھی کیا اچھا اور کیا بُرا ہے۔ انہی کہانیوں اور رسوم سے لوگ شگون بھی لیتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں اخذ شدہ پیغامات دماغ کے عمیق ترین گوشوں میں بھی گھس جاتے ہیں۔ جنہیں اس ہمارے زمانے میں بھی مقدس اور ناقابل تردید صداقتیں سمجھا جاتا ہے۔

پادریوں نے اس قسم کی کہانیوں پر تقدّس کے اتنی دبیز پردے تان رکھے تھے کہ آج کی دنیا میں ان کا تصور کرنا بھی ناممکن ہے ماضی میں جتنا کچھ پڑھنے یا ان پڑھ ہونے کی صورت میں کسی سے سننے کے جو مواقع دستیاب تھے بہت ہی محدود تھے۔ اوّلاً تو وہی نظریات پڑھنے یا سننے کو ملتے تھے جن کی سرکاری طور پر اجازت ہوتی تھی۔ مزید برآں ایسے نظریات کا اعادہ تقریباً ناممکن تھا جن سے سرکار کی طرف سے منظور شدہ نظریئے کا کھوکھلا ہوجانے کا خدشہ ہو کیونکہ اگر کوئی شخص مذہبی سنسرشپ سے کسی نہ کسی طرح بچ بھی نکلتا تب بھی کفریہ کلمات کہنے والے کو شدید اذیت یا سزائے موت سے دوچار ہونا پڑتا تھا۔

اس وقت کی طرح آج بھی قدیم داستانوں، رسموں، مقفیٰ شاعری اور گیتوں کی عوامی یادداشتیں موجود ہیں لیکن رفتہ رفتہ ہرگزرتی نسل کے ساتھ ان میں تحریف ہوتی رہی یا انہیں توڑ مروڑ کر بالکل ہی مسخ کردیا گیا، یہ تحریف یا توڑنا مروڑنا پادریوں، شاعروں اور کاتبوں کے ہاتھوں ہوا جنہوں نے بزعم خود اس طریقے سے خدا کی خوشنودی حاصل کی تھی۔

بلاشبہ ان میں ایسے لوگ بھی تھے جن کا کہنا تھا کہ انہوں نے جو کچھ کیا وہ خدا کی مرضی سے ہوا، اسی نے ان کے دل میں بات ڈالی کہ تم یوں کو یوں میں بدل ڈالو۔ خواہ یہ دیوتاؤں، رسولوں، بشیوں یا بادشاہوں کی خوشنودی کے لئے یا ان کے خوف کے تحت کیا، ایسا زبانی ہوا یا تحریری طور پر ہوا محض سماجی تبدیلی کے طور پر نہیں ہوا یہ سوچوں کے طریق کار کا ایک

جز و لاینفک تھا جس کو مرد کے زیرِ تسلّط قائم ایک وحشی اور نظام مراتب کے حامل سماج میں نہ صرف ایک نارمل بات کے طور پر دیکھا گیا بلکہ درست اور حق بھی مانا گیا۔

داستان کی قلبِ ماہیت

برطانوی مصنف جارج آرویل نے اپنی کتاب ''۱۹۸۴'' میں ایک ایسا زمانہ آنے کی پیشگوئی کی جب ''وزارتِ سچائی'' سب پرانی کتابوں اور تصوّرات کو نئے سرے سے لکھوائے گی تاکہ یہ برسرِ اقتدار برسرِاقتدار لوگوں کی ضروریات کے مطابق ڈھل سکیں (۲۰) لیکن خوفناک بات یہ ہے کہ یہ کام آج تک نہیں ہو سکا جبکہ قدیم دنیا میں یہ بہت پہلے اور ہر جگہ پہلے ہی ہو چکا تھا۔ [۲۱]

مشرق وسطیٰ میں پہلے میسوپوٹیمیا اور کنعان میں اور بعدازاں جوڑا اور اسرائیل کی عبرانی بادشاہتوں میں مقدس کہانیاں ازسرِ نو لکھی گئیں اور ان کے ساتھ ساتھ ''مجموعہ ہائے قانون'' بھی نئے سرے سے لکھے گئے۔ یہ کام زیادہ تر پادریوں کے ہاتھوں انجام پایا۔ جبکہ قدیم یورپ میں یہ کام اوّلین مردانہ ریاست کے حملوں سے شروع ہوا اور ہزاروں برس جاری رہا اور مصر، سمیر اور ہلال احمر کے تمام ممالک رفتہ رفتہ مردانہ تسلّط اور جنگجو معاشروں میں تبدیل ہوتے چلے گئے اور جیسا کہ محققین بائیبل نے وسیع پیمانے پر شہادتیں جمع کی ہیں داستانوں کی تشکیل نو ۴۰۰ قبل مسیح تک جاری رہا جبکہ سکالرز بتاتے ہیں کہ عبرانی پادریوں نے اس وقت آخری بار عبرانی بائیبل (عہد نامۂ عتیق لکھا تھا۔ [۲۲]

جن داستانوں اور قوانین نے ہم اہل مغرب کے ذہنوں پر بے پناہ اثرات ڈالے ہیں، انہیں مختصر کر کے جس ایک مقدس کتاب کی شکل دی گئی ہے وہ ہمارے بائیبل کا پہلا نصف حصہ ہے جو یونان میں ''ایسکائلس'' کے ''اوریسٹیا'' لکھنے سے تقریباً ایک سو سال بعد مکمل ہوا تھا۔ اس وقت فلسطین میں بائیبلی نظامِ عقائد جس پر یہودیت، عیسائیت اور اسلام اب تک استوار تھے، اس کی پھر چھاں پھٹک، تدوین اور اضافے ہوئے، یہ کام عبرانی پادریوں نے کیا جنہیں بائیبلی سکالرز "P" یا ''پرسٹلی سکول'' سے شناخت کرتے ہیں۔ انہیں یہ لیبل سابقہ Re-mythers مثلاً "E" یا ''ایلوہم سکول'' کے ممیّز کرنے کے لئے دیا گیا ہے جنھوں نے ''شمالی کنگڈم آف اسرائیل'' اور "J" یا ''جاہوے سکول آف دی ساؤدرن'' کنگڈم

آف جوڈیا'' تحریر کی تھیں۔ ان E اور J ایڈیٹوریل ٹیموں نے اس سے قبل بابل اور کنعان کی داستانیں ازسرنو لکھی تھیں اور Hebraic تاریخ بھی قلمبند کی تا کہ اس سے ان کی مطلب سرآری ہو سکے۔ اب P ٹیم ان غیر متجانس قدیم متون کو لکھنے اور ایک نیا مقدس بقول بائیبل سکالرز کے ، جنھوں نے مشہور ڈارٹ ماؤتھ بائیبل کی شرح نگاری کی تھی، یہ تھا کہ ''تھیوکریٹک سٹیٹ کے بلیو پرنٹ کو حقیقت کا جامہ پہنایا جائے''۔ (۲۳)

انہی مذہبی سکالرز نے ہمیں بتایا کہ خواہ یہ سیاسی محرکات کے تحت ازسرنو داستان نویسی سازش افکار ہے یا نہیں ہے لیکن سازشِ اعمال ضرور ہے۔ ڈارٹ ماؤتھ بائیبل کے شرح نگار P یا پریسٹلے سکول کے بارے میں لکھتے ہیں ''انہوں نے J اور E کے مواد کو مدغم کر کے معروفِ زمانہ P کی لڑی متعارف کرادی'' آگے چل کر انہوں نے لکھا ''پریسٹلے مصنفین کی بعد میں لکھی ہوئی عبارتوں کی مقدار اور نوعیت ان لوگس کو، جو ان کے کام سے ناواقف ہیں، حیرت زدہ کر دیتی ہے۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس میں تقریباً نصف حصہ خمسۂ موسیٰ (پیدائش، خروج، احبار، گنتی، استثنا یعنی Pentatevch) شامل کر دیا گیا ہے بہت سے سکالرز P کی طرف ''پیدائش'' کے ۵۰ میں سے ۱۱ ابواب، خروج کے ۴۰ میں سے ۱۹، ابواب، گنتی کے ۳۶ میں سے ۲۸ ابواب اور احبار پوری کی پوری منسوب کر دیتے ہیں''۔ (۲۴)

علاوہ ازیں بہت سا مواد جو پہلے مقدس سمجھا جاتا تھا Apocrypha کے بعض حصوں کی طرح ترک کر دیا گیا۔ مزید برآں جیسا کہ ہمیں ڈارٹ ماؤتھ بائیبل کے بارے میں یہ بتایا جاتا ہے کہ یہاں ''اس زمانے کی بعض رسوم کی باضابطہ اجازت دے دی گئی اور ان کے ماخذ کو ماضئ بعید میں دھکیل دیا گیا یا بہت سے احکام کو منبع خدائی سے منسوب کر دیا گیا ہے'' (۲۵) مختصر یہ کہ ڈارٹ ماؤتھ بائیبل کے الفاظ میں داستانوں کی اس ازسرنو تدوین کے بعد جو کچھ ہمارے پاس عہدنامۂ عتیق کی صورت میں آیا ہے وہ محض ایک عمل پیوند کاری ہے'' (۲۶) اس سے اس کے وضاحت سامنے آتی ہے کہ ''بائیبل میں وحدت کا تاثر'' (۲۷) دینے کی کوششوں کے باوجود بہت سے تضادات اور داخلی بے ربطیاں کیوں پائی جاتی ہیں۔ اس کی ایک مشہور مثال کتاب پیدائش کے باب ۱ میں تخلیقِ انسان کے بارے میں دو بالکل مختلف کہانیاں پائی جانے کی ہے۔ پہلی کہانی بتاتی ہے کہ خدانے عورت اور مرد کو ایک ساتھ پیدا کیا، دوسری کہانی جو نسبتاً زیادہ واضح ہے اس میں کہا گیا ہے کہ حوا کو بعد از عمل خیال کے تحت

آدم کی پسلی میں سے پیدا کیا گیا تھا۔

یہ بہت سی عدم مطابقتیں قدیم اور نئی حقیقتوں کے درمیان پہلے سے جاری چپقلشوں کی طرف واضح اشارے دیتی ہیں۔ قدیم حقیقتیں عوامی ثقافت کے اندر اب تک موجود چلی آرہی تھیں اور نئی حقیقتیں وہ تھیں جو حکمران پادری طبقہ مسلط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ بعض اوقات قدیم وجدید معیاروں کے درمیان کشمکش نمایاں دکھائی دیتی ہے جیسا کہ اولین انسانی جوڑے کی ''مبنی برمساوات'' بہ مقابلہ ''مبنی پر مردانہ برتری'' کہانی ہے لیکن اکثر و بیشتر پرانے اور نئے کے درمیان فرق کم نمایاں ہوتا ہے۔

اس نقطے کے بارے میں حیرت انگیز بات بائبل میں سپنی کا ذکر ہے بے شک باغِ عدن سے انسانیت کے اخراج میں مادہ سانپ کا کردار پہلے سے ایک موجود حقیقت کے سیاق وسباق میں سمجھ میں آنے لگتا ہے یہ وہ حقیقت ہے جس میں مادہ سانپ دیوی کی واضح علامات میں سے ایک تھی۔

جدید حجری دور کی جُملہ آثاریاتی کھدائیوں میں سے مادہ سانپ بیشتر بنیادی تصورات میں سے ایک نمایاں تصور پائی گئی ہے۔ گمبوٹس لکھتی ہے ''سانپ اور اس کے تجریدی ماخوذ، مرغولے (Spirals) قدیم یورپ کے آرٹ کے امتیازی پہلو ہیں'' (۲۸) وہ مزید بتاتی ہے کہ سپنی اور دیوی کی رفاقت تاریخی ادوار میں بھی چلی آتی رہی ہے، نہ صرف کریٹ کی طرح اصل شکل میں بلکہ بہت سے دورِ متاخر کی یونانی اور رومی داستانوں کی شکل میں بھی موجود رہی مثلاً ''ایتھنی''، ''ہرا''، ''دیمیتر''، ''اثارگیٹس'' اور ''ڈیا سیریا'' کے آرٹ کے نمونوں میں پائی گئی۔ ۶ یہی صورتحال مشرق وسطیٰ اور بیشتر مشرق کی تھی۔ میسوپوٹیمیا میں ۲۴ ویں صدی قبل از مسیح کی کھدائی میں ایک ایسی دیوی برآمد ہوئی جس کی گردن کے گرد سپنی لپٹی ہوئی بنائی گئی تھی۔ اس طرح کی ایک شکل ۱۰۰ سال قبل مسیح کے ہندوستان کی کھدائی میں سے برآمد ہوئی۔ (۳۰) قدیم مصری منمیات کے مطابق دنیا کی اصل خالق ''Uazit'' نامی کوبرا دیوی تھی۔ کنعان کی دیوی ''اشٹورتھ'' یا 'اسٹارٹے'' کو سپنی کی صورت میں ظاہر کیا گیا ہے۔ سمیریا کی ابھرواں منبت کاری میں شجر زندگی کی دیوی میں ہم دیوی کی دوشبیہوں کے بالکل قریب دوسپنیاں پاتے ہیں۔ (۳۱)

سپنی واضح طور پر بہت اہم، بہت مقدس اور دیوی کی قدرت کی ہمہ گیر اور ہر جگہ موجود

علامت ہے جسے ہرگز نظرانداز نہیں کیا جاسکتا۔ اگر قدیم ذہن کو نئے سرے سے ڈھال کر نئے نظام کے تقاضوں کے مطابق بنایا جائے تو سپنی کو نئے حکمران طبقوں کی علامات میں سے کسی کی علامت بنایا جائے گا یا متبادل صورت میں شکست خوردہ، بگڑے ہوئے یا رسوا شدہ طبقوں کی علامت سمجھا جائے گا۔

اس طرح یونانی اساطیریات میں اولمپئین زیئس کے پہلو میں سپنی نئے اقتدار کی علامت بن گئی ۔ (۳۲)علیٰ ہذا القیاس''ایتھنے'' کی ڈھال پر ایک سپنی کی شکل بنی ہوتی تھی لیکن اب وہ مکمل طور پر ایک تبدیل شدہ دیوی کی صورت میں عقل ودانش بلکہ جنگ کی دیوی بھی ہے۔ ایکروپولس میں ایتھنے کے معبد سے متصلerechthemمیں ایک زندہ سپنی بھی رکھی جاتی تھی۔ (۳۳)

یونان کے نئے انڈوپورپین صاحبان اقتدار نے سپنی کو مخصوص طریقے سے استعمال کر کے عملی سیاست کے بہت سے مقاصد حاصل کئے۔ اس نے نئے حکمرانوں کو ان کے اقتدار کا جواز تلاش کرنے میں مدد دی۔ وہ ایک طاقتور علامت ڈھونڈنے کے پریشان کن اثرات میں سے کامیابی سے عہدہ برآ ہوئے اور جو علامت ایک وقت میں غیروں کے ہاتھوں دیوی کے لئے مخصوص تھی وہ انہیں حاصل ہوگئی۔ ساتھ ساتھ یہ سپنی دیوی کی اس شکست کو بھی مستقلاً یاد دلاتی رہی جو فاتح کے مددگار جنگجو اور متشدد دیوتاؤں نے اس کو دی تھی۔

پرانے نظام کی شکست کی مزید علامت بہت سی سپنیوں کا قتل تھا جن کا ذکر ہم یونانی اساطیر میں پڑھتے ہیں۔ ''زیئس'' نےSyphonنامی سپنی کو قتل کیا، ''اپالو'' نےPhthon کو قتل کیا۔ ''ہرکولیس'' نےLadon کو قتل کیا، یہ سپنی دیوی"Hera" کے مقدس ثمرآور درخت کی محافظ تھی اس کو یہ درخت دیوی"Hera" کے مقدس ثمرآور درخت کی محافظ تھی اس کو یہ درخت دیوی"Gaia" نے اس وقت بطور تحفہ دیا جب اس کی زیئس کے ساتھ شادی ہوئی تھی ۔

اسی طرح ہلال احمر کے ممالک میں ہم ''بعل''(Baal) کی داستان پاتے ہیں (جو آج کل آندھی کا دیوتا بھی مانا جاتا ہے اور دیوی کا عاشق بھائی بھی ہے) اس نےLotanیا Lowtonنامی سپنی کو شکست دی۔ (یہاں ایک قابل ذکر بات یہ تھی کہ کنعان زبان میں Lat کے معنی دیوی ہیں) اور اناطولیہ سے ہمیں یہ کہانی ملتی ہے کہ انڈویورپی دیوتاHittiteنے کس

طرح خزانے یا عورتوں کی عصمت کی محافظ اڑنے والی سپنی Illuyankas کو قتل کیا تھا۔ (۳۴)

عبرانی داستان میں ہم اب بھی ایوب ۴۱:۱ اور زبور ۷۴ میں پڑھ سکتے ہیں کہ یہوواہ نے Leviathan سپنی کو قتل کیا۔ اب اس کی علامت ایک سمندری اژدھا ہے جس کے کئی سر ہیں۔ لیکن ہاتھ ہی ہم ڈارٹ ماؤتھ بائبل میں پڑھتے ہیں کہ عبرانی مذہب کی مقدس ترین علامت "آرک: الواحِ موسیٰ یا ضوابط ومیثاقِ بنی اسرائیل مخزن" میں احکامِ عشرہ Jen) (Commandments دراصل موجود نہیں تھے۔ اس آرک میں جو کہ آج بھی یہودی رسوم میں مرکزی مقام رکھتی ہے اس میں کانسی کی بنی ہوئی ایک سپنی تھی (۳۵) یہ پیتل کی سپنی تھی جس کا ذکر عہد نامہ عتیق کے "۲۔سلاطین ۱۸" میں آتا ہے۔ جیسا کہ جوزف کیمپبل اس کے بارے میں لکھتا ہے" اس اژدھا کی پرستش یروشلم کے ہرگرجا میں اس کی زوجہ عشیرہ کی شبیہہ سمیت کی جاتی تھی، وہ ایک عظیم دیوی تھی" (۳۶) جیسا کہ ہم بائبل میں پڑھتے ہیں ۷۰۰ قبل مسیح تک ایسا نہیں ہوا تھا، جب بادشاہ حزقیہ کے دوراقتدار میں عظیم مذہبی اذیت رسانیوں کے دوران کی بات ہے یہ پیتل کا اژدھا، جس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ اسے خود موسیٰ نے صحرا میں اس لئے بنایا تھا کہ اس سے یہویہہ کی طاقت کا اظہار ہو، اسے معبد میں سے باہر نکال کر چکنا چور کر دیا۔ (۳۷)

لیکن سپنی کی عرصۂ دراز تک برقرار رہنے والی طاقت کی نہایت حیران کن شہادت ہم تک بہشت سے آدم وحوّا کے اخراج کی کہانی سے پہنچتی ہے۔ (۳۸) کیونکہ یہ سپنی ہی تھی جس نے عورت کو مشورہ دیا کہ وہ یہوواہ کی نافرمانی کرے اور شجرِ علم سے خود پھل کھائے۔ یہ مشورہ آج دن تک انسانیت کو ایک دائمی سزا سے دوچار کئے ہوئے ہے۔ وَ

ماہرین علم ادیان نے بہشت سے اخراج کی کہانی کی ایسی تعبیر کرنے کی بہت کوششیں کی ہیں جس سے اس ظلم وبربریت اور بے حسی کی "وضاحت" نہ ہو سکے جو "اصل گنہا" کا ناگزیر نتیجہ تھا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ تمام مذہبی داستانوں میں سے اس مشہور ترین داستان کی نئی اور زیادہ انسانیت نواز علامتیت کی روشنی میں، تعبیرِ نو کی جائے کیونکہ یہ اس نظریاتی تقلیب کا جزوِ تکمیلی سے جو تسلّط پر مبنی نظام سے شراکت پر مبنی نظام میں تبدیلی کے ساتھ سماجی اقتصادی اور فنیاتی طور پر لازم آتے ہیں لیکن یہ بھی ضروری ہے کہ ہم اس اہم کہانی کے سماجی اور نظریاتی مفہوم کو واضح طور پر اس کے تاریخی سیاق وسباق میں سمجھیں۔

یہ درحقیقت تاریخی تناظر ہی ہے جس سے حوّا کی کہانی میں سانپ سے مشورہ لینے والی بات میں معقولیت دکھائی دیتی ہے۔ یہ بات کہ سپنی جو دیوی کی ایک قدیم الہامی علامت ہے وہ دنیا کی اولین عورت کو مرد دیوتا کے احکامات سے روگردانی کا مشورہ دیتی ہے یقیناً محض ایک اتفاقی یا حادثاتی امر نہیں ہے۔ نہ ہی کوئی اتفاقی امر ہے کہ حوا نے سپنی کے مشورے پر عمل کر دیا، یعنی یہوواہ کے حکم کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مقدس شجر علم کا پھل کھالیا۔ شجر علم بھی شجر زندگی کی طرح ایک داستانِ ماضی کی رُو سے ایک علامت ہے جو دیوی کے ساتھ وابستہ ہے۔ علاوہ ازیں ایک قدیم اساطیری اور سماجی حقیقت کے تحت عورت بطور پادری، الوہی دانش اور وحی کا ایک ذریعہ تھی (جیسا کہ اب تک یونان کی جادوگرنی اور بعدازاں روم کی کاہنہ کو مانا جارہا ہے) الہامی دانش کی قدیم علامت کو شیطانی شر کی علامت میں تبدیلی کر دینا اور عورت کو انسانیت کی تمام بدقسمتیوں ومصائب کی ذمہ دار قرار دنیا سیاسی مصلحتیں تھیں۔ یہ اس حقیقت کو دانستہ مسترد دینے کے مترادف تھا جس کا عہد ماضی میں شعور حاصل کیا گیا تھا۔

بائیبل کے ابتدائی مخاطبین کو متوجہ کرتے ہوئے انہیں حوّا کے یہوواہ کے احکامات کی خلاف ورزی کے سنگین نتائج سے ڈرانا محض ڈرامہ نہیں تھا بلکہ انسانیت کی ''گنہگاری'' کے انجام سے باخبر کرنا تھا، یہ دراصل ایک واضح انتباہ تھا کہ جو لوگ ابھی تک دیوی کی پرستش کئے جارہے ہیں انہیں اس سے فوراً باز آجانا چاہیے۔ (کنعان کے لوگوں کو وہ خوفناک سزائیں اب تک یاد تھیں جو ان کے آباؤاجداد کو جنگ اور بادلوں کی گھن گرج کے خداؤں کے ماننے والوں کے ہاتھوں ملی تھیں)

حوّا نے جب یہوواہ کے حکم کی خلاف ورزی کی تھی اور منبعِ علم تک خود جاپہنچنے کی جو جرأت کی تھی، یہ ''گناہ'' دراصل اس عبادت کو ترک کرنے سے انکار تھا۔ اور چونکہ وہ (اولین اور علامتی عورت کے طور پر) قدیم مذہب سے آدمؑ کی بہ نسبت زیادہ مضبوطی سے چمٹی رہی۔ وہ صرف اس کی پیروی کررہے تھے اس لئے حوا کو ملنے والی سزا زیادہ خوفناک ہونے والی تھی۔ اس کے بعد سے اس ہر چیز قبول ہی کرنی پڑتی تھی۔ اسے نہ صرف اپنے غم واندوہ بلکہ حمل (جنم دیئے جانے والے بچوں کی تعداد) بھی کئی بار ہونا تھا۔ [۳۹] اور اب سے تاقیامت منتقم خدا اور اس کے دنیاوی نمائندے، مرد کی حکمرانی کے سامنے سرتسلیم خم کئے

MashalBooks.org

رکھنا تھا۔

بعدازاں سپنی کی تذلیل وتحقیر اور عورت کو شر کی متماثل قرار دینا دراصل دیوی کو رسوا اور بدنام کرنے کا ایک ذریعہ تھا اور بائیبل نے مرد کا تسلّط، نظامِ مراتب اور حالتِ جنگ پیدا کرنے کے لئے جو کچھ کیا وہ ایسا نہیں کہ وہ سپنی کے خلاف کوئی فاش کاروائی ہے، اس سے کہیں زیادہ فاش (جیسا کہ اگلے باب میں بتایا جائے گا) وہ سلوک ہے جو بائیبل تحریر کرنے والے مردوں نے خود دیوی کے ساتھ روا رکھا ہے۔ [۴۰]

MashalBooks.org

باب 7

تکذیبِ حقیقت: حصہ دوم

شروع شروع میں حملہ آور محض لٹیروں کے گروہ ہوا کرتے تھے جو لوٹ مار اور قتل وغارت کر کے واپس چلے جاتے تھے۔ قدیم یورپ میں مستحکم ثقافتوں کا یکایک خاتمہ اور ''کرگن'' (Kurgan) سرداروں کے مقبروں کا اوّلین ظہور بیک وقت دیکھنے میں آیا۔ [۱] اور بائیبل میں ہم پڑھتے ہیں کہ فن کاری کے قیمتی نمونے کس طرح پگھلا کر سونے میں تبدیل کردیئے جاتے تھے تا کہ اسے بہ آسانی اٹھایا جاسکے، ان میں انتہائی قیمتی شبیہیں اور جاہل واجڈ (بقول بائیبلی سکالرز کے) لوگوں کے بنائے ہوئے بُت شامل تھے۔ [۲]

لیکن کچھ عرصے کے بعد نئے حکمراؤن ازخود تبدیل ہونا شروع ہوگئے۔ انہوں اور ان کی آل اولاد نے طویل سلسلۂ فتوحات کے بعد اپنی تابع فرمان آبادیوں کی بہ نسبت زیادہ ترقی یافتہ ٹیکنالوجیز، اقدار اور طریق ہائے زندگی اختیار کرلئے۔ انہوں نے مستقل بستیاں بھی تعمیر کیں اور وہ اکثر مقامی عورتوں کو اپنی بیویاں بنالیتے۔ کریٹ کے مائسینین حکمرانوں اور کنعان میں سلیمان بادشاہ کی طرح ان کی دلچسپی زندگی کی ''لطافتوں'' میں بڑھ گئی جس کی وجہ سے انہوں نے اپنے لئے شاندار محلات تعمیر کئے اور فنونِ لطیفہ کو فروغ دینا شروع کردیا۔ اور رفتہ رفتہ یکے بعد دیگرے ہونے والے ہر نئے حملے کے بعد نئی ٹیکنالوجیز خوش اطوار ریوں اور ذوق کی لطافتوں کے بڑھتے ہوئے رجحانات مزید آگے کی طرف زور دینے لگتے۔

ہر دفعہ ثقافتی تنزل کے کچھ عرصے کے بعد تہذیب کا ٹوٹا ہوا راستہ پھر بحال ہوجاتا رہا۔ لیکن اب تہذیب نے ایک بہت ہی مختلف راستہ اختیار کرلیا کیونکہ اگر بلند مرتبوں پر فائز لوگوں نے اپنے مرتبے برقرار رکھنے تھے تو قدیم ثقافت کا ایک پہلو جذب نہیں کیا جاسکتا تھا۔ یہ پہلو یا اس سے زیادہ موزوں الفاظ میں یہ پہلوؤں کا مجموعہ تھا، یہ سابق شراکتی ماڈل کی جنسی وشہوانی اور سماجی مساوات تھی جسے یہ لوگ ہضم نہ کرسکے تھے۔

تہذیب کا نیا رُخ

دونظاموں کے تسلسل میں ایک عظیم خطرہ دکھائی دے رہا تھا، سابق شراکتی، نظام کے اوپر جبر کا نظام مسلط کرتے ہوئے بہت سی دشواریاں سر اٹھارہی تھیں۔ خدشہ تھا کہ لوگوں کے اندر امن کی بھوک اور جبر سے چھٹکارے کی خواہش پھر طاقت پکڑ سکتی ہے۔ پرانا سماجی واقتصادی نظام جس کے تحت شجرۂ مادری پر مبنی قبائل زمینوں پر عوام کے متولی (ٹرسٹی) طور پر قابض تھے وہ مسلسل خطرے میں تھا۔

نئی حکمران اشرافیہ کے اقتدار کے استحکام کے لئے ان عورتوں کو فیصلے صادر کرنے کے اختیارات سے محروم کرنا ضروری تھا۔ ساتھ ساتھ خاتون پادریوں کی روحانی اتھارٹی بھی ختم کرنا تھی۔ مفتوحہ عوام میں بھی پدرسری(patriliny) کو مادرسری(matriliny) کی جگہ لینی تھی جیسا کہ قدیم یورپ، اناطولیہ، میسوپوٹیمیا اور کنعان میں عملاً ہوچکا تھا۔ جہاں عورتوں کو مرد کے زیرکنٹرول ذریعۂ پیدائشِ نسل کے طور پر دیکھا جارہا تھا نہ کہ خود مختار، معاشرے کی قائدارکان کی حیثیت سے۔

لیکن عورتوں کو نہ صرف ان کے ذمہ داری اور اقتدار کے حامل سابق مناصب سے الگ کردیا گیا، انہیں تنقیدی نظر سے بھی دیکھا جانے لگا، جوں جوں فنیاتی پیش قدمی ہورہی تھی، ان دونوں کو بھی مراتب پر مبنی سماجی واقتصادی نظام کو مستحکم کرنے اور برقرار رکھنے کے ذرائع کے طور پر استعمال کیا گیا۔

جیسا کہ تسلط پر مبنی معاشروں کی خصوصیت ہے، تباہی پھیلانے والی ٹیکنالوجیز کو اب اعلیٰ ترین اہمیت دی جانے لگی اور انتہائی وحشی خصلت کے مردوں کو نہ صرف سب سے زیادہ عزت اور وقار کے مراتب دیئے گئے ان کی لوٹ مار اور قتل وغارت گری کی صلاحیت میں

اضافے کے لئے زیادہ مہلک ہتھیاروں سے بھی مسلح کر دیا گیا۔ ان کی تلواروں اور ڈھالوں کے دستوں میں قیمتی پتھر، موتی، ہیرے اور لعل جڑ دیئے گئے اور اگرچہ ان کی وہ زنجیریں جن سے فاتح اپنے قیدیوں کو باندھ کر اپنے پیچھے کھینچتے ہوئے لاتے تھے اب بھی گھٹیا دھات کی بنی ہوئی تھیں لیکن ان جنگجو سرداروں، حکمرانوں اور شہنشاہوں کے رتھوں پر سونا اور چاندی جڑی ہوئی ہوتی تھی۔

حملوں کے زمانے میں رونما ہونے والے تعطل کا سلسلہ تھمنے کے بعد فنیاتی ارتقا نے نئے سرے ؤسے رفتار پکڑ لی۔ اشیاء کی مقدار بڑھی اور مادی ذخائر میں اضافہ ہو گیا مگر ان کی تقسیم تبدیل ہو گئی۔ کریٹ نے مفاد عامہ کے کاموں پر زیادہ زور دیا تھا اور سب کا معیارِ زندگی بڑھایا تھا اب بہتر ٹیکنالوجیز نے مادی ساز و سامان کی پیداوار تو بڑھا دی مگر نئی دولت کا کثیر حصہ اوپر کے لوگوں نے سمیٹ لیا اور ان سے جو کچھ بچ گیا تھا وہ رعایا کی طرف دھکیل دیا۔

سماجی ارتقا نے بھی اوپر کی طرف دھکا دینے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ سیاسی اقتصادی اور مذہبی ادارے مزید پیچیدہ ہوتے چلے گئے۔ مگر چونکہ نئی ٹیکنالوجیز کو نئی تخصیصی مہارتوں (specializations) اور انتظامی قابلیتوں کے ساتھ چلانا تھا، طاقتور فاتحین اور ان کی آل اولاد نے ان پر بھی قبضہ جما لیا۔

قبضہ جمانے کا ایک خاص انداز تھا جسے وہ ہر جگہ بروئے کار لاتے رہے۔ انہوں نے نئی دولت تخلیق کرنے کی بجائے مفتوحہ علاقے کی دولت کا بڑا حصہ تو غصب کر لیا، اور جس پر قبضہ ہونا ممکن نہیں تھا اسے تباہ کر دیا۔ پھر پہلا کام یہ کیا کہ غلبے کے عہدوں پر قبضہ کر لیا۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جوں جوں بڑی ٹیکنالوجیز وضع ہوتی رہیں، بڑھتی ہوئی سماجی پیچیدگیوں اور انتظامی ضرورتوں نے نئے کردار (roles) پیدا کئے تو انہوں نے ان پر بھی قبضہ کر لیا۔ سب سے زیادہ ثمر آور کردار صاحبانِ اقتدار نے خود سنبھال لئے اور باقی ماندہ رعایا میں سے ان افراد میں تقسیم کر دیئے جو ان کے مفاد کی زیادہ خدمت کر سکتے تھے اور ان کے زیادہ وفادار اور اطاعت گزار تھے۔ ان میں ٹیکس کلکٹر اور بیوروکریٹک عہدے شامل تھے۔ (۳)

یہ نئے باوقار اور منفعت بخش کردار یقیناً شجرہ مادری والے قبائل کے سرداروں یا خاتون

پادریوں کو، جواب تک پرانے طور طریقوں سے چمٹے ہوئے تھے، نہیں دیئے جاتے تھے۔ اس کی بجائے جیسا کہ سمیریا کے شہروں ایلام وغیرہ کے ریکارڈز سے پتہ چلتا ہے تمام نئے سماجی کردار اور مناصب اختیار ایک سسٹم کے تحت عورتوں سے مرد کو منتقل کر دیئے گئے۔ (۴)

کیونکہ اب طاقت اور طاقت کے استعمال کی دھمکی اس امر کا تعین کر رہی تھیں کہ اقتصادی تقسیم کے راستوں کو کون کنٹرول کر رہا ہے۔ سماجی نظم کے لئے عہدہ ہونا ایک مسلمہ اصول بن چکا تھا۔ اس عہدے کی شروعات جسمانی طور پر مضبوط نصف آبادی یعنی مرد سے ہوتی تھی جو باقی نصف حصے پر مشتمل عورتوں پر فائق سمجھی جاتی تھی اور تمام انسانی تعلقات اسی سانچے میں ڈھل چکے تھے۔

بہ ایں ہمہ اطاعت گزار بنانے کے لئے طاقت مستقلاً استعمال نہیں کی جاسکتی تھی یہ ثابت کرنا ضروری تھا کہ قدیم قوتیں جو کائنات پر حکمرانی کر رہی تھیں (جن کی علامت حیات آفریں جام،Chalice تھا) ان کی جگہ نئے طاقتور دیوتاؤں نے لے لی ہے جن کے ہاتھ میں خنجر(Blade) تھا اب وہی اصل حکمران تھے اور اس مقصد کے لئے ایک بات تسلیم کروانا ضروری ہوگئی وہ یہ تھی کہ نہ صرف دیوی کی ارضی نمائندہ عورت، بلکہ دیوی خود بھی اپنے بلند مقام سے اتر کر نیچے آچکی ہے۔

مشرق وسطیٰ کی چند داستانوں کے ذریعے یہ بات ''ثابت'' کردی گئی کہ دیوی قتل ہوچکی ہے، دیگر داستانوں میں کہا گیا کہ اس کی عصمت دری کر کے اسے ذلیل ورسوا کر دیا گیا ہے۔ مثال کے طور پر مشرق وسطیٰ کی مشہور داستان میں طاقتور سمیرین دیوتا ''اینلل''(Enlil) کو دیوی ''ننلل''(Ninlil) کی آبروریزی کے واقعہ کے ساتھ جوڑ دیا گیا تھا۔ ایسی داستانوں سے بہت اہم سماجی مقاصد حاصل کئے گئے تھے، یہ مردوں کی بالادستی مسلط کرنے کی علامت بھی تھیں اور جواز بھی فراہم کرتی تھیں۔

ایک اور عام حربہ، دیوی کا مرتبہ کم کر کے اسے ایک زیادہ طاقتور مرد دیوتا کی محبوبہ (بیوی) کے مقام پر لانا تھا۔ پھر ایک اور طریقہ اسے لڑاکی دیوی ظاہر کرنے کا تھا۔ مثال کے طور پر کنعان میں ہم خون کی پیاسی ''اشتر''(Ishtar) کو پاتے ہیں، اس کا جنگ کی دیوی کے طور پر احترام بھی کیا جاتا اور اس سے خوف بھی محسوس کیا جاتا تھا۔ اسی طرح اناطولیہ میں بھی دیوی کو جنگ سے جوڑ دیا گیا، اس سے یہ ایک ایسی خصوصیت منسوب کردی گئی جو

''ای او جیمز'' (E.O.James) کی تحقیق کے مطابق سابق متون میں بالکل نہیں ملتی تھی۔ (۵)

ساتھ ساتھ دیویوں سے جتنے فرائض پہلے منسوب چلے آرہے تھے وہ مرد دیوتاؤں کو سونپ دیئے گئے۔ جیسے ماہر ثقافتی بشریات ''روبی روہرلچ لیویٹ'' (Ruby Rohrlich-Levitt) کہتی ہے ''جب کاتبوں کی سربراہ دیوی کو تبدیل کرکے یہ منصب ایک دیوتا کو دے دیا گیا تو معبدوں اور محلّات کے لئے صرف مرد کاتب بھرتی کئے جانے لگے اور تاریخ مردانہ نقطۂ نظر سے لکھی جانے لگی۔ (۶)

لیکن کنعان میں میسوپوٹیمیا کی طرح معاملات پہلے ہی تسلط پر مبنی معاشرے کی طرف گامزن ہوچکے تھے۔ تیرہ عبرانی قبیلوں کے حملے نہ صرف تیزتر ہوگئے تھے، بلکہ ان میں انقلابی عنصر بھی داخل ہوگیا تھا، جو کہ ایک سماجی اور نظریاتی تقلیب تھی۔ کیونکہ یہ صرف بائیبل ہی ہے جس میں دیوی بطور ایک الوہی قوت مکمل طور پر مفقود ہے۔

دیوی کی عدم موجودگی

اس امر کا قطعی انکار کہ صنف نازک (بمراد عورت) کا الوہیت میں کچھ حصہ ہوسکتا ہے، اس حقیقت کی روشنی میں ایک حیرت انگیز بات یہ ہے کہ عبرانی اساطیر بات (Mythology) کا بہت بڑا حصہ قدیم میسوپوٹیمیائی اور کنعانی اساطیر سے ماخوذ تھا اور یہ ان آثاریاتی شواہد کی روشنی میں اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات ہے جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبرانی حملوں کے بہت بعد کے عرصہ تک کنعان کے لوگوں نے بشمول خود عبرانیوں کے، دیوی کی پرستش جاری رکھی تھی۔

جیسا کہ بائیبلی سکالر رافیل پیٹائی اپنی کتاب The Hebrew Goddess میں لکھتا ہے ''آثاریاتی دریافتیں کوئی شک وشبہ نہیں رہنے دیتیں کہ عبرانی بادشاہت کے بالکل خاتمے تک قدیم کنعانی دیوتاؤں کی پرستش عبرانیوں کے مذہب کا جزولازم ہوتی تھی''۔ مزید برآں ''دیوی کی پرستش نے اس عوامی مذہب میں دیوتاؤں کی پرستش سے زیادہ اہم کردار ادا کیا تھا'' (۷) مثال کے طور پر ''ٹیل بیٹ مرسم'' (جدید حبرون کے جنوب مغرب میں ایک بائیبلی قصبہ ڈیور) کے ڈھیر میں سے کانسی کے دور کے آخری حصے (۲۱ ویں تا ۱۳ ویں صدی قبل از مسیح) سے متعلق جو مذہبی استعمال والی اشیا برآمد ہوئیں وہ شہوانی محبت اور زرخیزی کی

MashalBooks.org

دیوی ''اسٹارٹی'' کی مورتیاں یا لوحیں تھیں مگر اندازاً ۱۳۰۰-۱۲۰۰ قبل مسیح کے دوران میں عبرانیوں کے حملوں کے دوران اس کی تباہی کے بعد ہونے والی اس کی تعمیر نو کے بعد بھی بقول Patai کے ''آثار یاتی شہادت کی بنا پر اس بات میں کوئی شبہ نہیں رہ جاتا کہ یہ مورتیاں عبرانیوں میں بے حد مقبول تھیں'' (۸)

اس کے بارے میں بلاشبہ خود بائیبل میں کچھ بلاواسطہ اشارے موجود ہیں کہ پانچ رسولوں عزرا، ہوسیع، نحمیاہ اور یرمیاہ نے دیگر معبودوں کی پرستش پر ''ناپسندیدگی'' کا اظہار کیا تھا۔ انہوں نے ایسے لوگوں کی خاص طور پر مذمت کی تھی جو ابھی تک ''آسمان کی ملکہ'' کی پوجا کرتے چلے آرہے تھے۔ (۹) اور ان کا سب سے زیادہ غصہ ''یروشلم کی بیٹیوں'' کی بے وفائیوں کے خلاف تھا جو قابلِ فہم انداز میں ان عقائد سے انحراف کر رہی تھیں جن میں تمام دنیاوی اور روحانی اقتدار پر مردوں کی اجارہ داری نہیں تھی۔ مگر ایسی گاہے بگاہے اور ہمیشہ استخفافی عبارتوں کے سوا ایسا کوئی اشارہ نہیں ملتا کوئی ایسا معبود رہا ہے جو جنسِ ذکور نہیں ہے۔

خواہ یہ گرج چمک کا دیوتا ہو، پہاڑوں یا جنگوں کا ہو یا بعدازاں پیغمبروں اور رسولوں کا زیادہ مہذب خدا ہو وہ خدائے واحد ہے: ''حساس'' اور پُراسرار یہوواہ ہے جس نے بعد میں مسیحی عقائد کے مطابق اپنے اکلوتے بیٹے یسوع مسیح کو مرنے اور اس کے انسانی بچوں کے ''گناہوں'' کا کفارہ بننے کے لئے بھیجا تھا اور اگرچہ عبرانی لفظ ''ایلوہم'' مؤنث اور مذکر دونوں جڑیں رکھتا ہے (اس کی کتاب پیدائش میں ضمناً وضاحت کی گئی ہے کہ عورت اور مرد دونوں کو ایلوہم کی شبیہہ کے مطابق تخلیق کیا جاسکتا ہے) الوہیت کے تمام دیگر القاب مثلاً حاکم، خداوند، باپ اور گڈریا، خصوصاً مذکر صیغے ہیں۔ (۱۰)

اگر ہم بائیبل کو بطور ایک معیاری سماجی ادب کے پڑھیں، تو اس میں دیوی کی عدم موجودگی واحد اہم ترین بیان ہے جو مرد حضرات صدیوں لکھتے مٹاتے اور پھر لکھتے رہے ہیں، یہ اس قسم کے سماجی نظام کے بارے میں ہے جسے یہ مذہبی دستاویز قائم کرکے برقرار رکھنا چاہتی ہے۔ کیونکہ سرکاری طور پر منظور شدہ مقدس اناجیل میں سے دیوی کی علامتی طور پر غیر موجودگی اس کے خدائی اختیار اور طاقت کی غیر موجودگی ہے جو عورتوں کو تحفظ دینا اور ان

پر مردوں کی طرف سے کیے گئے مظالم کی تلافی کرنا چاہتی تھی۔

اس کا یہ مطلب نہیں کہ بائیبل میں اہم اخلاقی پند ونصائح اور عارفانہ صداقتیں نہیں یا یہ کہ یہودیت نے بعد میں جیسا فروغ پایا اس نے بھی مغربی تاریخ میں مثبت کردار ادا نہیں کیا۔ بلاشبہ ان کا کردار ایک حقیقت ہے اگرچہ صاف ظاہر ہورہا ہے کہ یہ قدیم حکمتوں اور دانائیوں کے اندر پیوست ہے۔ مغربی تہذیب میں جتنی ہمدردی اور انصاف پروری پائی جاتی ہے وہ عبرانی انبیاء اور رسولوں کی تعلیمات سے ماخوذ ہے۔ مثال کے طور پر یسعیاہ کی بہت سی تعلیمات، جن میں سے یسوع کی بعد کی تعلیمات اخذ کی گئیں وہ شراکت پر مبنی معاشرت کا مزاج رکھتی ہیں، نہ کہ جابرانہ معاشرت کا۔ اس کے باوجود اس میں جو کچھ انسانیت نوازی اور بلندیٔ اخلاق ہے اس میں ہم یہودیوں اور مسیحیوں کے بائیبل کی داستانوں اور قوانین کا جال بُنا ہوا پاتے ہیں جن کا اصل مقصد تسلّط پر مبنی نظامِ معاشرت اور اقتصادی نظم مسلّط کرنا اور برقرار رکھنا تھا۔ (۱۱)

کرگن(Kurgans) حملہ آوروں کی طرح، جنہوں نے کئی ہزار برس پہلے قدیم یورپ کو پاؤں تلے روند دیا تھا، عبرانی قبیلے جنوبی صحراؤں سے کنعان پر حملہ آور ہوگئے۔ یہ اپنے ہمراہ جنگ کا غضبناک خدا یہوواہ لائے تھے جو اپنے حقوق کے بارے میں بے حد حسّاس تھا۔ یہ کرگنوں سے ٹیکنالوجی اور تہذیب وثقافت کے لحاظ سے زیادہ ترقی یافتہ تھے لیکن انڈو یورپیوں کی طرح ان میں بھی انتہائی وحشی اور جنگجو مردوں کی اکثریت تھی۔ عہد نامہ عتیق میں متعدد مقامات پر ہم پڑھتے ہیں کہ یہوواہ انہیں دھڑا دھڑ تباہی مچانے، لوٹ مار اور قتل وغارت کرنے کے احکامات دیئے جارہا تھا۔ اور ...... درحقیقت ان احکامات پر کس طرح عمل درآمد ہورہا تھا۔ (۱۲)

عبرانی معاشرہ بھی کرگنوں اور دیگر انڈو یورپین معاشروں کی طرح انتہائی طور پر نظامِ مراتب پر مبنی تھا۔ اس میں سب سے اوپر قبیلۂ موسیٰ ''لاوی''(Levites) تھا، اس کے اوپر بھی اس سے مختصر تعداد پر مشتمل اشرافیہ مسلط تھی۔ یہ خاندانِ ''کوناتھ'' یا ''کوہن'' تھا۔ یہ ہارون کی پُشت سے چلے آنے ولے موروثی پادری تھے جو حتمی سند کی حیثیت رکھتے تھے۔ جیسا کہ ہم عہد نامۂ عتیق میں پڑھتے ہیں، اس کنبے کے مردوں کا دعویٰ تھا کہ انہیں اختیار براہ راست یہوواہ سے ملا ہوا ہے۔ اس کے علاوہ جو بائیبلی سکالرز ہمیں بتاتے ہیں وہ یہ ہے کہ

MashalBooks.org

غالباً یہی وہ پروہتانہ اشرافیہ تھی جس نے اساطیر اور تاریخ کا بیشتر حصہ نئے سرے سے لکھا، اس کا مقصد ان کی غالب حیثیت کو مستحکم کرنا تھا۔ (۱۳)

بالآخر جبر پر استوار معاشرہ، جس کی شناخت تشدد، مطلق العنانی اور مرد کی برتری تھی، قائم ہو کر رہا، اس کی تکمیل اور مضبوط پشتہ بندی عہدنامۂ عتیق کے اس واشگاف اعلان سے ہوئی کہ خدا کی منشا ومرضی اسی میں ہے کہ عورت پر مرد کی حکمرانی ہو۔ کرگنوں اور دیگر انڈویورپین حملہ آوروں کی طرح ،جنہوں نے یورپ اور ایشیائے کوچک میں بے پناہ مظالم ڈھائے تھے، عبرانی قبائلی معاشرہ مردانہ تسلّط پر مبنی سخت گیر اور غیر لچکدار معاشرہ تھا۔

ایک پھر یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں لیا جانا چاہیے کہ ہم قدیم یونانیوں کے مذہب کو، چہ جائیکہ یہودیت کو، جابرانہ نظامِ حیات مسلط کرنے کا الزام دے رہے ہیں بلکہ ہم اس کا تصور تک نہیں کرسکتے۔ ''شراکت'' سے ''تسلط'' کی طرف منتقلی کا سفر کنعان پر عبرانی حملوں سے بہت پہلے شروع ہو چکا تھا اور قدیم دنیا کے کئی حصوں میں بیک وقت جاری تھا۔ علاوہ ازیں یہودیت اپنے تصوراتِ الوہیت واخلاقیات کے حوالہ سے عہدنامۂ عتیق سے بہت پیچھے تک چلی جاتی ہے۔ اور اپنی متصوفانہ روایتِ شیخینا(shekhina) کے اندر اس نے دیوی کی قدیم پرستش کے کئی اجزا کو حقیقتاً باقی رکھا ہوا ہے۔ جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں دیوی کی پرستش شہنشاہیت کے ادوار میں عبرانی عوام کے مذہب میں کافی حد تک سرایت کرچکی تھی۔ کبھی کبھار عورتیں بھی بڑے بلند مناصب پر پہنچ جاتی تھیں (جیسے رسول اور جج ''ڈیبورا'' تھی)، کئی قیادت کے عہدے پر فائز ہورہی تھیں۔ لیکن عموماً معاشرے کے اہم فیصلے اور احکامات اوپر سے مردوں پر مشتمل مختصر سی اشرافیہ صادر کرتی تھی۔ سب سے زیادہ خطرے کی بات یہ تھی، جیسا کہ ہم اب بھی عہدنامۂ عتیق میں پڑھ سکتے ہیں کہ ان مرد حکمرانوں کے وضع کردہ قوانین میں عورتوں کی تعریف بطور آزاد وخودمختار انسان کے متعین نہیں کی جاتی تھی، بلکہ مردوں کی نجی ملکیت کے طور پر کی جاتی تھی۔ پہلے انہیں اپنے باپوں سے متعلقہ ہونا پڑتا، بعدازاں شوہروں یا اپنے آقاؤں کی ملکیت ہونا پڑتا تھا پھر ان سے پیدا ہونے والے بچوں کی صورت حال بھی یہی تھی۔

ہمیں بائبل سے پتہ چلتا ہے کہ مفتوحہ شہری ریاستوں کی لڑکیوں اور عورتوں کے بارے میں کنگ جیمز کے بائبل میں لکھا تھا کہ ''جتنی عورتیں مرد کا منہ دیکھ چکی ہیں اُن کو

قتل کرڈالولیکن ان لڑکیوں کو جومرد سے واقف نہیں اور اچھوتی ہیں اپنے لئے زندہ رکھو'۔ یہ لڑکیاں یہوواہ کے حکم کے مطابق باقاعدگی سے لونڈیاں بنالی جاتیں۔ (۱۴) ہم عہد نامۂ عتیق میں غلام مردوں کے بارے میں بھی پڑھتے ہیں جنہیں کنگ جیمز کے بائبل میں مرد ملازم اورعورت ملازم کے طور پرلکھا گیا ہے۔ اور قانون میں کس انداز میں لکھا گیا ہے کہ جب کوئی شخص اپنی بیٹی کو بطور ملازمہ فروخت کرے تو کیا کرے۔ پھر پوری وضاحت کے ساتھ کہا گیا ہے کہ جب ایک مرد ملازم کو آزاد کر دیتا تو بائبلی شریعت کے مطابق اس کی بیوی اور بچے آقا کی جائداد کے طور پر پیچھے چھوڑ دیئے جاتے تھے۔ (۱۵)

لیکن صرف یہی نہیں تھا کہ خادمائیں، داشتائیں اور ان کی اولادیں مرد کی جائداد ہوتی تھیں، ابراہام کا مشہور واقعہ جس میں اس نے اپنے اور سارہ کے بیٹے اسحاق کو یہوواہ کے نام پر قربان کرنے کا فیصلہ کیا تھا، اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ جائز بیوی کے بچے بھی مرد کے قطعی کنٹرول میں ہوتے تھے۔ اور پھر وہ واقعہ بھی مشہور ہے کہ یعقوب نے کس طرح اپنی بیوی ''لیہہ'' (Leah)، اس کے والد کی سات سال تک خدمت کے عوض خریدی تھی، اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ سب عورتوں کی یہی کیفیت ہوتی تھی۔

جنس اور معیشت

عورت کو درجۂ انسانیت سے گرانے کے نظریات جتنی وضاحت سے بائبل کے اجازت ناموں اور ممانعتوں میں سے ملتے ہیں کہیں اور نہیں ملتے اور ان کا مقصد یہ بتایا جاتا ہے کہ یہ عورت کی عصمت کے تحفظ کے لئے ہیں۔ مثال کے طور پر کتابِ استثنٰی (۲۲:۲۸۔۲۹) میں ہم یوں پڑھتے ہیں: ''اگر کسی مرد کو کوئی لڑکی مل جائے جو کنواری ہو اور اس کی نسبت نہ ہوئی ہو، اگر وہ اسے پکڑ کر اس سے صُحبت کرے اور دونوں پکڑے جائیں تو وہ مرد جس نے اس سے صُحبت کی ہولڑکی کے باپ کو چاندی کے پچاس مثقال دے اور وہ لڑکی اس کی بیوی قرار پائے گی'' اس سے ہمیں جو تاثر دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اس قسم کا قانون بہت بڑی ترقی ہے اور غیر اخلاقی اور گناہ کی زندگی بسر کرنے والوں کی تہذیب سے آگے کی طرف کا ایک انسانی قدم ہے۔ لیکن اگر ہم اس قانون کو حقیقی رنگ میں اس سماجی اور اقتصادی سیاق وسباق میں دیکھیں جس میں یہ قانون بنایا گیا تھا، اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ کسی اخلاقی یا انسانی سوچ میں

MashalBooks.org

سے برآمد نہیں ہوا۔ بلکہ اس کا مقصد مردوں کے ان حقوقِ ملکیت کو تحفظ دینا ہے جو ''ان'' کی بیویوں اور بیٹیوں کی ذات میں پائے جاتے ہیں۔

یہ قانون یہ کہتا ہے کہ چونکہ ایک غیر شادی شدہ لڑکی جو کنواری نہیں ہے وہ اقتصادی لحاظ سے قیمتی اثاثہ نہیں، اس کے والد کو مالی معاوضہ ملنا چاہیے۔ اور جس آدمی نے یہ اقتصادی مسئلہ کھڑا کیا ہو وہی اس لڑکی سے شادی کر لے۔ جس معاشرے میں شوہروں کو اپنی بیویوں پر لامحدود اختیار حاصل ہو، ایسی جبری شادی میں اس لڑکی کی بہبود مضمر نہیں ہوتی۔ یہ سزا بھی مرد کی معیشت سے تعلق رکھتی ہے۔ چونکہ لڑکی اب ایک بیکار چیز ہے جس کی مزید مارکیٹ ویلیو نہیں ہے، اس کا بوجھ مسلسل والد کے سر ڈالے رکھا رہنا کسی طرح ''مناسب'' نہیں۔ یہ اب لازماً اسی کے پاس جانی چاہیے جو اس کی قیمت زائل ہوجانے کا سبب بنا تھا۔

اس سارے نظام ''اخلاق'' جنسی رسوم اور قوانین کا کتاب استثنیٰ کی آیات ۲۲: ۱۳۔۲۱ میں اس سے بھی زیادہ وحشیانہ طور پر اظہار کیا گیا ہے۔

ان آیات کا تعلق اس آدمی سے ہے جس نے کہا ہو کہ جب میں نے اپنی دلہن سے مجامعت کی تو مجھے محسوس ہوا کہ وہ ایک کنواری لڑکی نہیں ہے، اس بنا پر اس سے نجات پانا چاہتا ہوں۔ بائبل میں اس کے لئے فراہم کردہ قانونی طریق کار یہ ہے: ''اگر بیوی کے والدین اپنی لڑکی کے کنوارپن کی نشانیاں پیدا کر سکتے ہوں'' اور ''شہر کے زعما کے سامنے کپڑا پھیلا کر یہ ثبوت پیش کردیں''۔ تو شوہر کو دلہن کے والدین کو چاندی کی ایک سو مثقال بطور جرمانہ ادا کرنے ہوں گے۔ اور وہ اپنی بیوی کو والدین کے پاس جب تک وہ زندہ رہے، کبھی واپس نہ بھیجے۔ لیکن اگر بیوی کے کنوارپن کا تسلی بخش ثبوت فراہم نہ کیا جاسکے تو شوہر اس سے نجات پاسکتا ہے۔ اس کے لئے قانون یہ تقاضا کرتا ہے کہ ''وہ دوشیزہ کو اس کے والدین کے گھر کے دروازے پر لائے اور اس شہر کے مرد اسے پتھر مار مار کر ہلاک کردیں''

بائبل ہمیں مطلع کرتی ہے کہ شادی ہونے کے وقت کسی عورت کا کنواری نہ پایا جانا اسے قتل کردینے کا معقول جواز بنتا ہے۔ ''اس سے یہ حماقت سرزد ہوئی ہے کہ اس نے اسرائیلی ہوتے ہوئے اپنے باپ کے گھر میں طوائف کا کردار ادا کیا ہے''۔ عہد حاضر کی زبان میں اس کا ترجمہ یہ ہوا کہ اسے اس بات کی سزا ملنی چاہئے کہ اس نے نہ صرف اپنے والد کے لئے بدنامی کا سامان پیدا کیا ہے بلکہ اپنے وسیع تر خاندان، اسرائیل کے بارہ قبیلوں

کے نام کو بھی بٹہ لگایا ہے۔ یہاں دو باتیں قابل غور ہیں ایک یہ کہ یہ بدنامی کن کن چیزوں پر مشتمل ہے؟ اور دوسری یہ کہ اس لڑکی کے کنوارپن کے ضیاع نے اپنی قوم اور اپنے والد کو کیا نقصان یا زخم پہنچایا ہے؟

ان کا جواب یہ ہے کہ یہ جو عورت جنسی طور پر اور اقتصادی طور پر ایک آزاد فرد کی حیثیت سے رویہ اختیار کرے وہ مرد کے زیر تسلط قائم سخت گیر معاشرے کے اقتصادی اور سماجی ڈھانچے کی پوری عمارت کے لئے ایک خطرہ ہوتی ہے۔ لہٰذا اسے شدید سماجی اور اقتصادی مذمت اور سخت ترین سزا کی مستحق سمجھنا ایک ''ضرورت'' بن جاتا ہے۔

عملی سطح پر جو قوانین عورت کے کنوارپن کی حفاظت کے لئے بنائے گئے تھے اصل میں ان کا مقصد مردوں کے درمیان اقتصادی لین دین کو تحفظ دینا تھا۔ عورت کے خلاف بہتان جھوٹا ثابت ہونے پر اس کے والد کو معاوضہ دلانے کے لئے قانون نے ایک دیانتدار تاجر کے طور پر اس کی شہرت کو نقصان پہنچانے کے لئے سزا مقرر کردی تھی۔ اس نے والد کو ایک مزید تحفظ بھی دیا تھا۔ اگر الزام جھوٹا ہوتا تو سامانِ تجارت (اس کی بیٹی) اب کبھی واپس نہیں کیا جاسکتا تھا۔ دوسری طرف الزام درست نکلنے پر شہر کے لوگوں کے ہاتھوں اس کی بیٹی کو پتھر مار کر ہلاک کردینے کا قانون باپ کو بھی تحفظ دیتا۔ چونکہ رسوا شدہ دلہن دوبارہ فروخت نہیں ہوسکتی تھی، اس لئے قانون نے اب اقتصادی لحاظ سے ناکارہ اثاثے کو تباہ کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ اسی طرح بائیبل میں درج قوانینِ بدکاری، جوزانی مرد وعورت کو قتل کرنے کا حکم دیتے تھے چور (مرد جس نے کسی دوسرے کی جائداد ''چوری'' کی ہو) کو سزا دینے اور ایک نقصان رسیدہ اثاثے (بیوی جو اپنے شوہر کے لئے باعثِ رسوائی بنی ہو) کو تباہ کرنے کا حکم دیتے تھے۔

لیکن جن مردوں نے یہ سماجی واقتصادی نظام قائم کرنے کے قواعد وضوابط بنائے ایسی نامعقول اقتصادی اصطلاحات استعمال نہیں کرتے تھے بلکہ یہ کہتے تھے کہ ان کے حکمنامے نہ صرف اخلاقی، حق پرستانہ اور آبرومندانہ ہیں بلکہ فرموداتِ خدا ہیں۔ اور آج دن تک ہماری پرورش اس انداز میں ہوئی اور ہورہی ہے کہ ہم مقدس صحیفوں کو فرموداتِ خداوند تعالیٰ یا کم ازکم مبنی براخلاق ودانش سمجھتے ہیں۔ ہمارے لئے بائیبل پر معروضی نظر ڈالنا مشکل ہوگیا ہے اور ایسے مذہب کی بھرپور اہمیت پر غوروفکر دشوار ہوچکا ہے جس میں اعلیٰ وبرتر اور واحد

الوہیت مذکر ہے۔

ہمیں درس دیا گیا ہے کہ یہودومسیحی روایت ہماری انواع کی عظیم ترین اخلاقی پیش قدمی ہے۔ بائیبل واقعتاً بنیادی طور پر اسی بات سے سروکار رکھتی ہے کہ درست کیا ہے اور غلط کیا ہے۔لیکن جو کچھ ایک تسلط پر مبنی معاشرے میں درست اور غلط ہے وہی نہیں ہے جو شراکت پر مبنی معاشرے میں درست اور غلط ہے۔ بلاشبہ بات یہی ہے جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہودیت اور عیسائیت، دونوں کی بہت سی تعلیمات انسانی تعلقات کے شراکتی نظام کے لئے بے حد موزوں ہیں لیکن اس حد تک جہاں یہ ایک جبر پر مبنی معاشرے کی عکاسی کرتی ہیں۔ بائیبلی اخلاقیات کے لئے نرم سے نرم جو الفاظ کہے جاسکتے ہیں وہ یہ ہیں کہ یہ طبعی بالیدگی سے محروم ہیں اور سخت الفاظ یہ ہیں کہ یہ ایک مصنوعی اخلاقیات ہے جس کے تحت منشائے خداوندی ظلم اور بربریت پر پردہ ڈالنے کا ہتھیار ہے۔

مثال کے طور پر ہم کتاب ''گنتی'' ۳۱ میں پڑھتے ہیں کہ ''مدیان'' کے سقوط کے بعد کیا ہوا تھا۔ قدیم عبرانی حملہ آوروں نے ساری بالغ مرد آبادی کو قتل کرنے کے بعد ان کی عورتوں اور لڑکیوں کو قیدی بنا لیا۔ اور اب انہیں موسیٰ کی طرف سے کہا گیا کہ خدا کا حکم یہ ہے: ''اور جتنی عورتیں مرد کا منہ دیکھ چکی ہیں ان کو قتل کرڈالو لیکن ان لڑکیوں کو جو مرد سے واقف نہیں اور اچھوتی ہیں اپنے لئے زندہ رکھو''(۱۶)

جیسا کہ ہم اکثر بائیبل میں پڑھتے ہیں، خدا کا حکم ایک سزا تھا۔ ایک طاعون تھی جو ہر فتح کے بعد پھوٹ پڑتی ہے موسیٰ کے کہنے کے مطابق ان قیدی عورتوں کے قصور کا نتیجہ تھی۔ مگر یہ بھی اس امر کی وضاحت نہیں تھی کہ خدا ایسا حکم کیوں دے کہ ''تمام لڑکیاں جنھوں نے مرد کا منہ نہیں دیکھا ''انہیں'' اپنے لئے زندہ رکھو''۔ اس سے جس بات کی وضاحت ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ حکمران طبقہ جانتا تھا کہ اگرچہ وہ جن لوگوں کی کمان کر رہے ہیں وہ بڑی عمر کی عورتوں اور لڑکوں کو قتل کرنے پر تیار ہوں گے لیکن کنواری لڑکیوں کو قتل کرنے سے ہچکچائیں گے۔ کیونکہ انہیں طوائف لونڈیوں اور بیویوں کے طور پر بھی فروخت کرسکیں گے۔

اخلاقیاتِ تسلط

اخلاقیات تسلّط اتنے موثر طریقے سے مسلّط کی گئی تھیں کہ آج بھی جو مرد اور عورتیں

بااخلاق اور اچھے لوگ سمجھے جاتے ہیں اس قسم کی عبارتوں کو کوئی سوال کئے بغیر پڑھ جاتے ہیں کہ ایک منصف اور حق پسند خدا ایسے بھیانک اور وحشیانہ کاموں کا کیسے حکم دے سکتا ہے اور نہ ہی وہ بعض مسلمان مردوں کی اخلاقیات پر اعتراض کرتے دکھائی دیتے ہیں جو خود ہمارے زمانے میں کسی حقیقی یا فرضی جنسی بے راہ روی پر ''عورتوں کی عصمت کی حفاظت'' کے نام پر اپنی بیٹیوں، بہنوں، بیویوں، پوتیوں اور نواسیوں کو تشدد کا نشانہ بناتے ہیں، حتیٰ کہ قتل تک کر دیتے ہیں۔ نہ ہی وہ ان پند و نصائح کو قابل اعتراض سمجھتے ہیں کہ ان کی اپنی نظر میں اور عموماً دیگر لوگوں کے خیال میں وہ عورتیں جو کہ نصفِ انسانیت ہیں اس وقت کسی عزت و احترام کے قابل نہیں جب تک وہ جنسی طور پر ''پاک'' نہیں ہیں۔ اسے وہ ''اخلاق'' کا نام دیتے ہیں۔

کیونکہ جب تک ہم یہ سوالات کرتے رہیں ہم اس قسم کے ذہنوں کے مالک نہیں ہو سکتے جو تسلط پر مبنی معاشرے کے لئے درکار ہے جس میں ہمارا ذہنی ارتقا صرف یہیں تک رہے گا اور آگے نہیں بڑھ سکے گا۔ اور اس طرح لاکھوں لوگ اب بھی اس امر کا ادراک حاصل کرنے کے قابل دکھائی نہیں دیتے کہ ہمارا مقدس لٹریچر دراصل کیا کہتا ہے اور یہ اپنی ان حدبندیوں کو برقرار رکھنے کے لئے کیسے کام کرتا ہے جو ہمیں ایک تسلّط پر مبنی نظام کے اندر محبوس رکھتی ہیں۔ نظاموں کے طریقہائے نقشِ ثانی (processes of systems replication) پر سے ویلموس سانی جیسے سائنسدان پردہ اٹھا رہے ہیں۔

شاید ایک نظام کے تحت پیداشدہ اندھے پن کی واضح ترین مثال بائبل میں مذکور عصمت دری کے واقعہ کی روئداد ہے جو کتابِ قضاۃ کے باب ۱۹ میں بیان کی گئی ہے۔ جن پادریوں نے بائبل لکھی ہے وہ ہمیں ایک باپ کے بارے میں بتاتے ہیں کہ اس نے کس طرح اپنی کنواری لڑکی شرابیوں کے ایک گروہ کو پیش کر دی تھی۔ اس کے پاس اعلیٰ قبیلے لاوی سے تعلق رکھنے والا ایک مہمان ٹھہرا ہوا تھا۔ اتنے میں قبیلہ بنجمن کے خبیثوں کا ایک گروہ آ گیا جو مطالبہ کر رہا تھا کہ اس مہمان کو باہر نکال کر ان کے حوالے کر دیا جائے ان کا ارادہ اس کی مار پٹائی کا تھا۔ صاحبِ خانہ نے کہا کہ ٹھہرو ''میری ایک کنواری بیٹی اور (میرے مہمان کی) طوائف موجود ہے ان کے ساتھ جو سلوک چاہو کرو لیکن اس مرد کے ساتھ ایسی ذلیل حرکت

نہ کرنا''[۱۷]

ہمیں ایسی باتیں کبھی کبھار سننے کو ملتی ہیں جنہیں کوئی خاص اہمیت نہیں دی جاتی پھر جب کہانی آگے کو کھلتی ہے تو ہمیں مزید بتایا جاتا ہے ''وہ آدمی اپنی طوائف کو لاکر ان کے حوالے کرتا ہے، انہوں نے اسے مان لیا اور ساری رات اس سے بدسلوکی کرتے رہے اور یہ سلسلہ صبح تک جاری رہا'' پھر وہ کیسے گھسٹتی ہوئی گھر تک پہنچی جہاں ''اس کا آقا'' سورہا تھا: اور وہ کیسے بیدار ہوا اور گھر کا دروازہ کھولا اور اپنے راستے پر چل پڑا'' وہ اس سے ٹکرا کر لڑکھڑایا اور حکم دیا ''اٹھو چلتے ہیں'' پھر اسے پتہ چلا کہ وہ تو مرچکی ہے، اس نے اسے اپنے گدھے پر لادا اور گھر چلا گیا۔[۱۸]

اس وحشت انگیز کہانی میں جو ایک بیٹی اور ایک طوائف کے بھروسے کو ٹھیس پہنچانے، اجتماعی زیادتی اور بے یارومددگار عورت کے قتل کی کہانی ہے کہیں رحم کا ایک شائبہ تک نہیں ملتا چہ جائیکہ اخلاقی ناپسندیدگی یا غم وغصے کا اظہار کیا گیا ہو۔ لیکن اس سے بھی زیادہ نمایاں بات جو طبیعت کو سخت مکدر کردیتی ہے وہ باپ کی طرف سے اپنی بیٹی کی متاع گراں، کنوارپن قربان کردینے کی پیشکش کردینا ہے اور ممکنہ طور پر اس کی جان بھی۔ اس سے کسی قانون کی خلاف ورزی نہ ہوئی۔ اس سے بھی زیادہ وحشتناک بات یہ ہے کہ وہ اقدامات جو اجتماعی زیادتی، اذیت اور بالآخر ایک ایسی عورت کے قتل کا امکان ظاہر کررہے تھے، جو اساسی طور پر لاوی قبیلے کے ایک فرد کی بیوی تھی، اسی طرح اس سے بھی کوئی قانون شکنی نہیں ہوئی۔ اور یہ سب اس کتاب میں مذکور ہے جو بے شمار اوامرونواہی سے بھری پڑی ہے اور اخلاقی اور قانونی صحیح اور غلط کا درس دیتی ہے۔

مختصراً یہ کہ اس مقدس متن کے ساتھ شعبدہ بازی کرکے خدائی قانون کو ایسی شکل دے دی گئی ہے کہ ہمیں اس میں یہ پڑھنے کو ملتا ہے کہ انسانیت کے نصف حصے کو ان کے باپ اور ان کے شوہر قانونی طور پر زنابالجبر، مارپٹائی، اذیت رسانی یا قتل کردیئے جانے کے لئے پیش کرسکتے ہیں، ان سے ایسا سلوک کرنے والے کسی سزا یا اخلاقی سرزنش کا خوف محسوس کیئے بغیر من مانی کرتے رہتے ہیں۔

اس سے بھی زیادہ سنگدلانہ پیغام کی حامل ایک کہانی ہے جو پوری مغربی دنیا کے مذہبی اجتماعات اور سنڈے سکولز کلاسوں میں بطور ایک سبق آموز حکایت کے سنائی جاتی

MashalBooks.org

ہے: یہ مشہور کہانی لوؔط کی ہے جب دوگناہ بھرے شہر ''سدوم'' اور ''گومّرہ'' تباہ ہوئے اور ان میں واحد بچنے والے ''شخص'' یہ تھے۔ یہاں ہم ایک بار پھر عہدنامۂ عتیق کی کتاب پیدائش کے باب ۸:۱۹ میں ایک انتہائی سنگدلانہ رویئے کا ذکر پڑھتے ہیں جو بظاہر ایک وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا مسلّمہ رواج بن چکا تھا۔ لوؔط نے اپنے دومہمانوں کو بچانے کے لئے اپنی دوکنواری لڑکیاں (شاید وہ ابھی بچیاں ہی تھیں کیونکہ اس زمانے میں لڑکیوں کو بلوغت کو پہنچتے ہی بیاہ دیا جاتا تھا) بدمعاش حملہ آوروں کے سامنے پیش کردی تھیں کیونکہ وہ ان کے درودیوار کو توڑدینے کی دھمکیاں دے رہے تھے۔ یہاں ہم ایک بار پھر دیکھ رہے ہیں کہ کسی قانون کی خلاف ورزی یا حق پرستانہ غم وغصے کا اظہار اس وقت بھی نہیں ملتا جب ایک باپ اپنی بیٹیوں سے ایسا غیر فطری سلوک کررہا تھا۔ اس کے بالکل برعکس چونکہ لوؔط کے دونوں مہمان دراصل خدا کے بھیجے ہوئے دوفرشتے تھے خدانے ''سدوم'' اور ''گومّرہ'' پر گندھک کے پتھروں اور آگ کی بارش کردی جو ان لوگوں کی جنسی بدفطرتی کی سزا تھی، لوط کو جزا مل گئی اور صرف وہ اور ان کا خاندان محفوظ رہے۔ (۱۹)

نظریۂ تقلیب ثقافت کے تناظر میں بائبلی اخلاقیات اور اس کے مطلوبہ نظام کی ان مثالوں سے ہم کیا سیکھتے ہیں؟ بالکل واضح امر ہے کہ عورتوں کو مردوں کی جنسی غلامی میں جکڑ کر مردانہ غلبے پر مبنی سخت گیر نظام کے اس تقاضے کو پورا کرنے کی ضرورت تھی کہ باپ کی جائداد بیٹے کو منتقل ہو اور عورتوں اور بچوں کی محنت کے پھل مردوں کی جھولی میں گریں۔ یہ اس سیاسی اور نظریاتی ضرورت کے تحت بھی مسلط کیا گیا کہ اس قدیم نظام کی بنیاد ہی کو الٹ دیا جائے جس میں عورتیں جنسی، اقتصادی اور سیاسی طور پر آزاد کارندہ تھیں اور جس میں دیوی الوہیت کے بلند ترین مقام پر فائز تھی۔ کیونکہ ایسی تقلیب کے ذریعے ہی سخت گیر نظامِ مراتب پر مبنی قوت قائم رہ سکتی تھی۔

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں یہ کسی اتفاقی امر کا نتیجہ نہیں تھا کہ مرد کا تسلط، امن وانصاف پر مبنی نظام سے مراتب پر مبنی متشددانہ نظام میں منتقلی، کا حصہ تھا جس پر حریص اور وحشی مردوں کی حکمرانی ہوتی تھی۔ نہ ہی نظاموں کے تناظر میں دیکھا جائے تو، یہ کوئی اتفاقی امر تھا کہ عہدنامۂ عتیق میں عورتوں کو ان کے سابق کردار، (بطور پادری) سے اس لئے خارج کردیا گیا تھا کہ مذہبی قوانین، جواب معاشرے پر حکمرانی کررہے تھے، وہ صرف مردوں کے

بنائے ہوئے تھے۔ اور یہ بھی کوئی اتفاقی بات نہیں کہ علم کے درخت اور زندگی کے درخت جوکبھی دیوی کی پرستش سے وابستہ تھے یہاں ان کی نمائندگی اعلیٰ ترین مردِ الوہیّت کی نجی املاک سے ہورہی ہے جو مرد حکمرانوں کے معاشرے کی علامت اور جائز وناجائز کی علامت بنی ہوئی ہیں معاشرے میں موت وزندگی کے فیصلے بھی کرتی ہیں اور عورتوں پر مرد کی حکمرانی بھی قائم کرتی ہیں۔

علم بُرا ہے، ولادت گندی ہے، موت مقدس ہے

جیسا کہ ہم کتابِ پیدائش میں آدم اور حوّا کو دائمی سزا ملنے کی روئداد پڑھ چکے ہیں کہ یہوواہ نے انہیں شجرِ علم سے دور رہنے کا حکم دیا تھا جس کی ان سے خلاف ورزی سرزد ہوگئی تھی، اسی طرح دنیا میں حکمران مرد پادری کے اقتدار کے خلاف بغاوت انتہائی قبیح گناہ قرار دے دی گئی تھی۔ استبدادیت اور مردانہ تسلط کا ٹھوس جواز اسی مقولے کو بنایا گیا کہ جدید مطلق العنان اور آئندہ آنے والے مطلق العنان خواہ وہ دائیں بازو کے ملحد ہوں یا بائیں بازو کے، اپنے پیروکاروں کو یہی تبلیغ کرتے ہیں: ''مت سوچو، جو کچھ ہے اسے قبول کرو اور اسے بھی قبول کرو کہ مقتدر جو کچھ کہتا ہے وہ سچ ہے۔'' مزید برآں اپنی ذہانت کو مت استعمال کرو۔ اپنی دماغی قوتوں کو ہم پر اعتراض کرنے یا خودمختارانہ علم حاصل کرنے کے لئے مت استعمال کرو کیونکہ اگر ایسا کروگے تو تمہاری سزا فی الواقع نہایت سنگین ہوگی۔

لیکن اس کے ساتھ ہی حاکم مقتدر کے احکام کی خلاف ورزی اور اچھائی وبرائی کے بارے میں آزادانہ طور پر علم حاصل کرنے کی جرأت کرنے کو انتہائی گھناؤنے جرائم قرار دے دیا گیا۔ قتل، اور اپنے ساتھ کے انسانوں کو غلام بنالینے، ان کی املاک تباہ کرنے اور ہتھیا لینے کو ہمارے بائبل میں بکثرت قابل معافی گردانا گیا ہے۔ جنگ کے دوران قتل کرنے کی خدا کی طرف سے اسی طرح اجازت دی گئی ہے جیسا کہ مالِ غنیمت کے لئے لوٹ مار، عورتوں اور بچوں کے عصمت دری اور پورے پورے شہر جلا دینے کی اجازت دی گئی ہے۔ ہر قسم کے غیر متشددانہ جرائم بشمول جنسی فعل کے لئے سزائے موت کو بھی اسی طرح پیش کیا گیا ہے جیسے کہ یہ خدا کی طرف سے مقرر کردہ اقدامِ انصاف ہو۔ اور حتیٰ کہ ایک بھائی کے ہاتھ

سے دوسرے بھائی کا با قاعدہ منصوبہ بندی کے تحت قتل اتنا سنگین جرم نہیں ہے جتنا کہ شجرِ علم کا پھل کھانے کی ممانعت کے لئے مقتدر کے حکم کی خلاف ورزی کرنا جرم ہے کیونکہ یہ قابیل کے ہاتھوں اپنے بھائی ہابیل کا قتل نہیں تھا جس پر بنی نوع انسانی کو ہمیشہ کے لئے افسردہ رہنے کی سزا بھگتنا پڑ رہی ہے بلکہ یہ حوّا کا غیر مجاز یا اپنی آزادانہ مرضی سے اچھائی یا برائی کا ''ذائقہ'' چکھنے کا نتیجہ تھا۔

ساتھ ہی ساتھ انسان کو قتل یا زخمی کر کے خون ریزی کرنا (خواہ وہ جنگ میں ہو، وحشیانہ سزائیں دینے سے ہو، یا عورتوں اور بچوں پر مطلق اختیار آزمانے کے نتیجے میں ہو) ایک روایتی طرزِ عمل بن گیا لیکن اب زندگی دینا ایک عفونت پھیلانے والا گندا کام قرار پا گیا۔ عہد نامہ عتیق میں جذام سے متعلقہ تطہیرات اور پاک و ناپاک گوشت کے ضمن میں ہم بچے کی پیدائش کے عمل کو بھی پھنسا ہوا پاتے ہیں، یہاں 'کتاب احبار' ۱۲ میں ہم پڑھتے ہیں کہ جس عورت نے بچے کو جنم دیا ہو، اسے پاک کرنے کے عمل میں سے گزارا جائے تا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس کی ''ناپاکی'' دوسروں کو بھی ناپاک کر کے رکھ دے، اس عمل میں اسے نہ صرف سب سے الگ تھلگ کر دیا جاتا ہے بلکہ پادریوں کو ادائیگی اور دیگر رسوم کے اخراجات برداشت کرنا بھی شامل کر دیا گیا ہے۔ کتابِ احبار میں کہا گیا ہے ''اور جب اس کی طہارت کے ایّام پورے ہو جائیں تو قربانی کے لئے ایک یکسالہ برّہ، خطا کی قربانی کے لئے کبوتر کا ایک بچہ یا ایک قمری خیمۂ اجتماع کے دروازے پر کاہن کے پاس لائی جائے تا کہ کاہن انہیں کفارے کے لئے خدا کے حضور پیش کرے'' اس طرح وہ بالکل پاک صاف ہو جائے گی۔ (۲۰)

اور اسی طرح پہلے میسوپوٹیمیا اور کنعان میں اور بعد ازاں جوڈیا اور اسرائیل کی مذہبی ریاستوں میں جنگ و جدل، ظلم و استبداد اور عورتوں کی محکومی، نئے نظامِ تسلّط کی اخلاقیات و معاشرت کے خصوصی خدّ و خال بن گئے۔ اساطیر اور داستانوں کو چابکدستی کے ساتھ نیا رنگ دے کر حصولِ علم کو گناہِ عظیم قرار دے دیا گیا۔ حتیٰ کہ بچے کی پیدائش کے عمل کو بھی گندا کام سمجھا جانے لگا۔ مختصر یہ کہ ہمارے ثقافتی ارتقا کو ایک دوسرے راستے کی طرف موڑ دینے کا عمل ایسا کامیاب ہوا کہ حقیقت مکمل طور پر سر کے بل کھڑی کر دی گئی۔

مزید برآں جب ہم پیچھے مڑ کر ماضی کے مختلف ادوار کو دیکھتے ہیں تو تاریخ کو بھی ان

مؤرخوں کی کارگزاری پاتے ہیں جو طاقتور آقاؤں کے خدمت گزار تھے، انہیں مدد دینے والے فلاسفر اور کاہن (پادری) بھی ان سے کچھ مختلف نہیں تھے۔ چنانچہ ہم پرانے دماغ کو ازسرنو اظہار کے لئے جدوجہد کرتا ہوا پاتے ہیں۔ یہ انسانیت کا وہ ابتدائی دماغ تھا جو اب بالکل مختلف ارتقائی راستے پر گامزن تھا۔

عظیم دیوی جس کی پرستش کسی زمانے میں ایک زیادہ پُرامن اور منصف مزاج معاشرے کا نظریاتی تخمدان ہوا کرتی تھی مکمل طور پر معدوم نہیں ہوئی تھی۔ اگرچہ وہ اب دنیا پر حکمرانی کرنے والے اعلیٰ ترین اصول کے طور پر موجود نہیں رہی تھی تب بھی وہ ایک قابل لحاظ قوت تھی۔ ایسی قوت جس کا یورپی عہد متوسط میں بھی بطور مادرِ خدا احترام کیا جاتا تھا۔ پیغمبروں اور کاہنوں کی ہدایات اور احکامات امتناع کی صدیاں گزر جانے کے باوجود اس کی پرستش مکمل طور پر نابود نہ ہوسکی۔ ''ہورس'' (Horus) اور ''اوسیریس'' (Osiris) کی طرح ''ہیلیوس'' (Helios) اور ''ڈایونیسس'' (Dionysus) اور ان سے بھی بہت پہلے کٹل ہویوک کے نوجوان دیوتا اور نوجوان دیوی ''پرسیفون'' (Persephone) یا ''کور'' (Kore) کی طرح ایلیوس کے مقام پر لگنے والے میلوں (Eleusinian Mystries) میں یسوع درحقیقت اس وقت بھی الوہی دیوی کا بچہ تھا اور اسی کی طرح پہلے کے الوہی بچوں کی مانند وہ ایسٹر پر ہر موسم بہار میں اپنے ظہور کے ساتھ فطرت کی احیائے نو کی علامت بنتا ہے۔ جیسے کہ دیوی کا بیٹا کسی زمانے میں اس کا شریکِ حیات بھی تھا ''مسیحی صنمیات میں مسیح بھی میری (مدر چرچ) کا دولہا ہے جو اس کی ماں ہے اور آئندہ بھی رہے گی۔ [۲۱] بپتسمے کے پانی کا ظرف یا جام جو مسیحی رسوم میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے، اب بھی ظرفِ حیات کی قدیم نسوانی علامت ہے۔ جیسے کہ اساطیری داستانوں کا یونگی مؤرخ ایرک نیومن لکھتا ہے ''بپتسمہ عظیم مادر کے پُراسرار رحم اور اس کے آبِ حیات کی واپسی کی علامت ہے'' [۲۲]

یہاں تک کہ یسوع کا جو یوم پیدائش (اس کا اپنا یوم پیدائش تاریخی طور پر نامعلوم ہے) منتخب لیا گیا ہے، اب اسے ان تہواروں پر دست درازی سمجھا جاتا ہے جو پہلے پہل دیوی کی پرستش کے ساتھ منسوب ہوا کرتے تھے۔ کرسمس کا وقت یا مسیح کی عشائے ربانی کا وقت اس لئے چنا گیا تھا کہ یہ سال کا وہ وقت تھا جب قدیم لوگ روایتی طور پر موسم سرما کا ''انقلابِ شمسی'' (solstics) مناتے تھے۔ یہ وہ دن ہے جب دیوی سورج کو جنم دیتی ہے۔ یہ عموماً ۲۱

اور۲۴ دسمبر کے درمیان واقع ہوتا ہے۔ نیز یہ ۲۱ دسمبر سے ۶ جنوری کے درمیان کا عرصہ (جو Epiphany کے لئے چُنا گیا ہے) ہوتا ہے جب رومنوں کے زمانے میں بہت سی مشہور ہستیوں کے جنم دن اور تہواروں کی تجدید کے میلے منائے جاتے تھے اور اب بھی بدستور منائے جارہے ہیں۔ (۲۳)

مگر ان تمام مشابہتوں کے ساتھ بنیادی اختلافات بھی ہیں۔ سرکاری مسیحی عبادت گاہِ عامہ میں اب صرف عورت واحد قابل فہم شبیہہ ہے اس کا اب بھی بطور رحم دل، ہمدرد وغمگسار ماں احترام کیا جاتا ہے۔ اور بعض مجسمہ نگاریوں مثلاً "Vierges Ouvrantes" میں وہ اب بھی اپنے جسم میں بنیادی معجزہ اور اسرارِ زندگی رکھتی ہے۔ (۲۴) مگر اب وہ واضح طور پر ایک چھوٹی شبیہہ ہے۔ مزید برآں اس مرد کے تسلط کے حامل مذہب کی مرکزی اساطیری شبیہہ ننھے خدا کی پیدائش نہیں رہی، یہ اس کی تصلیب اور موت ہے۔

اس کی ماں مسیح کو صرف جنم دیتی ہے، یہ اس کا صرف آسمانی باپ ہے جو اسے زمین پر بھیجتا ہے، وہ قربانی کا صرف فرضی قصور وار ہے جسے انسانی شر اور گناہ کا کفارہ بنایا گیا۔ چونکہ انسانوں میں اسے صرف ''بچانے'' کے لئے بھیجا گیا ہے اس ''آنسوؤں کی وادی'' میں اس کے قیام کا مختصر ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا۔ یہ صرف اس کی موت اور زندگی بعداز موت میں بہتر زندگی کا وعدہ ہے جو معنی رکھتا ہے...... مگر صرف ان لوگوں کے لئے جو وفاداری سے باپ کے احکامات کی اطاعت کریں۔ باقی ماندہ کے لئے موت میں بھی کوئی امید نہیں ....ان کے لئے صرف دائمی عذاب اور لعنت و رسوائی ہے۔

دیوی کی زندگی دینے، زندگی برقرار رکھنے اور زندگی کی قوت ہائے باز آفرینی کی مذہبی نقطۂ نظر سے مجسمہ سازی پر اب کوئی زور نہیں دیا جاتا۔ پھول اور پرندے، جانور اور درخت اب رخصت ہوگئے ہیں۔ سوائے پس منظر فراہم کرنے کے یہ کوئی کام نہیں دیتے۔ دیوی کی یادگار اب بھی موجود ہے جس میں اس نے اپنے مقدس بچے کو بازوؤں میں اٹھا رکھا ہے: اس کا عنوان "The Madona and Child" ہے۔ لیکن اب مرد اور عورت، دونوں کے ذہن پر ایک ہی موضوع سوار ہے جو سارے مسیحی آرٹ میں سرایت کئے ہوئے ہے۔ کینوس کے کینوس ان مسیحی بزرگوں کی تصاویر پیش کرتے ہیں جو اپنے جسموں کو ہولناک اذیتیں پہنچا رہے ہیں۔ مسیحی شہیدوں کی پینٹنگ بعد پینٹنگ سامنے آرہی ہے جنہیں ظالمانہ انداز

میں ذبح کیا جارہا ہے۔ ''ڈیوار'' کے بنائے ہوئے مسیحی دوزخ کے لرزہ خیز مناظر، مائیکل اینجلو کی "The Last Judgment" سلوم کی ''جان دی بپٹسٹ'' کے کٹے ہوئے سر کے ساتھ مسلسل ڈانس اس موضوع کو اپنے اپنے زاویئے سے اجاگر کررہے ہیں۔

اب مسیح کو صلیب دم توڑتے ہوئے دکھانے جیسے تکلیف دہ مناظر آرٹ کی مرکزی شبیہ کے طور پر فطرت اور زندگی کو اجاگر نہیں کرتے بلکہ درد وکرب کو بڑھاتے اور موت کو یاد دلاتے ہیں۔ (۲۵) اب اس نئی حقیقت میں، جس کے بارے میں کہاجاتا ہے کہ، یہ صرف اور صرف مذکر خدا کی تخلیق ہے جام (Chalice) بطور زندگی دہندہ و پرورش کنندہ اعلیٰ ترین مظہرِ اقتدار نہیں ہے، اس کی جگہ اس قوت نے لے لی ہے جو غلبہ حاصل کرتی اور تباہی پھیلاتی ہے، وہ ہے خنجر (Blade) کی مہلک قوت۔ اور یہ وہ حقیقت ہے جو آج تک ساری انسانیت، (مرد اور عورت، دونوں) کے لئے باعثِ اذیت بنی رہی ہے۔

MashalBooks.org

باب8

تاریخ کا دوسرا نصف: حصہ اول

زمانۂ ماضی کے دشت پیماؤں کی طرح ہم بھی آثاریاتی دریافتوں کا سفر کرتے کرتے ایک مختلف حقیقت تک جا پہنچے۔ وہاں ہم نے کوئی ازلی طور پر بگڑے ہوئے وحشیانہ مناظر نہیں پائے بلکہ وہ بہتر زندگی کے امکانات کے حیرت انگیز مناظر تھے۔ ہم نے دیکھا کہ تہذیبِ انسانی کے ابتدائی دنوں میں ہمارے ثقافتی ارتقا کی منزل کو کس طرح کاٹا گیا اور پھر کس طرح اسے مکمل طور پر موڑ دیا گیا۔ ہم نے یہ بھی دیکھا کہ جب نئے سرے سے ہمارا سماجی اور فنی ارتقا شروع ہوا تو یہ ایک مختلف سمت میں سفر کر رہا تھا، پھر ہم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ تہذیب کی پرانی جڑیں مکمل طور پر کٹنے سے کس طرح بچی رہ گئیں۔

زندگی اور فطرت سے پرانی محبت، چھیننے کی بجائے شریک کار بننے اور جبر کی بجائے پیار کے پرانے طور طریقے ختم نہیں ہوئے تھے۔ لیکن عورتوں کی طرح عورتوں سے منسوب صفات کو بھی ثانوی حیثیت دے دی گئی تھی۔

نہ ہی حُسن وصداقت اور امن وانصاف کے لئے انسانوں کی آرزو غائب ہوئی تھی۔ البتہ اس پر نئے سماجی نظام نے پانی پھیر دیا تھا۔ تاہم پرانی آرزو پھر بھی سر اٹھاتی رہی اور کسی نہ کسی طریقے سے اپنا اظہار کرتی رہی۔ لیکن یہ کسی واضح ادراک کے بغیر آگے بڑھ رہی تھی۔ اصل صورت حال یہ تھی کہ حقیقی مسئلہ انسانی تعلقات (یعنی انسانیت کے دو نصف نصف حصوں کے تعلقات) کی تشکیل کا تھا جو ایک بے لچک اور جابرانہ نظام کی طرف بڑھ رہے تھے۔

حقیقت کی یہ قلبِ ماہیت اتنی کامیاب رہی کہ یہ بظاہر روزِ روشن طرح واضح حقیقت تقریباً مکمل طور پر نظرانداز کردی گئی۔ (جب معاشرہ انسانی تعلقات کی اصل بنیاد کو ہی تبدیل کردیتا ہے تو اس سے زندگی اور فکر کے تمام پہلوؤں پر بے پناہ اثرات پڑتے ہیں) اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہماری جدید اور مربوط ترین زبانیں بھی، جن میں ہر چیز کے لئے، خواہ وہ قابل تصوّر ہو یا نہ ہو، فنی اصطلاحات موجود ہیں، تذکیروتانیث کے ایسے الفاظ سے محروم ہیں جو تسلط پر مبنی اور شراکت پر مبنی معاشرے کے مابین گہرے فرق کا اظہار کرسکتے ہوں۔

زیادہ سے زیادہ یہی ہے کہ ہمارے پاس ''پدرسرانہ نظام''(patriarchy) کے برعکس نظام کے لئے صرف ''مادرسری'' یا ''مادرسرانہ''(matriarchy) کے الفاظ ہیں، مگر یہ ان کو ایک ہی سکے کے دورُخ قرار دے کر ''حقیقت'' (اور ''فطرتِ انسانی'') کے صرف مروّجہ نظریئے کو تقویت دیتے ہیں۔ مزید برآں یہ الفاظ ذہنوں میں جذبات سے مملواور جابر باپوں اور دانشمند بوڑھوں کی متضاد شبیہات لے کر آتے ہیں۔ ''پدرسری'' کے الفاظ بھی ہمارے موجودہ نظام کی صحیح ترجمانی نہیں کرتے۔

ہم جن نظاموں پر غور کرتے رہے ہیں، ان کے ذکر کے لئے، ''شراکت پرمبنی'' اور ''تسلط پرمبنی'' کی اصطلاحیں کافی حد تک مفید ہیں کہ یہ دو متضاد اصولوں کی وضاحت کردیتی ہیں۔ اگرچہ یہ ان کے مابین اصل فرق کو گرفت میں لے آتی ہیں مگر ایک نازک نقطے کو تخصیص کے ساتھ بیان کرنے سے قاصر رہتی ہیں: انسانیت کے مؤنث نصف حصے اور مذکر نصف حصے کے باہمی تعلق کی عمارت کھڑی کرنے کے لئے دو متضاد طریقے ہیں جو ایک سماجی نظام کی کلّیت(totality) پر گہرے طور پر اثرانداز ہوتے ہیں۔

اب ہم ایسے نقطے پر پہنچے ہیں جہاں ہمیں وضاحت اور حُسنِ ابلاغ، دونوں کے لئے مروّجہ ذخیرۂ الفاظ سے کہیں زیادہ جامع اصطلاحات کی ضرورت ہے تا کہ اس امر کا صحیح طور پر جائزہ لے سکیں کہ یہ دو متبادل ہمارے ثقافتی، معاشرتی اور اور فنیاتی ارتقا کو کس طرح متاثر کریں گے۔ ہم قدیم یونان کی تہذیب کا بھی گہرا جائزہ لینا چاہتے ہیں جسے سب سے پہلے سائنسی افکار کے مختصر اور جامع اظہار کی وجہ سے بہت زیادہ شہرت حاصل ہوئی تھی۔ میں دونئی اصطلاحات تجویز کرنا چاہتی ہوں جنہیں میں مخصوص سیاق وسباق میں تسلط ماڈل ورشر اکت ماڈل کے متبادلات کے طور پر استعمال کروں گی۔

ایسے سماجی نظام کو بیان کرنے کے لئے جسے مرد طاقت کے استعمال یا طاقت کی دھمکی دے کر چلا رہے ہوں، میں اس کے لئے "androeracy" (مرد کی حکومت) کی اصطلاح استعمال کروں گی۔ اس لفظ کی جڑ یونانی لفظ "andros" یا "man" ہے اور "krato" کے معنی حکمرانی کے ہیں۔ دوسرے انسانی نصف حصے کی حکمرانی پر مبنی نظام کے لئے میں "gylany" کی نئی اصطلاح استعمال کروں گی [1] اس میں "gy" کے معنی عورت کے ہیں جو یونانی کے لفظ "gyne" سے ماخوذ ہیں۔ جبکہ اول الذکر اصطلاح کے ''اینڈروس'' کا "An" ، اینڈروس (andros) سے ماخوذ ہے جس کے معنی ''مرد'' کے ہیں۔ "gylany" کے حرف "l" کے دوہرے معنی ہیں انگلش میں یہ "linking" کا اظہار کرتا ہے جو انسانیت کی دونوں نصفوں کو آپس میں جوڑتا ہے، اس کے برعکس لفظ "androcracy" صرف انہی کے مرتبے کے تحفظ اور فروغ کا اظہار کرتا ہے۔ یونانی زبان میں "l" فعل "lyein" یا "Lyo" سے ماخوذ ہے۔ اس کے بھی دومعنے ہیں: ''حل کرنا یا ''ٹھان لینا'' اور برخاست کرنا یا آزادکردینا (جیسا کہ catalysis میں یہ مفہوم پایاجاتا ہے۔ اس حوالے سے حرف "l" ہمارے مسائل اس طرح حل کرنے کی طرف اشارہ کرتا ہے جس میں انسانیت کے دونوں نصف حصوں کے کردار کو زائل ہونے سے بچایا گیا یعنی تحفظ دیا گیا ہو۔

یہ دو بالکل مختلف نظام ہائے مراتب کے مابین ایک لطیف فرق کی طرف ہماری رہنمائی کرتا ہے جو کہ مروّجہ استعمال میں نہیں کیا جاتا۔ جیسا کہ یہاں استعمال کیا گیا ہے، نظامِ مراتب (hierarchy) کی اصطلاح ایسی انسانی درجہ بندی پر مبنی نظاموں کی طرف اشارہ کرتی ہے جو طاقت یا طاقت کے استعمال کی دھمکی کے ذریعے وجود میں آئے ہوں۔ یہ ''غلبے پر مبنی نظام ہائے مراتب'' ایک دوسری قسم کے نظامِ مراتب سے بہت مختلف ہیں جنہیں میں "actualization hierachies" (عملِ تشکیل پر مبنی نظام ہائے مراتب) کا نام دینے کی تجویز پیش کرتی ہوں۔ یہ نظام درنظام قسم کے جانے پہچانے نظام ہائے مراتب ہیں جیسے جانداروں کے جسموں میں خلیئے (cells) اور اعضا ہوتے ہیں۔ جو ایک عملِ ترقی کے ذریعے اعلیٰ سے اعلیٰ تر منازل کی طرف بڑھتے ہیں اور اس سے ان کی کارکردگی بھی بہتر سے بہتر ہوتی چلی جاتی ہے۔ اس کے متقابل، جیسے کہ ہم اپنے گردوپیش میں دیکھتے ہیں، تسلط پر مبنی نظام ہائے مراتب اپنی خصوصیات کے تقاضے کے تحت اعلیٰ کارکردگیوں (higher functions)

MashalBooks.org

کے عملِ تشکیل کی راہ میں رکاوٹ ڈالتے رہتے ہیں۔ نہ صرف مجموعی معاشرتی نظام میں بلکہ انسانوں کو انفرادی طور پر بھی ترقی سے محروم کرتے رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ سماجی تنظیم گائیلینک (gylanic) ماڈل ہمارے مستقبل کے لئے ''اینڈروکریٹک'' (androcratic) ماڈل سے کہیں زیادہ ارتقائی امکانات کے راستے کھولتا ہے۔

ہمارا مخفی ورثہ

ان دومتضاد سماجی ماڈلوں نے ہمارے ثقافتی ارتقا کو کس طرح متاثر کیا، اسے بیان کرنے کے لئے یونانی ماخذ کی اصطلاحات کا استعمال بہت مناسب معلوم ہوتا ہے۔ چونکہ گائلینی اور اینڈروکریسی کے درمیان آویزش اس کرۂ ارض پر زندگی گزارنے کے دومختلف نظام ہونے کی بنا پر ہے، یہ اس وقت مزید واضح ہوکر سامنے آجاتی ہے اگر ہم قدیم یونان پر نظریۂ ثقافتی تقلیب کی روشنی میں نئے سرے سے نظر ڈالیں۔

مغربی تہذیب سے آگاہی بیشتر ہومر کی تصانیف کے مطالعے فیثاغورث، سقراط، افلاطون اور ارسطو جیسے فلسفیوں کی کتابوں کے انتخاب اور جدید کلاسیکی مؤرخین کے رشحاتِ قلم سے حاصل ہوتی ہے جن میں ''پیریکلز کی گولڈن ایج آف گریس'' کی عظمتوں کے گیت گائے گئے ہیں۔ ہمیں پڑھایا گیا ہے کہ یورپ کی تاریخ انڈویورپیوں یا آریاؤں کے کلچر (ہومر اور ہسیڈ) کے قدیم ریکارڈ سے شروع ہوتی ہے اور ہمارے انصاف اور جمہوریت کے بارے میں بہت سے جدید تصورات کلاسیکی یونان کی شاندار تہذیب کے مرہونِ منت ہیں۔

کبھی کبھی اضافی کتابوں کے سرسری مطالعے سے پتہ چلتا ہے کہ فیثاغورث اخلاقیات کا درس ڈیلفی کی خاتون پادری ''تھیمسٹو کلیہ'' (Themistoclea) سے لیا کرتا تھا یا یہ کہ ارسطو کو ''مینٹنیا'' کی ایک خاتون پادری ''ڈایوٹیمیا'' (Diotema) پڑھایا کرتی تھی (۲) کبھی کبھار ہمیں ایسی عجیب وغریب معلومات بھی مل جاتی ہیں کہ سارے یونان کے رہنما ڈیلفی جایا کرتے تھے جہاں پائتھیا (Pythoness) نامی پادری خاتون انہیں اس دور کے اہم ترین معاشرتی اور سیاسی مسائل کے بارے میں مشورے دیا کرتی تھی۔ مگر اکثر ایسا ہوتا ہے کہ ہم جو کچھ پڑھتے ہیں، اس میں عورتوں کا مشکل ہی سے کہیں ذکر ہوتا ہے۔ اور نہ ہی عموماً کریٹ کا ذکر ملتا

MashalBooks.org

ہے۔

درحقیقت ہمیں یہ تاثر ملا ہوا ہے کہ یورپی تہذیب ابتداء کچھ نہیں تھی اور یہ کہ انڈویورپین فاتحین کی آمد تک وہاں صرف وحشی لوگ آباد تھے جن کی کوئی خاص ثقافت نہیں ہوتی تھی۔ ہمیں یہ بھی باور کرایا گیا کہ جب کریٹ میں پہلی بار یورپی تہذیب برگ وبار لانے لگی تو اس زمانے میں عورتوں کے کوئی شہری اور سیاسی حقوق نہیں تھے اور نہ ہی انہیں اقتدار میں شریک کیا گیا تھا۔

تاہم ہومر کی ''اوڈیسی'' میں بعض زور دار کردار عورتوں کے ہیں جب ایکشن شروع ہوتا ہے تو "Odysesseus" پُرشہوت حسینہ "Calypso" کے محاصرے میں ہے جو جزیرہ "Ogygia" کی حکمران ہے اور جب عظیم دیوی ایتھنے کی مداخلت سے اوڈیسیس کو بالآخر نجات ملتی ہے اور وہ جزیرے کو چھوڑنے لگتا ہے تو وہاں زبردست طوفان آجاتا ہے اور اسے ڈوبنے سے بچنے کے لئے ''اینو'' (Ino) دیوی کا دیا ہوا ایک دوپٹہ کام دیتا ہے۔ اس غیرمرئی دوپٹے نے اس وقت تک اسے اٹھائے رکھا جب تک طوفان نے اسے ''فیشنیاؤں'' (Phaecians) کے ملک میں پہنچادیا وہاں اسے شہزادی ''نوسیکا'' (Nausicca) نے پالیا۔

فیشین کے عظیم الشان دربار میں، جسے سکالرز مائسینیا کے شاہی ایوانوں کی صحیح تصویر قرار دیتے ہیں ''نوسیکا'' کی ماں ''ملکہ آرتی'' (Queen Arete) کو بادشاہ نے اتنا احترام دیا ''جتنا کسی دوسری عورت کو نہیں دیا گیا تھا'' اور اس کی ہر کوئی پرستش کرتا تھا، یہاں تک کہ جب وہ شہر میں جاتی تو تمام لوگ اس کو ایک دیوی کی طرح دیکھتے تھے۔ (۳) ''اوڈیسیس'' فیشیا سے نکلا تو اس کا پھر عجیب الخلقت عورتوں کے خوفناک جھرمٹ سے سابقہ پڑ گیا یہ ''سیلا'' (Scylla) اور کریبڈیس (Charybdis) یہ شہوت پرست سائرنز میں سے تھیں اور ان میں ایک انتہائی طاقتور ساحرہ ''سرسی'' تھی۔

اس کے گھر واپس آنے پر بھی ہم یہ دیکھتے ہیں کہ اس کی بیوی ''پینی لوپ'' (Penelope) ایک مضبوط اور پُرعزم عورت ہے، وہ حیرت انگیز طور پر عاشقوں کے جال میں پھنسنے کی مزاحمت کررہی ہے، وہ سب اس سے اس لئے شادی کے خواہشمند ہیں کہ وہ جزیرہ ''ایتھاکا'' کا کنٹرول سنبھال سکیں۔ یہ اس امر کی ایک مضبوط شہادت ہے کہ یونان پر اکائنوں کا حملہ ہوجانے کے باوجود شجرۂ مادری کا سلسلہ ہنوز جاری تھا اور ایسا ہونا حکمرانی

MashalBooks.org

کے کسی دعوے کے لئے ایک شرطِ اول کی حیثیت رکھتا تھا۔ (۴)

ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ ہسیڈ نے ''پُرامن اور آسائشوں سے بھرپور حالات میں زندگی گزارنے والی سنہری نسل''، جس پر ثمر آور زمین اپنے ''پھل نچھاور کیا کرتی تھی'' کے جوحوالہ جات دیئے ہیں وہ اُن سے بھی زیادہ پُرامن اور مبنی پر انصاف جدید حجری(Neolithic) دور کے کاشتکار باشندے تھے، جنہیں اس وقت بھی داستانوں میں یاد کیا جاتا تھا۔ ہسیڈ کی اصنامیات میں ایک مردانہ ہیئت رکھنے والی شخصیت"Chaos" کو کائنات کو پیدا کرنے کا جو کریڈٹ دیا جاتا ہے وہ اس امر کی مزید تصدیق ہے کہ جسے ہم آثاریاتی ریکارڈ کے حوالے سے جانتے ہیں وہ انڈویورپین اقتدار تھا جو مادی تباہی اور ثقافتی انتشار کے ذریعہ مسلط کیا گیا تھا۔

ہومر کی طرح ہسیڈ کی تصنیف ایک قدیم"gylanic"معاشرے کے نظامِ عقائد کے آثار سے بھری پڑی ہے۔ مثال کے طور پر یہ اب بھی ''وسیع آغوش والی دھرتی'' ہے جو قدیم دنیا کی عظیم دیوی کی طرح آسمان اور ''بلند پہاڑیوں (جو مسرور اور شہوت زدہ چڑیل دیویاں ہیں) کو جنم دیتی ہے''۔ اور یہ پھر بھی بطور ایک قدیم مذہب کے ایک نسوانی طاقت ہے جو ''آغوشِ محبت کی لذت حاصل کئے بغیر'' بہ الفاظ دیگر تنِ تنہا، سمندر کو جنم دیتی ہے۔ (۵)

ہسیڈ کی دنیا پہلے ہی مردانہ تسلط کی جنگجو اور نظامِ مراتب کی دنیا ہے مگر یہ پھر بھی ایک ایسا عالم ہے جس میں قدیم شراکت دارانہ نظام ہے۔ زیادہ تخصیص کے ساتھ کہا جائے تو یہ کہنا ہوگا کہ اس میں گائلینک(gylanic) اقدار مکمل طور پر فراموش نہیں کی گئیں۔

ہسیڈ کے نزدیک جنگ انسانی فطرت کا خاصہ نہیں ہے یا جیسا کہ بعد میں یونانی فلسفی ہراکلیٹس دعویٰ کرنے والا تھا ''سب کا باپ'' اور ''سب کا بادشاہ'' ہسیڈ وضاحت کے ساتھ لکھتا ہے کہ یونان میں جنگ اور دیوتائے جنگ Ares کو ''مردوں کی ایک کمتر نسل'' لے کر آئی تھی۔ یہ اکائنوں کی نسل تھی جس نے یونان پر کانسی کے ہتھیاروں سے حملہ کیا تھا۔ پھر ان کے نقشِ قدم پر وہ لوگ چلے جنہیں ہسیڈ بے حد قابل نفرت قرار دیتا ہے۔ یہ ''ڈورنیز'' (Durians) تھے جنہوں نے لوہے کے ہتھیاروں سے یونان کو ملبے کا ڈھیر بنا دیا تھا۔

کہنے کو کوئی کہہ سکتا ہے کہ اگر فرائڈ اور یُون(Jung) نے درست کہا تھا کہ ''جنینیاتی طور پر منتقل شدہ نسلی یادداشت(genetically transmitted race memory) اگر کچھ ہوتی ہے تو

عین ممکن ہے کہ ہسیڈ نے اسی یادداشت کے مطابق ''بہتر اور گمشدہ'' ماضی کے بارے میں بات کی ہو لیکن اس سے کہیں زیادہ امکان یہ ہے کہ ہسیڈ ابھی تک ان کہانیوں کے زیر اثر رہا ہو جو ایک نسل اپنی دوسری نسل کو اور دوسری اپنی تیسری نسل کو سناتی چلی آتی ہے کہ ماضی یوں تھا اور یوں ہوتا رآیا ہے۔

پھر یہ انکشاف کی طرح کی بات ہے کہ ہسیڈ کہتا ہے: ''یہ میری طرف سے نہیں بلکہ میری ماں کی کہی ہوئی کہانی ہے کہ ''ایک زمانے میں زمین اور آسمان ایک ہی قسم کے ہوتے تھے''(۷) اس سے نہ صرف یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی کتابیں ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہونے والی کہانیوں پر مبنی تھیں۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی ماں جو ایک عورت تھی اسے اب تک مرد کے زیر تسلط دنیا کے تذکرے میں کچھ سکون حاصل ہوتا تھا جس کی وجہ سے وہ قدیم اور کم جبر والے زمانے کی محو ہوتی ہوئی یادداشتوں کو تازہ کرتی رہتی تھی۔

ہسیڈ نے تحقیق وتصانیف کا کام اس زمانے کے اواخر میں کیا جسے مؤرخین تاریکی کا دور کہتے ہیں۔ یہ دور کلاسیکی یونان کے ظہور کے ساتھ ختم ہوا، یہ یورپ پر ڈورین حملے کے تقریباً پانچ سو برس بعد کا واقعہ تھا جب اس حملے کے نتیجے میں یورپ زبردست انتشار سے دوچار ہو گیا تھا۔ لیکن جیسا کہ نکولس پلاٹن، جیکو یٹا ہاکیز، جے وی لیوس اور دیگر محققین نے وضاحت کے ساتھ لکھا ہے کہ یونانی تہذیب ڈوریز کے ہاتھوں یورپ کی تباہی و بربادی کی راکھ میں سے پوری طرح ترقی یافتہ شکل میں نہیں ابھری تھی (جیسے کہ ''ایتھنے'' دیوی نے فرضی طور پر زیئس کے سر میں سے جنم لیا تھا)، نہ ہی یہ وحشی حملہ آور اس تہذیب کے بیج اپنے ہمراہ لے کر آئے تھے اور نہ ہی کوئی ایسا مکان تھا، جیسا کہ کبھی کبھی سننے کو ملتا ہے کہ یونانی تہذیب زیادہ تر قدیم اور نسبتاً زیادہ ترقی یافتہ مشرق وسطیٰ کی ثقافتوں سے مستعار لئے گئے تصورات کے ''ثقافتی انتشار'' کا نتیجہ تھی، یہ تصورات تجارت اور دیگر روابط کے ذریعے منتقل ہوئے تھے۔

جس امر کا بہت زیادہ امکان ہے اور جو آثاریاتی معلومات سے بہت زیادہ مطابقت رکھتا ہے وہ کچھ اور ہے: قدیم اکائن(Achaen) حملہ آور جنہوں نے مائسینن زمانے اور انہیں دیس نکالا دینے والے ڈورین آقاؤں کے زمانے میں حکمرانی کی تھی وہ اسی وقت آگے بڑھ سکے تھے جب انہوں نے مفتوحین کی مادی اور روحانی ثقافتوں کا کافی حصہ پہلے ہی جذب

MashalBooks.org

کرلیا تھا۔

جے وی لیوس نے اس طریق عمل کی یوں وضاحت کرنے کی کوشش کی ہے ''آگ سے جلے ہوئے زیتون کے درخت کی طرح منوآن ثقافت کچھ عرصے کے لئے غیر فعال رہی، پھر وہ مائسینین قلعوں کے سایوں میں برگ وبار لانے لگی......ایٹلس کی بیٹیوں، یعنی مینوآن شہزادیوں کی مائسینین جنگجو سرداروں کے ساتھ شادیاں ہوگئیں۔ منوآن ماہرین تعمیرات نے برّعظیم کے محلات کے ڈیزائن بنائے، منوآن پینٹروں ہی نے ان کے گیلے پلستروں پر آبی رنگوں سے نقاشی کی اور منوآن کاتبوں کے ہاتھوں یونانی زبان پہلی بار تحریری زبان بنی۔''(۸)

پھر، اگلے وحشیانہ حملے کے بعد، البتہ ذرا زیادہ تبدیل شدہ انداز میں، وہی منوآن کونپلیں ایک بار پھر پھوٹ پڑیں۔ لیوس لکھتا ہے ''یہ غالباً کوئی حادثاتی امر نہیں کہ ڈورین کریٹ قدیم زمانوں اپنے شاندار قوانین اور اداروں کے حوالے سے بہت شہرت رکھتا تھا جس تنے کی صدیوں کے پُرامن حالات میں محبت سے آبیاری ہوتی رہی، اس کی آسانی سے بیخ کنی نہیں ہوسکتی تھی۔ اسی تنے کے قلم خود یونان میں لگائے گئے جہاں انہوں نے خوب جڑیں پکڑیں اور برگ آور ہوئے''(۹)

چنانچہ ڈورین تباہ کاری کے بعد، لیوس کے مطابق ''ہر چیز ملیامیٹ ہوکر نہیں رہ گئی تھی'' (۱۰) یقیناً بہت کچھ فراموش کردیا گیا ہے، جیسا کہ اب بھی منوآن تہذیب کی یاد دھندلا کر داستان بننا شروع ہوچکی ہے۔ اور بہت کچھ بدل چکا ہے جیسے کہ عظیم دیوی (ہیرا، ایتھنے اور افروڈائیٹ کی شکلوں میں) سرکاری یونانی دیوتاؤں کی فہرست میں زیئس کے ماتحت آچکی ہے۔ تاہم یونانی تہذیب کے اہم اجزاوعناصر اب بھی جابر معاشرے کی بہ نسبت شراکت پر مبنی معاشرے میں زیادہ فٹ بیٹھتے ہیں۔ یا مخصوص اصطلاحات استعمال کرتے ہوئے یوں کہا جاسکتا ہے کہ وہ androcratic سے زیادہ glyanic ہیں۔

فطرت کی گردشی وحدت اور دائروں کی تطبیق

یونانی تہذیب کے اوّلین مظاہر میں سے ایک مظہر وہ فلسفی اور سائنسدان تھے جو سقراطی فلسفیوں اور سائنسدانوں کی آمد سے پہلے ظاہر ہوئے تھے۔ ان کا عالمی نقطۂ نظر (جو بعد میں مشہور ہونے والے نظریات وافکار کا پیش خیمہ ثابت ہوا، اسے بعض لوگ اب بھی حیران کن

اور بحث طلب سمجھتے ہیں) حقیقت کے قریب پہنچنے کی اوّلین سیکولر اور سائنسی کاوش تھا۔ (١١)
کیونکہ ریکارڈ شدہ تاریخ میں یہ پہلا موقع تھا جب کہا گیا تھا کہ علم وہی نہیں ہے جو مقدس اساطیر اور مذہبی رسوم کے ذریعے آمدِ وحی کے طور پر پیش کیا جارہا ہے بلکہ یہ تجربے اور مشاہدے کی بنا پر ثابت ہونے یا نہ ثابت ہوسکنے والے حقائق کا نام ہے۔ مثال کے طور پر ہومر کے تصورات میں قوسِ قزح کو دیوی ''ارلیس'' (Iris) کا اظہار مانا جاتا تھا۔ جبکہ انا کسیمین (Anaximene) کہتے تھے کہ یہ مرطوب ہوا پر پڑنے والی سورج کی شعاؤں کے عکس سے پیدا ہوتی ہے۔ (١٢)

قبل از سقراط دور کے فلسفیوں میں سے زینوفینز(Xenophanes) تھیلز (Thales)، دیوجانس(Diogenes) اور فیثا غورث(Pythagoras) کے افکار، پہلے سے مروّج مذہبی نظریات سے ایک واضح انحراف کی حیثیت رکھتے تھے۔ لیکن غیر معمولی بات یہ ہے کہ ان لوگوں کے بنیادی مفروضے کئی پہلوؤں سے دورِ متأخر"androcratic" نظریۂ حیات کی بہ نسبت دورِ قدیم کے"gylanic" نظریہ سے زیادہ قربت رکھتے ہیں۔

مثال کے طور پر زینوفینز کے نظریات ''اساسی توحید radical monotheism) جو کہ روایتی یونانی مذہب سے بالکل متصادم نظریہ ہے'' کا ابتدائی منبع تھے۔ اس کے نظریات کو یہ نام فلسفی تاریخ دان ''ایڈورڈ ہوسی''(Edward Hussey) نے دیا تھا۔ (١٣) وہ کہتا ہے کہ زینو فینز کا یہ نظریہ کہ کائنات پر ایک ہمہ گیر ولامحدود ذہن کی فرماں روائی ہے، سرکاری اولمپین دیوتاؤں کے نظریۂ کائنات سے براہ راست متصادم ہے۔ یہاں ایک ناقابل پیشگوئی اور اکثر مسلح رہنے والے دیوتاؤں کا گروہ مظاہر فطرت اور اپنی ''انسانی رعایا (١٤)'' پر اپنی مطلق العنان اور بے محابہ طاقت کو اُسی طرح آزماتا رہتا ہے جیسے قدیم دنیا کو بے شمار چھوٹے چھوٹے قبائلی سردار اور بادشاہ اپنی استبدادی قوت سے کچلتے رہے ہیں۔

لیکن ہم زمانہ قبل از تاریخ کے بارے میں جو کچھ اب جانتے ہیں، اس کی روشنی میں بہ آسانی کہہ سکتے ہیں کہ یہ دراصل یہی تسلط پر مبنی یا اینڈروکریٹک نظریۂ کائنات تھا جو'نیا اور انقلابی' تھا، نہ کہ بقول ایڈورڈ ہوسی کے یہ وہ نظریۂ کائنات تھا جو چھٹی صدی کے یونان کی سیاسی اور سماجی ترقی کی تہہ میں کارفرما تھا۔ (١٥)

یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ کوئی اتفاقی امر نہیں تھا کہ جونہی ڈورین یلغار کے بعد تہذیب

دوبارہ ابھرنے لگی تو ایک مربوط اور اعادہ پذیر نظام دنیا کو دوبارہ ظہور میں آجانا چاہیے تھا البتہ مختلف شکل میں آنا چاہیے تھا۔ نہ ہی یہ کوئی اتفاقی امر ہے کہ یہ وہیں ظہور پذیر ہوا جہاں یہ ہونا چاہئے تھا، ان شہروں میں جواس اناطولیہ کا حصہ تھے جہاں کبھی کٹل ہو یوک پھل پھول رہا تھا اور ان جزیروں میں ظہور پذیر ہوا جن کے قریب ہی کبھی منوآن کریٹ کی سنہری تہذیب فروغ پا رہی تھی جہاں اس کے مختلف روپ، بطور ماں، خادمہ اور جنم دینے والی عظیم دیوی کے اعلیٰ ترین حیثیت رکھتے تھے اور یہ صورت حال ڈورینوں کے قبضے تک برقرار رہی۔ (۱۶)

اس سے قبل ہم ذکر کر چکے ہیں کہ دیوی کی پرستش بیک وقت ایک مشرکانہ فعل بھی تھا اور موحدانہ بھی۔ یہ پرستش کئی شکلوں میں ہوتی تھی مگر ان مختلف الوہیتوں(deities) کے کچھ مشترکات بھی تھے۔ وَ خاص طور پر یہ کہ دیوی کو بطور ماں اور سب کی رازق کے ہر جگہ ساری فطرت اور زندگی کا منبع سمجھا جاتا تھا۔ (۱۷) چنانچہ اس لحاظ سے سقراط سے قبل کا منظّم اور مربوط عالمی نظام، دیوی کے پرانے تصورِ اعلیٰ ترین منعم اور مافوق الانسان ہستی کے قریب تر ہے۔ بہ نسبت اس نظریئے کے جس کی علامت بعد کے دور کی اولمپیئن عبادت گاہ تھی جہاں سے جھگڑالو، حاسد اور ناقابلِ پیشگوئی خداؤں کا ایک گروہ دنیا بھر میں حکمرانی کر رہا تھا۔

فیثا غورث کا تصورِ کائنات بطور ایک وسیع غنائی آہنگ (مختلف کرّوں کی ہم آہنگی) بھی قدیم مذہبی نظامِ کائنات کے قریب تر ہے، بہ نسبت لڑائی جھگڑوں کی آماجگاہ اولمپیئن عبادت گاہ کے۔ سقراط سے قبل کے نظام کائنات میں ہم دیوی کی بجائے اب زیادہ غیر شخصی قوتوں کو مصروفِ عمل پاتے ہیں جن میں کبھی کبھار ہمہ گیر اور ازراہِ قیاس مرد الوہیت کے حوالہ جات آتے ہیں۔ لیکن ان کی دنیا اب بھی پُر انتشار اور اٹکل پچو قسم کی کائنات سے بہت مختلف نظر آتی ہے جس کا تصوّر بعض ''اینڈروکریٹک''(androcratic) مفکرین نے قائم کیا ہے۔

قبل از سقراط زمانے کے تصور کائنات کی تہہ میں کارفرما اصولوں میں سے ایک اصول یہ ہے کہ عالمی نظام قابلِ مشاہدہ باقاعدگی کے ساتھ کام کر رہا ہے ''اہم تغیرات روزانہ اور سالانہ اپنی ''روشوں میں اپنا اعادہ کرتے ہیں'' (۱۸) یہ تصوّر حیرت انگیز طور پر ان قواعد کی یاد دلاتا ہے جنہیں ہم قدیم مذہب کہہ سکتے ہیں۔ اس میں فطرت کی گردشیں(cycles) اور

عورت کی گردشیں مکرّر الوقوع امور ہیں۔ ''تھیلز'' (Thales) جو بقول ارسطو ''فطری'' فلسفے کا علمبردار تھا اور ارسطو ہی کے قول کے مطابق وہ پانی کو تمام اشیاء کا منبع سمجھتا تھا۔ یہ نظریہ پھر حیرت انگیز طور پر ایک اور قدیم تصوّر کی یاددلاتا ہے کہ دیوی اور اس کے ساتھ کرۂ ارض اصل میں ابتدائی زمانے کے پانیوں میں سے نمودار ہوئے تھے۔ (۱۹)

اسی طرح تضادات کو متوازن بنانے کا جدلیاتی تصور (dialectical concept) جو تغیّر اور اثبات دونوں کا لازمی اصول ہے، اس کا اظہار زینو، انکسمندر اور ایمپیڈوکلیز چھٹی اور پانچویں صدی قبل از مسیح میں کر رہے تھے۔ (۲۰) اب جو کچھ دیکھا جاسکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے پیشگی آثار دیوی پوجا کے دور کی کائناتی نقش گری (cosmological imagery) میں ملتے ہیں۔

قبل از مسیح کے چوتھے ہزاریئے کے وسط سے یورپین ''کوکوٹینی کلچر'' کی منقش ظروف سازی میں جوڑوں (pairs) اور تضادات (opposites) کے مابین تناؤ بکثرت موضوعِ بحث بنتا چلا آرہا ہے۔ (۲۱) حرکیاتِ فطرت اور اس کی دوری بحالی بہ وساطتِ متقابلاتِ موت و پیدائش قدیم مذہبی داستانوں کے مرکزی موضوع ہوتے تھے۔ دیوی موت اور زندگی کی وحدت اور ثنویت، دونوں کو عملی شکل دیتی تھی۔ اسی طرح مادریّت اور کنوارپن کے متناقض اصول دیوی کی ذات کے اندر مدغم ہوجاتے تھے۔ (۲۲) تذکیر وتانیث بھی اکثر دیوی کی قدیم ذوجنسی (androgynous) شبیہات اور مقدس شادی کی متاخر رسومات میں مدغم تھیں۔ درحقیقت ساری انسانیت اور فطرت کی پیدائش اور موت قدیم مذہبی صنمیات میں دیوی کی تخلیقی اور تخریبی قوتوں کی خلقی وحدت کے ہمدوش مظاہر تھے۔ قدیم الوہیت کے اس ہمہ گیر تقلیبی کردار کو ایرک نیومن نے "goddess of opposites" (تضادات کی دیوی) کے فقرے میں سمودیا ہے۔ (۲۳)

چونکہ مصر، میسوپوٹیمیا اور مشرق وسطیٰ کی دیگر ثقافتوں کے ساتھ اس کی مماثلتیں تھیں، بعض سکالرز نے قبل از سقراط تصورات کو ان قدیم اور زیادہ ترقی یافتہ تصورات سے ''مستعار'' قرار دینے کی کوشش کی ہے جو اس وقت کے لحاظ سے پہلے ہی زیادہ تر تسلط پر مبنی اور مرد کی برتری پر یقین رکھنے والی تہذیبیں تھیں۔ ثقافتی نفوذ بلاشبہ قبل ازسقراط نظریۂ عالم کے ارتقا کا ایک جزو تھا لیکن اس سے سے زیادہ اہم عامل یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس میں مقامی

روایت اور قصہ کہانیوں کے اثرات کا دخل بھی تھا۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کچھ مقامی اثرات نے بھی مردانہ برتری کے نظام کی سختیوں کو بتدریج نرم کیا۔ مختلف یونانی شہری ریاستوں کے درمیان کسی قدر پُرامن تعلقات اور بیرونی حملوں سے تحفظ کی وجہ سے نہ صرف آرٹس اور ہنرمندیوں کو فروغ ملا بلکہ سخت گیر بادشاہوں اور سرداروں کی جگہ بھی ''چندسری'' (oligarchic) جمہوریتوں نے لے لی (یہ اگرچہ کہنے کو جمہوری تھیں مگر یہ اشرافیہ طبقے اور جائداد والے مردوں پر مشتمل تھیں)۔

ایڈورڈ ہوسی کہتا ہے کہ اس وقت یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی کہ یونانی فلسفیوں کے خیالات لوگوں کے ذہنوں پر اثرانداز ہوتے رہے بلکہ ان کی وجہ سے ''سیاسی مساوات'' کو بھی فروغ ملتا رہا۔ ساتھ ساتھ قانون کے اندر بھی قطعیت، غیرجانبداری اور یکسانیت کا عنصر شامل ہوتا چلا گیا (۲۴) فیثا غورث کا تصور ''ہندسی مساوات'' (۲۵) تصور کائنات اور بنی نوع انسان کے دونوں عناصر کے ساتھ نئے نظام میں مرد آہن کی حکمرانی پر یقیناً منطبق نہیں ہوتا۔ اگرچہ اصل حقیقت یہ ہے کہ فیثا غورث کے قضیے، چندسری نظاموں کے تابع ہیں جو افلاطون کے آخری دور کے تصورِ فلسفی بادشاہ کے خطوط پر وضع ہوئے ہیں۔ (۲۶)

اس سلسلے میں یہ بات یقیناً نمایاں حیثیت رکھتی ہے جو ہمیں ارستو کینس سے معلوم ہوئی ہے کہ فیثا غورث نے اپنی اخلاقی تعلیمات کا بیشتر حصہ ایک عورت تھیمستوکلیا (Themistoclea) سے پایا جو ڈلفی میں پادری کے منصب پر فائز تھی۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فیثا غورث نے یونانی فلسفے میں قدیم تصوف متعارف کرایا اور یہاں تک بھی کہا جاتا ہے کہ فیثا غورث آزادیٔ نسواں کا حامی تھا۔ (۲۷) ''آرفِس'' کے پُراسرار مذہب میں اصلاحات تجویز کرتے ہوئے بھی اس نے نسوانی اصول کی پرستش پر زور دیا تھا۔ (۲۸) اور ''دیوجانس'' (Diogenes) کہتا ہے کہ فیثا غورث کے سکول میں مردوں کے ساتھ عورتیں بھی پڑھا کرتی تھیں جیسا کہ وہ افلاطون کی اکیڈمی میں پڑھتی تھیں۔ (۲۹)

یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ کلاسیکی مؤرخ جین ہریسن کے مطابق افلاطونی فلسفے کا بیشتر حصہ فیثا غورث کے اثرات اور ''آرفک'' علامات پر مشتمل ہے جس میں

''اینڈروکریٹک'' نظام سے قبل کے زمانے کے مذہب اور اخلاقیات کے اجزا محفوظ تھے۔ (۳۰) افلاطون کے تصوراتِ ''ہم آہنگ کائنات'' جوانسانی تصوراتِ ''تاریک غار'' کے پیچھے پائے جاتے ہیں، وہ اسی روایت سے برآمد ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ اور افلاطون نے اپنی ''ری پبلک'' کی مثالی ریاست میں عورتوں کے لئے تعلیمی مساوات کی جو وکالت کی ہے وہ یقیناً ''مرد کی حکمرانی'' پر مبنی سوچ سے مطابقت نہیں رکھتی کیونکہ مردانہ حکمرانی میں سب کچھ چھوڑ کر صرف عورت کو کچلنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ (۳۱)

قدیم یونان

جب ہم پیچھے مڑ کر قدیم یونان پر نظر ڈالتے ہیں تو واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ اس شاندار تہذیب میں جتنی نفیس وعمدہ چیزیں تھیں ان میں سے پیشتر کا سراغ عہد ماضی میں مل سکتا ہے مثلاً آرٹ سے بے پناہ محبت، فطری طور طریقوں میں گہری دلچسپی، وافر ومتنوع مؤنث اور مذکر اساطیری رمزیات، مختصر اور محدود عرصے کے لئے نسبتاً زیادہ منصفانہ سیاسی نظم وضبط قائم کرنے کی کوشش بھی کی گئی جسے اہل یونان جمہوریت کہا کرتے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ اب اس امر کے اسباب تلاش کرنا بھی مشکل نہیں کہ اہلِ یونان ثقافتی طور پر کم ترقی یافتہ کیوں رہ گئے۔ یہ ایک حقیقت تھی کہ یونانی جمہوریت نے آبادی کے ایک کثیر حصے کو جو عورتوں اور غلاموں پر مشتمل تھا، اس عمل سے باہر رکھا، یہ اس مردانہ ہیئتِ حاکمہ کی کارستانی تھی جو اس سے قبل کے پُرامن اور منصفانہ نظام کے اوپر مسلّط کردی گئی تھی۔ اسی طرح یونانی حکمران طبقے کی جنگ وجدل میں دلچسپیاں تھیں انہوں نے شجاعت ومردانگی کے مظاہر کے مواقع پیدا کرنے کے لئے مسلح فتوحات کو اپنا نصب العین بنالیا اور اندرو باہر ایسے حالات پیدا کرتے رہے جن میں عورتوں کی حیثیت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچتا رہا۔

ہم ''ایتھنے'' میں کلاسیکی یونان میں مردانہ (اینڈروکریٹک) اور زنانہ (گائیلینک) عناصر مسلسل کے درمیان چپقلش اور عمل وردعمل واضح طور پر پاتے ہیں۔ قدیم شراکت پر مبنی ثقافتی ارتقا کے طور طریقوں کو دیکھا جائے تو عورت اب بھی دانش کی دیوی ہے جو اپنی قدیم علامت سانپ کے ساتھ سب کی رہنمائی کررہی ہے، مگر ساتھ ہی اس نئے نظامِ جبر کے طور طریقوں کو دیکھا جائے تو جنگ کی نئی دیوی ہے جو سر پر ہیلمٹ جمائے، وہ ایک ہاتھ میں نیزہ

لئے ہوئے ہے اور دوسرے ہاتھ میں جام کی بجائے ڈھال اٹھائے ہوئے ہے۔ ہم یہ دوعناصر افلاطون کی ''ری پبلک'' میں بھی پاتے ہیں جو ایک مظہرِ تناقضات ریاست ہے اس میں نظامِ مراتب اور انسانیت نواز منصفانہ نظام، دونوں پائے جاتے ہیں۔

افلاطون ایک طرف تین طبقاتی معاشرے کے قیام کی وکالت کرتا ہے جسے وہ طنزاً ''ایک شریفانہ جھوٹ'' قرار دیتے ہوئے کہتا ہے کہ حکمران طبقہ یا ''سرپرست'' طبقہ سونے سے بنا ہوا ہے، ''جنگجو طبقہ'' چاندی سے بنا ہے جبکہ ''باقی'' (کارکن اور کسان) گھٹیا دھاتوں سے بنے ہیں۔ دوسری جانب وہ کہتا ہے کہ سرپرست طبقے کو مساوات پسند ہونا چاہیے یعنی نظام سادگی اور اشتراکِ عمل پر مبنی ہونا چاہیے اور سرپرستوں کے اختیارات انصاف کے اصولوں کے مطابق استعمال ہونے چاہئیں۔ یہ بات ان اصولوں پر منطبق ہوتی ہے جن کی علامت جام(Chalice) ہے، نہ کہ خنجر(Blade)۔اور اگرچہ افلاطون کو کسی لحاظ سے بھی حامئ نسواں(a feminist) قرار نہیں دیا جاسکتا مگر وہ ایتھنز کے رسم ورواج کے بالکل برعکس اپنی ''ری پبلک'' میں اس امر کی وکالت کرتا ہے کہ حکمران طبقے کی عورتوں کو وہی تعلیم ملنی چاہیے جو مردوں کو ملتی ہے۔

یونانی آرٹ میں ہمیں جو چیز سب سے زیادہ نمایاں دکھائی دیتی ہے وہ نسوانیت اور مردانہ پن (یعنیgylanyاورandrocracy) کی دوش بدوشی ہے۔ زندگی اور فطرت کے لئے قدیم محبت کا اظہار عورت اور مرد دونوں کے جسموں کو حسین ترین طریقے وتناسب سے کیا گیا ہے۔لیکن جنگ وجدل کو بھی بکثرت موضوع بنایا گیا ہے۔

ہمیں یونانی مذہب میں دو متصادم ثقافتوں کے کافی شواہد ملتے ہیں۔ اس مذہب میں ان قدیم اقدار کی بدستور موجودگی (جن کا اظہار عورتوں اور نسوانی علامات سے ہوتا ہے) اس کی تصدیق اس امر سے ہوتی ہے کہ عورت اولمپین یادگاروں میں موجود ہے اور سب سے بڑھ کر ثبوت یہ ہے کہ خانقاہوں میں اب تک دیوی کی پرستش کی جاتی ہے ۔سرکاری طور پر تو زیئس الوہیت کا سب سے بڑا مظہر ہے لیکن دیویاں اب تک طاقتور ہیں اور بعض اوقات دیوتاؤں سے کہیں زیادہ قوی دکھائی دیتی ہیں۔ ہم یہی ثقافتی جڑیں واضح طور پر عظیم ''ایلیوشیائی اسراروں''(Eleusian Mysteries) میں پاتے ہیں۔ جس کی تقریبات ہر سال ایتھنز سے چند میل دور ''ایلوسیئس'' کے مقام پر بنائی جاتی ہیں۔ یہاں عظیم دیوی اب بھی

اپنی ہمزادوں ''ڈیمیٹر'' اور ''کور'' کی شکلوں میں مذہبی مبتدیوں کے سامنے اعلیٰ ترین متصوفانہ صداقتوں کا اظہار کرتی ہے۔ انہیں ہم آج بھی ''تھبیز'' کے ایک مرتبان کی پینٹنگز اور ''بوئیشیا'' کی سونے کی ایک مہر میں محفوظ پاتے ہیں۔ اور دیکھ سکتے ہیں کہ ان تقریبات میں کس طرح قدیم ''نسوانی ظرف''، ''جام'' یا بپتسمے میں استعمال ہونے والا مقدس برتن مرکزی شبیہہ ہوتا تھا۔ (۳۲)

ہم ایتھنین عورتوں کی مظہر تناقضات صورتِ حال میں یونانی معاشرے کے gylanic اور androcratic عناصر بھی پاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال بہت سی قانونی اور معاشرتی پابندیوں کے باوجود کم از کم بعض عورتوں کے لئے مشرق وسطیٰ کی مذہبی ریاستوں میں عورتوں کی حالتِ زار کے مقابلے میں بہت بہتر تھی۔ ہوسکتا ہے کہ وہ کس قدر کم کچلی جاتی ہوں کیونکہ کچھ ایسے اشارات ملتے ہیں کہ ایتھنز میں ''تحریک نسواں'' جیسی کوئی چیز ضرور موجود تھی۔

یہ درست ہے کہ غلاموں اور لونڈیوں کی طرح تمام عورتوں کو ایتھنز کی بلند پایہ جمہوریت سے خارج قرار دے دیا گیا تھا۔ آگسٹائن نے اپنی کہانی میں کیا خوب کہا ہے کہ عورتیں حق رائے دہی سے اسی وقت محروم ہوئیں جب شجرۂ مادری سے شجرۂ پدری کی طرف منتقلی عمل میں آئی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ''اینڈروکریسی'' کا تسلط صحیح جمہوریت کے خاتمے کا اعلان تھا۔ (۳۳) علاوہ ازیں کلاسیکی وقتوں میں بالائی طبقے کی بیشتر عورتوں کو ''گائینیکیم'' کے غیر صحت مند اور متعفن کوارٹروں میں محبوس رہنا پڑتا تھا لیکن اس امر کی شہادت بھی ہے کہ اسی ایتھنز میں بعض عورتوں نے ذہنی کاموں اور پبلک لائف میں اہم کردار ادا کئے تھے۔ (۳۴) (جبکہ ثقافتی تاریخ دان جیکو بیٹا ہاکیز لکھتی ہے کہ بعض یونانی شہری ریاستوں میں عورتوں کے حالاتِ زندگی بہت ہی خراب تھے) جن عورتوں کو اہم کردار ادا کرنے کے مواقع ملے ان میں ''ایسپیا'' (Aspasia) بھی تھی جو یونان کے نامور سیاستدان اور جرنیل پیریکلز کی ساتھی رہ چکی تھی، اس نے ایک سکالر اور ایک سیاستدان دونوں حیثیتوں سے کام کیا تھا اور تعلیم عامہ کے ساتھ ساتھ خواتینِ خانہ میں تعلیم پھیلانے میں بھی اسے بہت شہرت ملی۔ ان دونوں نے تعلیم اور شہری شعور کے فروغ میں بے مثل کام کیا تھا جس کی بنا پر اس زمانے کو ہیوک کلچر کے مورخین ''پیریکلز گولڈن ایج'' کہتے تھے۔ (۳۵)

اگر چہ قدیم ایتھینین تعلیم عامہ مردوں تک ہی محدود تھی، جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں ایسی عورتیں بھی موجود تھیں جو افلاطون کی اکیڈمی میں تعلیم پا رہی تھیں۔ یہ اس امر کا واضح ثبوت ہے کہ یونانی ثقافت میں شراکت دارانہ اور ''گائیلینک'' معاشرت کا عنصر کافی حد تک پایا جاتا تھا۔ اس کا موازنہ زمانۂ حال سے کیجئے کہ امریکہ میں ۱۹ویں صدی اور بیسویں صدی کے اوائل تک عورتوں کے لئے اعلیٰ تعلیم کے دروازے کھل نہیں سکے تھے۔

یہ بات بھی ایک انکشاف ہی ہوگی کہ یونانی تاریخ کے مختلف ادوار کی عورتوں کی متعدد تصانیف اس وقت تک کے ''لامذہبوں'' (pagans) کی لائبریریوں میں موجود تھیں۔ انہیں دورِ مابعد کے انتہا پسند عیسائیوں اور مسلمانوں نے تباہ کر دیا تھا۔ مثال کے طور پر ایک یونانی عورت جس کے بارے میں کہا جاتا تھا کہ وہ ایک فیثا غورثی سکول کی تعلیم یافتہ فلاسفر ''اریگنوٹ'' تھی اس نے "Sacred Discourses" نامی کتاب کی تدوین کی تھی وہ "Rites of Dionysus" اور دیگر کتابوں کی مصنفہ بھی تھی۔ (۳۶) یہ قیاس بھی کیا گیا ہے کہ Odyssey شاید ایک عورت نے لکھی تھی۔ اس امر کی شہادت بھی ملتی ہے کہ عورتوں نے فلسفے کی تعلیم کے ذاتی ادارے کھول رکھے تھے، جو انہی کی سربراہی میں چل رہے تھے۔ ان میں سے ایک سکول Arete of cyrene تھا، جس میں زیادہ تر نیچرل سائنس اور اخلاقیات کے مضامین پڑھائے جاتے تھے۔ اس کا مقصدِ قیام ایک ایسی ''دنیا وجود میں لانا تھا جس میں نہ کوئی آقا ہو اور نہ کوئی غلام'' (۳۷) ''آرگوس'' کی ''ٹیلی سلا'' (Telesila) کو سیاسی نظموں اور مناجات کی وجہ سے خاصی شہرت حاصل تھی۔ مؤرخ خاتون ایلس بولڈنگ (Elise Boulding) کے مطابق غنائیہ پنڈار (Pindar) کی ٹیچر ''کورینا آف بوئیشیا'' (Corinna of Boetia) نے ''شعروشاعری کے ایک مقابلے میں پانچ دفعہ سبقت حاصل کی تھی''۔ جبکہ ''ایرینا'' (Erinna) کو قدیم اہلِ علم ''ہومر'' کی مدِّ مقابل قرار دیتے تھے۔

یونانی شاعرہ ''سفو'' (Sappha or sappho) آف لیبوس جو عورتوں کے لئے ایک ادارہ بھی چلا رہی تھی بڑی خوبصورت شاعری کرتی تھی، اس کے کلام میں عام یونانی شاعری (جس میں جنگ وجدل کا بہت ذکر ہوتا تھا) کے برعکس محبت کا بھرپور پرچار تھا۔ وہ کہتی ہے ''کچھ کہتے ہیں گھڑ سوار اچھے ہیں کچھ دعویٰ کرتے ہیں، پیادہ فوج یا لمبے چپوؤں والا بیڑہ، اس کالی زمین پر اچھا منظر پیش کرتا ہے، میں کہتی ہوں کہ وہ اچھا ہے جس سے تم محبت

کرتے ہو'' (۳۸)

بعض یونانی عورتوں کے نزدیک ''داشتہ'' یا ''رکھیل'' کا پیشہ، بیوی کے کردار سے زیادہ خودمختارانہ اور نسبتاً زیادہ باعزت متبادل تھا۔ اگرچہ داشتہ یا رکھیل(hetaerae) کو غلط طور پر طوائف کے مساوی قرار دے دیا گیا ہے، قدیم یونانیوں کا یہ نقطۂ نظر نہیں تھا۔ وہ سترھویں اور اٹھارھویں صدی کے یورپ کی"courtesans" ڈیرے دار بیسوا یا بادشاہوں اور جاگیرداروں کی رکھیل کے قریب کے مفہوم میں منظور نظر عورتیں ہوتی تھیں، جنہیں کافی سیاسی اقتدار بھی حاصل ہوتا تھا۔ وہ جتنی زیادہ بادشاہ یا جاگیردار کے قریب ہوتی تھی، اسی تناسب سے مقتدر ہوتی تھیں، اس لئے ان سے قربت بڑھانے کے لئے انہیں اچھی میزبان، دلپذیر شخصیت اور دلوں میں اترنے کی صلاحیت کی مالک بننا پڑتا تھا۔ کچھ تعلیم اور کچھ ثقافتی ذوق مطلوبہ خوبی سمجھا جاتا تھا۔ سب سے زیادہ دلچسپ بات ان ''ہیٹرے'' کے ریکاڈز ہیں جو سکالرز اور حتیٰ کہ ممتاز عوامی شخصیات بن گئی تھیں۔ ایلس بولڈنگ لکھتی ہے '' آیونیا اور ایٹولیا کی شہری ریاستوں کی ہیٹرے بے حد ذہن و فطین مانی جاتی تھیں۔ افلاطوں کی بہترین شاگرد ڈیشیا آف منٹوا اور ایکشوتھیا تھیں'' (۳۹) ایسپشیا جس نے ایتھینین ثقافت کے فروغ میں کافی کردار ادا کیا تھا، اس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ وہ ''ہیٹرا'' تھی۔

قدیم یونان میں جس بات کی شاید نمایاں ترین گواہی ملتی ہے وہ ایک تحریک کی نشاندہی ہے جو ایک ایسے سماجی نظم کی طرف واپسی ہے جس میں انسانیت کے دونصف حصوں میں کوئی درجہ بندی نہ ہو، یہ تحریک آزادئ نسواں قسم کی کوئی تحریک تھی۔ اس کا پتہ طنز اور تلخی بھرے کلام کے مجموعے سے ملتا ہے۔ جس میں اریسٹوفینز اور کریٹینس جیسے لوگوں نے نہایت ناپسندیدہ طریقے عورتوں سے اپنی نفرت کا اظہار کیا ہے۔ اور تمسخر اڑاتے ہوئے لکھا ہے ''یہ مردوں کے منہ آنے کی کوشش کر رہی ہیں'' (۴۰) اس امر کا قوی امکان ہے کہ یہ عورتیں جو مذہبی تقریبات کے لئے باقاعدگی سے اور بکثرت اکٹھی ہوتیں دیوی کی پرستش کرتیں ان میں اپنے منفی تشخص کا گہرا احساس پایا جاتا تھا۔ اس طرح عین کلاسیکی دور میں بہت سی یونانی عورتیں طاقت و اقتدار سے بہرہ مند تھیں جبکہ بیشتر مغربی ثقافتی کی عورتوں کو یہ کچھ حاصل نہیں تھا اور ان میں بالآخر عورتوں کو پیچھے دھکیل دیا گیا یا مکمل طور پر حذف کر دیا گیا تھا۔

MashalBooks.org

قدیم مصر میں جنگ سے دور رہنے کے جذبات کے اظہار میں بھی عورتیں ہمیشہ سرگرم رہیں۔ وہاں امن کے حق میں اسی طرح تحریکیں چلتی رہیں جیسی ہمارے اپنے دور میں چل رہی ہیں۔ اس کا اظہار یونانی ڈراموں سے ہوتا ہے جن میں سے ایک ارسطو کا مشہور ڈرامہ ''لائسسٹراٹا'' (Lysistrata) تھا۔ اس میں عورتوں کو مردوں کو یہ دھمکی دیتے ہوئے دکھایا گیا ہے کہ جب تک مرد جنگیں بند نہیں کریں گے ہم ان سے ہمبستر نہیں ہوں گی۔ اس موضوع کو ایک بہت مشہور مزاحیہ ڈراما نویس نے اپنے سارے کھیل میں پھیلایا ہوا ہے۔ اس سے ایک طرف اس تحریک کی قوت کا اندازہ ہوتا ہے اور دوسری جانب ایک حکمت عملی کا پتہ چلتا ہے جس کے اثرات ہمارے آج کے مردانہ معاشرے میں اب تک محسوس ہوتے ہیں۔ مرد اپنی مخصوص ذہنیت کے تحت عورت کو تمسخر کا نشانہ بنا کر اپنے کنٹرول میں رکھتے ہیں اور ان کی اہمیت کو کم کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔

عورتوں کی ناقدری مردوں کے معمولات کا ہمیشہ حصہ رہی ہے، یہ روّیہ یونان کی بیشتر تاریخوں کی خصوصیت رہا ہے۔ تمام علاقوں اور تمام خطوں کی تاریخوں کی طرح ہماری تاریخ میں عورت سے متلازم ہر چیز کو ثانوی بلکہ ناقابلِ اعتنا سمجھا جاتا ہے۔ چنانچہ روایتی مؤرخ انصاف، مساوات اور رحمدلی پر مبنی معاشرے کے لئے کام کرنے والی خواتین کی سر گرمیوں کو مسلسل نظرانداز کرتے آرہے ہیں۔ لیکن جوں جوں گمشدہ تاریخ پر ان لوگوں کے ڈالے ہوئے پردے ہٹ رہے ہیں پتہ چل رہا ہے کہ عورتوں کی سرگرمیاں بے حد اہم رہی ہیں کیونکہ اس سے آگے ہم جو تفصیلات سامنے لائیں گے ان سے معلوم ہوجائے گا کہ یونان اور دیگر ممالک کی عورتوں کو اس سے آدھا بھی موقع دیا گیا ہوتا تو وہ ''نسوانی'' اقدار مثلاً امن اور اختراعی صلاحیتوں کی نشو ونما کو سماجی ترجیحات بنا کر دم لیتیں۔

مؤرخین کے ذخیرۂ الفاظ میں صنفی خصوصیت سے متعلقہ اصطلاحات gylany اور androcracy کی عدم موجودگی کی طرح ماضی کی روئداد میں سے عورتوں کو باضابطہ طور پر حذف یا نظرانداز کرنے سے اس نظام کو برقرار رکھنے میں مدد ملی ہے جو مرد وعورت کی درجہ بندی پر استوار ہے۔ اس سے مرد کے تسلّط کے مرکزی ستون: ''عورتیں اتنی اہم نہیں جتنے مرد ہیں'' کو مزید تقویت پہنچی ہے۔ ''عورتوں کے مسائل'' کو ہمارے سماجی اور نظریاتی نظم میں مرکزی مقام نہ دے کر ان سماجی متبادلوں کو بھی بری طرح نظروں سے اوجھل کر دیا گیا

ہے جو gylany اور androcracy نے تجویز کئے تھے۔

تاہم اگر ہم تاریخ پر صنفی تناظر میں نظر ڈالیں تو ہمیں نسوانی اور مردانہ نظاموں کے درمیان چپقلش اس زمین پر رہنے کے دوطریقوں کی صورت میں دکھائی دینا شروع ہوجائے گی پھر بعض یونانی عورتوں کی مشرق وسطیٰ میں رہنے والی عورتوں کی بہ نسبت زیادہ آزادی کو اہم سماجی اشارے کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ اس ''بطور مثال'' یونان میں استقلال اور حیاتِ نو کے سبب اور نتیجہ دونوں کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔ جہاں سیاسی قوت کا انسانی رویہ رائج تھا اور سیاست کو ایک ذمہ داری، نہ کہ ذریعۂ کنٹرول سمجھا جاتا تھا، جو کہ مردانہ تسلط سے قبل کے زمانے کی خصوصیت تھی۔

سماجی انصاف کے حوالے سے ہمارے بہت سے نظریات (مثلاً آزادی اور جمہوریت) یونان کے فلسفیوں سقراط اور فیثا غورث سے ماخوذ ہیں۔ یہ نتیجہ کہ ایسے تصورات قدیم ''گائیلینیک'' جڑوں سے پھوٹے تھے، اس امر واقعہ سے تقویت پاتا ہے کہ ان دونوں فلسفیوں نے عورتوں کے سامنے زانوئے تلمذ تہہ کئے تھے۔ اور یہ بھی ایک انکشاف ہے کہ ''تھیمسٹو کلیا'' (Themistoclea) جو فیثا غورث کو پڑھاتی تھی اور ''ڈایوٹیما'' (Diotema) جو سقراط کو پڑھاتی تھی، دونوں پادری تھیں یعنی قدیم مذہبی اور اخلاقی روایاتِ کی مخزن اور مُرسل تھیں۔

لیکن در آنحالیکہ ہم قدیم یونان میں "gylanic" کی حیاتِ نو کی بہت سی نشانیاں پاتے ہیں تو اس ارتقائی دباؤ کے خلاف ایک خوفناک "andocratic" مزاحمت بھی دیکھ سکتے ہیں۔ سرکاری یونانی مذہب کلیدی طور پر ایک متسلط مذہب تھا: زیئس اپنی برتری قائم کرنے اور اسے برقرار رکھنے کے لئے ظلم اور بربریت سے کام لیتا ہے جس میں متعدد دیویوں اور عام عورتوں سے زنا بالجبر بھی شامل ہے۔ ہم پہلے بھی دیکھ چکے ہیں کہ کلاسیکل زمانے کے ''اوریسٹیا'' جیسے عظیم مروّجہ ڈرامے کا مقصد مردانہ غلبے وتسلّط کے "androcratic" نظاموں کو تقویت دینا تھا، اس سے حکمران اشرافیہ کی پالیسی کی عکاسی ہوتی تھی۔ یہ لوگ خواہ کتنے ہی ''مہذب'' ہوجاتے انہیں اگر اپنی غالب حیثیت کو برقرار رکھنا ہوتا تو وہ مرد کے غلبے کی تین بنیادی خصائص میں اساسی ردّوبدل کرنا سوچ بھی نہیں سکتے تھے۔ یہ تھیں: مرد کی برتری وتسلّط، مطلق العنانیت اور اداراتی سماجی تشدد جو کہ androcratic نظاموں کے اہم ترین

خدّ وخال ہوتے ہیں۔

صحیح وغلط کے جابرانہ معیارات

قدیم یونان پر حکمرانی کرنے والے، انسان دوستی کی ہمت افزائی کر سکتے تھے اور کبھی کبھی اسے سراہتے بھی تھے، لیکن ایک خاص حد تک اور اس سے آگے ایک قدم بھی نہیں بڑھتے تھے۔ اس سلسلے میں کلاسیکی یونان کے انوکھے اور انتہائی تکلیف دہ واقعات میں سے ایک واقعہ ایک بظاہر بے ضرر بوڑھے سقراط کو سزا موت دینا تھا۔ اس سے بہت کچھ آشکار ہوتا ہے۔ وہ کونسے ''انقلابی'' تصورات تھے جنہیں قبول کرنے والے نوجوان ''کرپٹ'' کہلائے اور ان کو پھیلانے پر سقراط جیسے عظیم فلاسفر کو موت کی گھاٹ اتار دیا گیا؟ یہ وہ تصورات تھے جو gylanic گمراہیوں یا بدعتوں میں شامل عورتوں کے لئے مساوی تعلیم اور انصاف کا وہ نقطۂ نظر تھا جو اس endocratic اصول پر ضرب لگاتا تھا کہ ''طاقتور کی بات ہی حق ہوتی ہے''۔

طاقت پر مبنی مراتب کے نظام کو سقراط کی طرف سے دیئے گئے چیلنج کا اظہار افلاطون کی تصنیف "Republic" میں موجود ہے۔ اس میں ہم عورتوں کے لئے مساوی تعلیم کے جونظریات پاتے ہیں وہ اٹھارویں صدی کے قیاساً روشن خیال فلسفی ژین ژاک روسو کے نزدیک بھی خوفناک تھے۔ مغربی فلسفے کی اس کلاسک میں ہم سقراط کا ایک سوفسٹ فلسفی ''گلوکن'' (Glaucon) کے ساتھ ایک مکالمہ بھی پاتے ہیں۔ مؤخرالذکر نے جو موقف بیان کیا اور سقراط نے اس پر جو سوال کیا، اس کا حاصل بحث یہ نکلا کہ حکمران طبقے کے لئے انصاف اور قانون محض مصلحت (expedience) کا معاملہ ہوتے ہیں۔

سوفسطائیوں پر بھی بعض اوقات مروجہ اخلاقیات کی جڑیں کھودنے کا الزام لگتا تھا کیونکہ وہ یونانی دیوتاؤں کو علی الاعلان مسترد کرتے تھے۔ لیکن اس مکالمے میں افلاطون یہ ظاہر کرتا ہے کہ ان کی فلسفیانہ تعلیمات دراصل ان کے دور کی مروّجہ اخلاقیات تھیں جن کا وہ کسی لیپا پوتی کے بغیر اظہار کر رہے تھے۔ [۴۱]

سوفسطائیوں کا عالمی نقطۂ نظر جسے وہ کسی لگی لپٹی کے بغیر بیان کرتے تھے، وہی تھا جو یونان کے حکمرانوں کا تھا اور آج کی دنیا کے حکمران بھی وہی نظریہ رکھتے ہیں۔ جس طرح اس وقت سوفسط اپنے اخلاق کے زبانی اظہارات سے پیچھے ہٹ کر مردانہ تسلّط بھری زندگی

MashalBooks.org

میں سیاسی اور سماجی حقیقتوں کی روشنی میں عمل کرتے تھے، اسی طرح آج کے مرد بھی ثابت کررہے ہیں کہ وہ اپنی قوتِ بازو کی بنا پر حق پر ہیں۔

''ری پبلک'' میں گلوکن سقراط کو بتاتا ہے کہ قانون کمزوروں کی ایجاد ہے جو اپنی چالاکی کی بنا پر اسے اپنے مفاد میں سمجھتے ہیں کہ وہ اس کے ذریعے طاقتور کو اس کی حدود میں رکھ سکتے ہیں۔ جہاں تک انصاف کا تعلق ہے یہ سب سے بہترین اور سب سے بدترین کے درمیان ایک سمجھوتہ ہوتا ہے۔ یعنی برائی کرکے اس کے انجام سے بچ جانے اور زیادتی کا شکار بننے کے بعد انتقام نہ لے سکنے کے درمیان ایک سمجھوتہ ہے۔ (۴۲)

یہ حیرت انگیز انکشاف ہے کہ معاملاتِ دنیا (اور انصاف) کے بارے میں یہی نقطۂ نظر نامور یونانی مؤرخ جرنیل تھوسیڈائیڈز (Thucydides) کا تھا جس نے ''پیلوپونیسین وار'' (۴۳۱ تا ۴۰۳ ق م) کی تاریخ قلمبند کی تھی۔ ایتھنز کے ایلچیوں اور ایک چھوٹی شہری ریاست ''میلوس'' کے نمائندوں کے درمیان مذاکرات کی روئداد بیان کرتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ اہل ایتھنز اس ریاست کو اپنے اندر مدغم کرنا چاہتے تھے۔ مذاکرات کے دوران ایتھنز کے ایلچی دوسرے فریق کو کہتے ہیں کہ وہ صحیح یا غلط میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے، ان کی دلچسپی صرف اس چیز میں ہے جو قرینِ مصلحت (expedient) ہے۔ کیونکہ ''انصاف کا سوال ان پارٹیوں کے درمیان پیدا ہوتا ہے جو طاقت میں برابر ہوں، طاقتور وہ کرتے ہیں جو وہ کرسکتے ہیں اور کمزور اذیّت اٹھاتے ہیں جو انہیں لازماً اٹھانی چاہیئے'' (۴۳)

مصلحت کی اس اخلاقیات کی عمارت (جیسا کہ جان مینسلے رابنسن فلسفۂ یونان کا تجزیہ کرتے ہوئے کہتا ہے) جزواً اس قضیے پر قائم ہے کہ بنی نوع انسان ''ظالم غاصب اور خود غرض جانور'' ہیں۔ (۴۴) یہ اپنی باری پر ایک اور قضیئے پر مبنی ہے اور وہ یہ کہ جو انسانی درجے قوت پر استوار ہوں وہ ''فطری'' ہوتے ہیں، لہٰذا وہ برحق ہوتے ہیں۔ اس نظریئے کے مطابق، جیسا کہ ارسطو نے اپنی "Politics" میں لکھا ہے، فطرتِ عالم میں کچھ عناصر حکمرانی کے لئے اور کچھ محکوم بننے کے لئے رکھے گئے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر جس ''اصول'' کو سماجی نظم پر حکمرانی کرنی چاہیے وہ اس کا ''رتبہ'' ہے، نہ کہ اس کا ''ربط'' (ranking rather than linking) اور جیسا کہ ارسطو نے صراحت کے ساتھ بتایا کہ اینڈروکریٹک فلسفے اور زندگی کی اصل بنیادیں یہ ہیں کہ جس طرح غلاموں کا فطری طور پر مصرف یہ ہے کہ وہ آزاد مردوں

کے محکوم رہیں، اسی طرح عورتوں کو بھی مردوں کی حکمرانی میں رہنا چاہیے، یہی ''فطری'' نظام ہے۔ (۴۵)

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ یہی فلسفیانہ قضیئے (premises) اس عظیم روایت کا جزو لاینفک ہیں جس نے مغربی تہذیب کی تشکیل کی ہے، یعنی ہمارے یہودی اور عیسائی ورثے کی بنیاد بنی ہے۔ یہاں ان کا اظہار ان مسیحی تصورات میں ''اصلی گناہ'' اور ایک مذہبی اساطیری روایت ہے جس میں مرد کے اوپر خدا کا رتبہ اور عورت کے اوپر مرد کا رتبہ ہے جبکہ بچوں اور فطرت کو الوہی مقدر کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ (۴۶)

اگر ہم تاریخِ عیسائیت کا مطالعہ کریں تو معلوم ہوگا کہ درجہ بندی "hierachy" کے تصور کے لئے روایتی لفظ اصل میں چرچ کی حکومت کے حوالے سے آتا ہے یہ یونانی لفظ hieros (مقدس) اور arkhia (حکمرانی) سے ماخوذ ہے۔ یہ اس درجہ بندی یا اقتدار کی سطحوں کے لئے استعمال ہوتا ہے جن میں براجماں مرد جو کلیسا کے سربراہ تھے، پادریوں اور مسیحی یورپ کے عوام پر اپنا حکم چلاتے تھے۔ (۴۷)

لیکن ہمارے یہودی اور عیسائی ورثے کا ایک اور اس سے بہت مختلف پہلو بھی ہے جو ہماری واحد اور ہمیشہ کی آس کی بنیاد رہا ہے کہ ہوسکتا ہے کہ انسانیت کا روحانی ارتقا ایک دن اس نظام کا شکنجہ توڑ کر آزاد ہوجائے جس نے ہمیں وحشت و بربریت کی دلدل میں پھنسائے رکھا ہے۔ یہ پہلو جس کا جائزہ اگلے باب میں لیا جائے گا وہ ہے جو شاید دو ہزار برس پہلے مغربی طور طریقوں میں ممکنہ طور پر ایک دوسری یا ''حامئ نسواں'' (gylanic) تقلیب لے آتا۔

باب 9

تاریخ کا دوسرا نصف: حصہ دوم

تقریباً دوہزار سال پہلے جھیل گلیلی کے ساحلوں پر سے ایک شریف النفس اور رحمدل نوجوان یہودی نے جس کا نام یُسوع (Jesus) تھا، اپنے زمانے کے حکمران طبقے کی اعلانیہ مذمت کرنا شروع کردی، وہ دولتمندوں اور طاقتوروں کو ہی نہیں بلکہ مذہبی حکام کو بھی ملامت کیا کرتا تھا جو فلسطین کے عوام کا استحصال کرتے اور انہیں جبر وظلم کا نشانہ بناتے تھے۔ وہ عالمگیر محبت کی تبلیغ کرتا اور یہ درس دیتا تھا کہ یہ عاجز ومسکین اور کمزور لوگ ایک دن اس زمین کے وارث بن جائیں گے۔ علاوہ ازیں وہ اپنے الفاظ اور اعمال کے ذریعے اس ماتحتی اور الگ تھلگ زندگی سے بھی اکثر اظہارِ نفرت کرتا تھا جو اس کی تہذیب نے عورتوں کے لئے مخصوص کردی تھی۔ وہ عورتوں سے آزادانہ میل جول رکھتا اور ان کے حالات و کوائف سے آگاہ رہتا جو بذات خود اس زمانے کے حساب سے ایک قسم کی بدعت وزندقہ تھا۔ یسوع سب کے لئے مساوی روحانیت کا دعویٰ کرتا تھا۔

یہ کوئی حیرت کی بات نہیں تھی، بائیبل کے مطابق اس زمانے کے اہل اقتدار یسوع کو ایک خطرناک انقلابی قرار دیتے جس کے انقلابی خیالات کو ہر قیمت پر خاموش کرانا ضروری تھا۔ یہ ایک ''اینڈروکریٹک'' نظام کے پس منظر میں کتنے صحیح انقلابی خیالات تھے جس میں مردوں کو عورتوں کے اوپر مرتبہ دے کر تمام انسانی درجہ بندیوں کے لیے ایک نمونہ بنادیا گیا تھا۔ ان خیالات کو نہایت جامع اور مختصر انداز میں گلتیون ۳:۲۸ میں یوں بیان کیا گیا

ہے: ''نہ کوئی یہودی رہا نہ یونانی نہ کوئی غلام نہ آزاد، نہ کوئی مرد نہ عورت کیونکہ تم سب مسیح یسوع میں ایک ہو۔''

بعض مسیحی علما، مثلاً لیونارڈ سوِیڈلر کا وَاصرار ہے کہ یسوع ایک حامیٔ حقوقِ نسواں تھا کیونکہ سرکاری یا ''مقدس'' متون سے بھی یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اس نے اپنے دور میں عورتوں کو سختی سے الگ تھلگ رہنے پر مجبور کرنے اور انہیں دست نگر بنا کر رکھنے کے طور طریقوں کو مسترد کر دیا تھا۔ (۱) لیکن تحریکِ آزادیٔ نسواں(feminism) کا بنیادی مقصد عورتوں کو آزادیاں دلانا ہے چنانچہ یسوع کو عورتوں کی آزادی کا حامی کہنا تاریخی طور پر صحیح نہیں ہوگا۔ اس لئے یہ کہا جائے تو زیادہ درست ہوگا کہ یسوع کی تعلیمات انسانی تعلقات کاgylanic نظریہ پیش کرتی ہیں۔

یہ نظریہ نیا نہیں تھا بلکہ جیسا کہ ہماری تحقیق ہے یہ عہد نامۂ عتیق کے ان اجزا میں شامل ہے جو شراکت پر مبنی معاشرے پر منطبق ہوتے ہیں۔ مگر صاف ظاہر ہے کہ یہ گلیلی کے نوجوان ترکھان (نجّار) نے نہایت زور دار طریقے سے پیش کئے تھے (جو اس دور کی مذہبی اشرفیہ کے نزدیک کفریہ کلمات تھے) اگرچہ عورتوں کی آزادی اس کا مرکزی فوکس نہیں تھی۔ ہم اس کی تبلیغ کو نظریۂ ثقافتی تقلیب کے نئے تناظر میں دیکھیں تو یہ ایک چونکا دینے اور یکسانیت پیدا کرنے والا موضوع تھا: ''ساری انسانیت کی آزادی بذریعہ استبدالِ اقدار''

(replacement of androcratic with gylanic values)

یسوع اور خواتین

عہد نامۂ جدید میں ان شاگردوں کی طرف منسوب تحریریں جنہوں نے ظاہری (نہ کہ لازماً حقیقی) طور پر یسوع سے ملاقاتیں کی تھیں اناجیل متیٰ، مرقس، لوقا اور یوحنا عموماً ''حقیقی'' یسوع کا بہترین منبع سمجھی جاتی ہیں۔ اگرچہ وہ بھی اس کی وفات کے سال ہا سال بعد لکھی گئیں اور بلاشبہ انہیں بارہا عملِ ادارت میں سے گزارا گیا، غالبًا وہ پھر بھی دیگر اجزاء مثلاً ''رسولوں کے اعمال'' (Acts) یا ''کرنتھیوں''(Corinthians) کی بہ نسبت یسوع کی شخصیت کی زیادہ عکاسی کرتی ہیں۔

یہاں ہمیں تسلط پر مبنی نظریئے کا بنیادی پتھر، مرد کی برتری اور عورت کی کمتری ماڈل،

MashalBooks.org

ماسوائے چند مستثنیات کے، اپنی عدم موجودگی کے باعث نمایاں ہوا ہے۔ یسوع کا پیغام جوان تحریروں میں بھرپور طریقے سے رچابسا ہے، روحانی مساوات کا پیغام ہے۔

اس سے بھی زیادہ نمایاں یسوع کی وہ تعلیمات ہیں جن میں کہا گیا ہے کہ ہمیں ''نسوانی خصائص'' کو ثانوی درجہ سے اٹھا کر اوّلیت یا مرکزیت کے مقام پر لانا چاہیے۔ ہمیں متشدد نہیں ہونا چاہیے۔ تھپڑ لگے تو دوسرا گال بھی پیش کردینا چاہیے: دوسروں سے وہ سلوک کرنا چاہیے جو انسان اپنے ساتھ کیا جانا پسند کرتا ہو: ہمیں ہمسایہ سے محبت کرنی چاہیے اور حتیٰ کہ دشمن سے بھی حسنِ سلوک سے پیش آنا چاہیے۔ ''مردانہ خصوصیاتِ'' سخت جانی و متشدد مزاجی، جارحیت اور غلبہ پسندی کی بجائے باہمی ذمہ داری، رحمدلی، ترس اور محبت کو فروغ دینا چاہیے۔

جب ہم یسوع کی تعلیمات کو غور سے دیکھیں، نہ صرف ان کے پیغام کو بلکہ پیغام پہنچانے کے طریقے کو بھی دیکھیں تو ہمیں بار بار یہ ملتا ہے کہ وہ ایک شراکت کے معاشرے کی انجیل کی تبلیغ کررہے تھے۔ انہوں نے اس اذعانی عقیدے کو مسترد کردیا کہ عالی مرتبت مرد (یسوع کے زمانے کے پادری، شرفا، دولت مند لوگ اور بادشاہ) خدا کے لاڈلے ہیں۔ یسوع عورتوں کے ساتھ آزادی سے میل ملاقات کرتے تھے، اس طرح وہ اپنے زمانے کے مرد کی فوقیت کو برملا مسترد کررہے تھے۔ ان کا نظریہ بعد کے زمانے کے مسیحی دانشوروں کے نظریات سے بالکل متصادم تھا جو اس بات پر بحث کرتے رہتے تھے کہ کیا عورت ایک لافانی روح رکھنے والی مخلوق ہے؟ یسوع کا آخری پیغام یہ ''نہیں'' تھا کہ عورتیں روحانی طور پر مردوں سے پست ہوتی ہیں۔

اس بات پر عرصۂ دراز تک بحث ہوتی رہی کہ کیا یسوع واقعتاً موجود تھے۔ دلیل (بمعہ کئی دستاویزی شہادتوں کے) یہ ہے کہ دستاویزات میں ان کی موجودگی کی کوئی توثیقی شہادت نہیں پائی جاتی ماسوائے انتہائی مشکوک مسیحی ذرائع کے، جو کہتے ہیں کہ ہاں وہ پائے جاتے تھے۔ تجزیہ نگار یہ بھی کہتے ہیں کہ یسوع کی زندگی سے متعلق تمام واقعات اور اسی طرح ان کی بہت سی تعلیمات دوسرے مذاہب کی خیالی شخصیات کی زندگیوں اور ان کی گفتگوؤں کے ذریعے ملتی ہیں۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ یسوع کی شخصیت سابق چرچ لیڈرز کے مقاصد کے تحت کہیں اور سے چیزیں مستعار لے کر گھڑی گئی تھی۔ حیرت انگیز طور

پر یسوع کی تاریخیت کے لئے بے حد زور لگا کر جو دلیل لائی گئی ہے وہ ان کے نسوانیت اور "gylanic" سے متعلقہ خیالات اور اقدامات ہیں کیونکہ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ اس نظام کے لئے اہم ترین تقاضا دیوتاؤں اور ہیروؤں کی بہت بڑی تعداد گھڑنا تھا جو "androcratic" اقدار کو مسترد کرنے کی بجائے ان کی حمایت کرتے۔

اس طرح یہ سمجھنا بہت مشکل ہے کہ ایک شخصیت کیوں ایجاد کی گئی جس کا ذکر ہم کتاب یوحنا (۴:۷۔۲۷) میں پڑھتے ہیں کہ اس نے عورتوں سے کھلم کھلے انداز میں بات چیت کر کے اپنے زمانے کی ''اینڈروکریٹک'' روایات کی خلاف ورزی کی۔ یا جس کے شاگردوں نے اظہار حیرت کیا کہ وہ عورتوں سے بات چیت کرتا تھا۔ یا وہ ان عورتوں کی سنگساری کی رسم سے چشم پوشی کرنے کو تیار نہیں تھا جو ان کے مرد آقاؤں کی رائے میں ایسے شخص سے جنسی فعل کی مرتکب ہوئیں جو ان کا آقا نہیں تھا۔

لوقا (۱۰:۳۸۔۴۲) میں ہم پڑھتے ہیں کہ کس طرح یسوع عورتوں کو اپنے ساتھیوں میں شامل کرتے تھے بلکہ ان کی ان کے کمتر کرداروں سے بالاتر ہونے اور پبلک لائف میں فعال کردار ادا کرنے کی حوصلہ افزائی بھی کرتے تھے۔ انہوں نے فعالیت پسند مریم کی تعریف کرتے ہوئے اس کی بہن مارتھا پر ترجیح دی جو صرف گھریلو کام کاج میں منہمک رہتی تھی اور سرکاری طور پر تسلیم شدہ اناجیل میں ہر انجیل میں میری میگڈالین کا ذکر پڑھتے ہیں کہ اس سے یسوع کتنے احترام سے پیش آتے تھے جبکہ وہ غالباً ایک طوائف تھی۔

اس سے بھی زیادہ حیرت انگیز بات جو ہم اناجیل میں پاتے ہیں وہ یہ تھی کہ یسوع کے پھر جی اٹھنے کے بعد وہ سب سے پہلے میگڈالین ہی کو نظر آئے تھے۔ اس وقت وہ ان کی خالی قبر کے پاس کھڑی ہو کر روتی رہتی اور اس کی حفاظت کرتی تھی۔ یسوع کشف میں بھی سب سے پہلے اسی کو نظر آئے جبکہ بارہ مشہور مرد شاگردوں نے بعد میں یسوع کو خواب میں دیکھا تھا۔ یہ بھی میگڈالین تھی جس سے دوبارہ زندہ ہونے والے یسوع نے کہا کہ وہ دوسروں کو بھی بتا دے کہ وہ اوپر واپس جا رہے ہیں۔ (۸)

یہ امر حیرت ناک نہیں کہ یسوع کی تعلیمات ان کے زمانے میں عورتوں کے لئے اپنے اندر بڑی کشش رکھتی تھیں (اور اب بھی رکھتی ہیں) اگرچہ مسیحی مؤرخین اس کا بہت ہی کم حوالہ دیتے ہیں کہ ہم سرکاری نسخوں یا عہد نامۂ جدید میں بھی عورتوں کو بطور سچین لیڈر پاتے

ہیں۔ مثال کے طور پر ''رسولوں کے اعمال'' (۹:۳۶) میں ایک خاتون شاگرد ''تبیتا'' یا ''ڈورکس'' کا ذکر آتا ہے مگر اس کو بارہ شاگردوں میں سرکاری طور پر شمار نہیں کیا گیا۔ ''رومیوں ۱۶: ۷'' میں ہمیں ملتا ہے کہ پال ایک خاتون رسول کو بہت احترام کے ساتھ اپنا سلام بھیجتا ہے جس کا نام یونیاس تھا، اسے وہ تحریک میں خود سے سینئر قرار دیتے ہوئے کہتا ہے ''انڈرینکس اور یونیاس سے سلام کہو وہ میرے رشتہ دار ہیں اور میرے ساتھ قید ہوئے تھے اور رسولوں میں نامور ہوئے ہیں اور مجھ سے پہلے مسیحیت میں داخل ہوئے تھے''

بعض سکالرز نہایت وثوق کے ساتھ کہتے ہیں کہ عہد نامۂ جدید کی کتاب'' عبرانیوں کے نام خط'' پرسیلہ نامی عورت نے لکھی تھی۔ وہ اقیلہ کی بیوی تھی ،عہدنامہ جدید کے مطابق وہ پال کے ساتھ کام کرتی رہی، اس کا نام عموماً اس کے شوہر کے نام سے پہلے آتا ہے۔ (۳) اور جیسا کہ مذاہب کی تاریخ دان کانسٹینس پاردے لکھتی ہے کہ ''رسولوں کے اعمال'' (۲:۱۷) میں عورتوں کا وضاحت کے ساتھ بطور انبیا ذکر ملتا ہے مثلاً ''خدافرماتا ہے کہ آخری دنوں میں ایسا ہوگا کہ میں اپنی روح میں سے کچھ اثر ہر بشر پر ڈالوں گا اور تمہارے بیٹے اور بیٹیاں نبوت کریں گی''

چنانچہ اس زمانے میں مردوں کے سخت غلبے اور زبردست سماجی دباؤ کے باوجود عورتوں نے ابتدائی مسیحی معاشروں میں قائدانہ کردار ادا کیا، جیسا کہ مذہبی سکالر ایلزبیتھ شیسلر فیورنزا کہتی ہے اور اس کی توثیق اس امر سے ہوتی ہے کہ عہدنامۂ جدید میں اوّلین مسیحیوں کے جن اجلاسوں کا ذکر ملتا ہے وہ عورتوں کے گھروں میں منعقد ہوا کرتے تھے۔ مثال کے طور پر ''کلسیوں کے نام کا خط''(Colossians 4:15) میں ہم ''نیمفا کے گھر میں چرچ'' ا۔ کرنتھیوں کے نام کا خط'' ۱:۱۱ میں ''خلوئے''(Chlow) کے گھرانے میں چرچ ،''رسولوں کے اعمال'' ۱۶:۱۴، ۱۵ اور ۴۰ میں ہم پڑھتے ہیں فلپی میں چرچ کا آغاز ایک تاجر عورت لیڈیا کے عیسائیت قبول کرنے سے ہوا۔علی ہذالقیاس اور بھی کئی حوالے مل سکتے ہیں۔ (۴)

جیسا کہ ہم پہلے ذکر کرچکے ہیں کہ اسی عہدنامۂ جدید میں ہم میری میگڈالین کے بارے میں پڑھتے آرہے ہیں جسے ایک طوائف بتایا گیا ہے یعنی وہ ایک ایسی عورت ہے جس نے مردانہ معاشرے کا ایک نہایت بنیادی قانون توڑا ہے جو تقاضا کرتا ہے کہ اسے اپنے شوہر یا آقا کا جنسی اثاثہ ہونا چاہیے لیکن اسے مسترد کئے جانے کی کوشش کے باوجود وہ

واضح طور پر ابتدائی دور کی تحریک مسیحیت کی ایک اہم رکن ہے۔ ہم آگے بتائیں گے کہ اس امر کی ناقابل تردید شہادت موجود ہے کہ وہ یسوع کی وفات کے بعد ابتدائی مسیحی تحریک کی ایک لیڈر تھی۔ اسے ایک خفیہ دستاویز کے ذریعے خود بعض مسیحی فرقوں میں نظام درجہ بندی کے مکرّر نفاذ کی راہ میں رکاوٹ بنتی دکھایا گیا ہے، وہ درجہ بندی جسے یسوع چیلنج کرتے رہے۔ اس خفیہ دستاویز کو ان مقدس صحیفوں میں انہوں نے ہی شامل نہیں ہونے دیا جو عہدنامہ جدید مرتب کرنے والے تھے۔

مردانہ معاشرے کی ذہنیت کے لئے اس امر کو قبول کرنا، ناقابل تصوّر ہے کہ یسوع ایک ایسا انقلاب لانے کی کوشش کررہے تھے جو عورتوں کا جوابی انقلاب (gylanic counter-revolution) ثابت ہونا تھا۔ ایک تمثیلی کہانی کو دوسرے لفظوں میں بیان کرتے ہوئے ہم یوں کہیں گے کہ ایک اونٹ کا سوئی کے ناکے میں سے گزر جانا آسان ہوسکتا ہے لیکن ان بنیاد پرستوں کے ذہن کے اندر یہ بات آسکنا ممکن نہیں جن کی کاروں کے بمپروں پر دوسروں کو نصیحت کے یہ سٹکر لگے ہوئے ہیں ''یسوع کے ساتھ جڑ جاؤ''۔ اب غور وفکر کی بات یہ ہے کہ یسوع نے عورتوں کا درجہ بلند کرنے اور نسوانی اقدار کو اطاعت گزاری سے نکال کر آبرومندانہ اقدار میں تبدیل کرنے کا علم کیوں اٹھایا؟ ان کا خیال ہے کہ یسوع جس بلند مقام پر فائز تھے، انہیں اس سے کہیں زیادہ اہم مسائل درپیش تھے۔ جن میں وہ ہمہ تن مصروف ہوں گے۔ اس انہماک نے معاملات کی مروّجہ تعریف کے مطابق انہیں مہلت ہی نہیں دی ہوگی کہ وہ عورتوں کے مسائل جیسی چیزوں میں لگے رہتے۔

یہ درحقیقت ایک غیرمعمولی اہمیت کا مسئلہ تھا کہ یسوع نے اس کے بارے میں جو کچھ پڑھایا وہ پڑھا دیا۔ کیونکہ یسوع جو ایک مردانہ نظام (اینڈروکریٹک) کی پیداوار تھے۔ انہوں نے خود ایسے زمانے میں بطور ایک یہودی کے جنم لیا جب یہودیت ہنوز ایک سخت گیر مردانہ نظام میں جکڑی ہوئی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جیسا کہ ہم یوحنا ۸:۳۔۱۱میں پڑھتے ہیں عورتوں کو حرامکاری پر سنگسار کردیا جاتا تھا۔ بہ الفاظِ دیگر انہیں یہ سزائے موت اس لئے ملتی تھی کہ ایسا کرنے سے وہ اپنے شوہروں یا آقاؤں کے جنسی جائداد کے حق کی خلاف ورزی کی مرتکب ہوتی تھیں۔ اس مثال میں ایک زبردست حقیقت یہ پائی جاتی ہے کہ یسوع نے نہ صرف سنگساری کی ممانعت کی بلکہ ایسا کرتے ہوئے ان فقیہوں اور فریسیوں کی کھلے

بندوں مخالفت کی جنہوں نے خوب سوچ سمجھ کر ایک جال بچھایا تھا تاکہ انہیں اس میں پھنسا کر بطور ایک خطرناک باغی کے پیش کردیں۔

تاہم اس طریقِ عمل سے یسوع کی حامی نسواں تعلیمات (gylanic teachings) کوئی زیادہ نمایاں ہو کر سامنے نہیں آتیں۔ یسوع بڑے عرصہ سے عظیم ترین روحانی شخصیات میں سے تھے جو ہمیشہ یادرکھی جائیں گی۔ اعلیٰ وارفع محاسن کے کسی بھی پیمانے سے بائیبل میں پیش کردہ ان کی شخصیت غیر معمولی طور پر ''حساس'' ذہین وفہیم اور جرأت واستقامت کی پیکر تھی وہ کسی بھی اتھارٹی کے سامنے کھڑے ہوسکتے تھے اور حتیٰ کہ جان کا خطرہ بھی مول لے سکتے تھے۔ ظلم وتشدد اور حرص ولالچ کے مذمت کرسکتے تھے۔ چنانچہ یہ حیرت کی بات نہیں کہ یسوع اپنے گردوپیش میں ہرجگہ غلبے، عدم مساوات اور فتوحات کی ''مردانہ'' اقدار کی فرمانروائی پاتے تھے جو انسانی زندگی کی تذلیل وتحقیر کررہی تھیں اور چاہتے تھے کہ ان کی جگہ نرم ولطیف احساسات کی حامل، قدرے زیادہ ''نسوانی'' اقدار لے لیں جو رحمدلی، ذمہ داری اور محبت وشفقت پر مبنی ہوں۔

یسوع کو ادراک تھا کہ متشددانہ نظامِ مراتب پر مبنی انسانی تعلقات نے ہمارے اس روحانی ارتقا کی راہ کو روک رکھا ہے جو بنیادی سماجی تقلیب کی طرف بڑھ رہا تھا اور یہ ہمیں مردانہ جبر کے نظام (androcaratic system) سے آزادی دلاسکتا تھا لیکن جیسا کہ نسوانیت کی حیاتِ نو (gylanic resurgence) کے دیگر مواقع پر ہوا نظام کی مزاحمت بہت مضبوط تھی۔ اور آخر میں آبائے کلیسا نے ہمیں عہدنامۂ جدید تھمادیا جس میں مکمل طور پر متناقض عقائد مسلط کرکے اس شعور کی سانس اکثر روک دی جاتی ہے یہ عقائد کلیسا کے دورِ متاخر کی مردنوازی پر مبنی عمارت اور اس کے مقاصد کا جواز پیش کرنے کے لئے وضع کئے گئے تھے۔

مخفی اناجیل

جس طرح قدیم فنی شاہکاروں کو بحال کرنے والوں کو مختلف رنگوں اور سریش وغیرہ کی تہوں کو رگڑ رگڑ کر اتارنا پڑتا ہے اسی طرح مذہبی سکالرز اور مؤرخینِ مذاہب بھی عورتوں کے خیرخواہ مسیح (gylanic jesus) کو آشکارا کررہے ہیں۔ جو عہدنامۂ جدید کے درونِ سینہ براجمان ہے۔

قدیم عیسائیت کی اصل حقیقت کا بہتر فہم حاصل کرنے کے لئے ہمیں عہد نامۂ جدید میں شامل سرکاری اناجیل سے باہر نکل کر دیگر قدیم مسیحی دستاویزات کی طرف جانا ہوگا، ان میں سے بعض حال میں دریافت ہوئی ہیں۔ جن میں سے اہم ترین اور متعدد انکشافات کی حامل ۵۲ غناسطی اناجیل(Gnostic gospels) ہیں جو ۱۹۴۵ء میں بالائی مصر کے دور افتادہ صوبہ ناگ حمادی میں دریافت ہوئیں۔ (۵)

پرنسٹن میں مذہبی تحقیق کی ایک پروفیسر ایلین پیجلز اپنی کتاب "The Gnostic Gospels" میں لکھتی ہے کہ ''جن لوگوں نے یہ متون لکھیں اور پھیلائیں وہ اپنے آپ کو ملحد نہیں سمجھتے تھے''(۶) تاہم ان ملحدانہ اناجیل کے بارے میں پہلے جتنی کچھ معلومات عام ہوئی ہیں وہ ان لوگوں کی پھیلائی ہوئی ہیں جو ان پر گرفت کرتے تھے، اس لئے ان سے توقع نہیں کی جاسکتی کہ وہ ہمیں کوئی معروضی معلومات فراہم کرتے۔

درحقیقت جن لوگوں نے ۲۰۰ عیسوی میں ان چیزوں کو اپنے کنٹرول میں لیا جسے بعد میں"Orthodox" (مسلمہ عقائد) یا صحیح ترین قرار دیا گیا، کلیسا نے ایسے متون کی ساری کاپیاں نذرآتش کرنے کا حکم دے دیا لیکن جیسا کہ پیجلز لکھتی ہے ''کسی شخص نے جو سینٹ پیچومیئس کی خانقاہ میں ایک راہب تھا، ممنوعہ کتابوں میں سے کچھ چھپالیں اور پکڑی جانے کے خوف سے انہیں مرتبان میں ڈال کر زمین میں دفن کردیا جو تقریباً ۱۶۰۰ برس دفن رہیں'' (۷) اور ایک سلسلۂ واقعات کی وجہ سے جو ایک جاسوسی کہانی کی طرح لگتا ہے یہ نو دریافت مخفی غناسطی اناجیل مزید ۳۴ برس پوشیدہ رہیں، تب سکالرز نے ان کا ازسرنو جائزہ لیا اور بالآخر پیجلز کی کتاب نے ۱۹۷۹ء میں ان کی طرف عوامی توجہ مبذول کرائی۔

ہارورڈ یونیورسٹی کے پروفیسر ہلمیٹ کوئیسٹر کے مطابق یہ حالیہ دریافت شدہ مقدس مسیحی تحریریں عہدنامۂ جدید کی اناجیل سے زیادہ پرانی ہیں ''غالباً یہ پہلی صدی کے دوسرے نصف (۵۰۔۱۰۰) سے قبل یا مرقس، متّی لوقا اور یوحنّا کے برابر یا ان سے پہلے کی ہیں''۔ (۸)

اس طرح غناسطی اناجیل اس وقت ضابطۂ تحریر میں لائی گئیں جب ''اینڈروکریسی'' ایک طویل عرصہ سے مغربی رویہ بنی چلی آرہی تھی۔ یہ ''گائیلینک'' دستاویزات نہیں ہیں پھر بھی ہم ان میں تسلّط پر مبنی معاشرے کے طور طریقوں کے لئے ایک طاقتور چیلنج پاتے ہیں۔ و

"gnostic" کی اصطلاح یونانی لفظ "gnosis" یا ''علم'' سے ماخوذ ہے یہ اس سے بھی زیادہ وسیع پیمانے پر معروف اصطلاح "agnostic" (لاادری) کے مقابلے میں استعمال ہوتی ہے، یہ ان لوگوں کے لئے استعمال ہوتی ہے جو یہ ایمان رکھتے ہیں کہ خدا یا کائنات کی ابتدا یا کسی اور چیز کے بارے میں یقینی علم حاصل نہیں ہوسکتا۔ دیگر متصوفانہ مغربی اور مشرقی مذہبی روایات کی طرح غناسطی عیسائیت کا یہ بظاہر غیرملحدانہ نقطہ نظر تھا کہ مذہبی طور طریقے اور اخلاقی زندگی اختیار کی جائے تو تمام اعلیٰ الوہی اسرار سمجھ میں آجاتے ہیں۔

پھر غناسطیت میں کون سی بات اتنی ملحدانہ تھی جو اسے ممنوع قرار دینے کی وجہ بنی؟ یہ سوال خاص طور پر اس لئے پیدا ہوتا ہے کہ ہم جو تصور غناسطی اناجیل میں پاتے ہیں وہ وہی تصور ہے جس نے عبرانی پیشواؤں کو اس اقدام پر آمادہ کیا کہ وہ یسوع کی تذلیل کریں اور ان کا خاتمہ کرکے دم لیں۔ وہ یہ ہے کہ خدا تک پہنچنے کے لئے کسی مذہبی نظامِ مراتب کے سربراہ چیف ربی، بڑے بشپ یا پوپ کا سہارا لینا یا اس کو وسیلہ بنانا ضروری نہیں ہے بلکہ یہ مقصد براہ راست غناسطیت یا عرفانِ الٰہی سے حاصل ہوسکتا ہے۔ اس کے لئے مذہبی مناصب پر براجمان پادریوں کی بیعت کرنے یا انہیں زرعی پیداوار میں سے دسواں حصہ (عُشر) ادا کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔

ہم ''راسخ العقیدہ'' مسیحی پادریوں کی چھپائی ہوئی ان اناجیل میں بھی وہ چیز پاتے ہیں جو اس شبہے کی تصدیق کرتی ہے جو سرکاری اناجیل اور غناسطی اناجیل کے بچے کھچے ٹکڑوں کو پڑھنے سے پیدا ہوتا تھا وہ یہ ہے کہ میری میگڈالین ابتدائی مسیحی تحریک کی اوّلین اہم شخصیتوں میں سے ایک تھی۔

''انجیل مریم''(Gospel of Mary) میں ہم ایک بار پھر پڑھتے ہیں کہ وہ دوبارہ زندہ ہونے والے مسیح کو دیکھنے والوں میں سے اوّلین تھی (جیسا کہ سرکاری اناجیل مرقس اور یوحنا میں بھی اس کا سرسری طور پر ذکر آتا ہے) (۹) یہاں ہم یہ بھی پڑھتے ہیں کہ مسیح میری میگڈالین سے، اپنے باقی ماندہ سب شاگردوں سے زیادہ محبت رکھتے تھے، اس کی تصدیق غناسطی، انجیلِ فلپ سے بھی ہوتی ہے (۱۰) لیکن میریؔ (مریم) نے ابتدائی مسیحیت کی تاریخ میں کتنا کردار ادا کیا ہوگا اس پر صرف انہی چھپائی گئی اناجیل سے روشنی پڑتی ہے۔ ہم جو کچھ ''انجیلِ مریم'' میں پڑھتے ہیں وہ یہ ہے کہ یسوع کی وفات کے بعد میری میگڈالین وہ مسیحی

لیڈر تھی جس میں پطرس(Peter) کی اتھارٹی کو چیلنج کرنے کا حوصلہ پایا جاتا تھا۔ پطرس نئے مذہبی نظامِ مراتب کا سربراہ تھا، یہ نظام اس دعوے کی بنیاد پر قائم تھا کہ خداوند تک براہ راست رسائی صرف اس کو اور اس کے بشپوں کو حاصل ہے۔ (۱۱)

ایلین پیجلز لکھتی ہے ''گاسپیل آف میری، کے سیاسی مضمرات کا اندازہ لگایئے جسے میری پطرس کے مقابلے میں کھڑی ہوجاتی ہے اسی طرح غناسطی اسے اپنا نقشِ اوّل سمجھتے ہوئے ان پادریوں اور بشپوں کے اختیارات کو چیلنج کرتے ہیں جو پطرس کے جانشین ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں'' (۱۲)

پیٹر (پطرس) کی زیرِ سرکردگی ابھرنے والے نظام مراتب پر مبنی چرچ اور قدیم مسیحی کمیونٹیز (مثلاً مونٹانیسٹس اور مارشیونائیٹس) کے درمیان دیگر متعلقہ مسائل پر اسی نوعیت کے بنیادی اور اصولی اختلافات تھے۔ ان فرقوں میں سے بیشتر فرقے ان آبائے کلیسا کے بالکل برعکس عورتوں کو نہ صرف بطور شاگرد، بطور رسول اور بانیانِ عیسائیت مانتے تھے بلکہ یسوع کی تعلیمات پر اپنے مضبوط اظہار ایمان کے لئے عورتوں کو اپنی لیڈرشپ میں شریک کرتے تھے۔ (۱۳)

یہاں تک کہ بنیادی اصول نسوانیت(gylanic principle) کو مزید اجاگر کرتے ہوئے بعض غناسطی فرقے مستقل عہدیداری کو ختم کرکے اپنے ہر اجلاس میں بذریعہ قرعہ اندازی اپنی قیادت کا انتخاب کرتے تھے۔ ہمیں ان باتوں کا پتہ غناسطیوں کے دشمنوں کی تحریروں سے چلا ہے جن میں سب سے زیادہ نمایاں بشپ ارینس(Irenaeus) تھا جو ۱۸۰ عیسوی میں لیونز میں چرچ کی نگرانی کیا کرتا تھا۔ (۱۴)

پیجلز لکھتی ہے کہ ایسے وقت میں جب راسخ العقیدہ عیسائی، پادریوں اور وابستگانِ کلیسا کے درمیان امتیاز کو آئے دن بڑھا رہے تھے غناسطی عیسائیوں کا یہ گروہ آپس میں اس امتیاز کو تسلیم نہیں کرتا تھا۔ یہ اپنے ارکان کو اعلیٰ اور ادنیٰ میں تقسیم کرنے کی بجائے سختی سے اصولِ مساوات پر عمل کررہے تھے۔ تمام مبتدی مرد وعورت یکساں رتبے کے حامل تھے اور اپنے میں سے کسی ایک کو پادری، بشپ یا رسول منتخب کرلیتے۔ مزید برآں چونکہ وہ ہر اجتماع میں قرعہ اندازی کرتے تھے، اس لئے ان قرعوں کی بنا پر قائم ہونے والے امتیازات مستقل درجے نہیں بن سکتے تھے۔ (۱۵)

MashalBooks.org

چونکہ مرد کی برتری پر یقین رکھنے والے یعنی ''اینڈ روکریٹک''، مسیحی جو ہر کہیں عہدوں کی بنیاد پر قابضِ اقتدار ہو رہے تھے ان کے لئے قرعہ اندازی قسم کی چیزیں کراہت انگیز تھیں۔ مثال کے طور پر لاطینی چرچ فادر ٹرٹولین (۱۶۰۰۔۲۳۰ عیسوی) کو اس بات پر بہت غصہ تھا کہ ''ان سب کو یکساں طور پر رسائی ملتی ہے، یہ ایک ہی طرح سنتے ہیں ایک ہی طرح عبادت کرتے ہیں، حتیٰ کہ اگر ملحد آ ٹپکیں تو وہ بھی ان کے ساتھ اسی طرح مشغول عبادت ہو جائیں گے'' جتنے بھی آ جائیں یہ ان سب کو Kiss of peace دے دیں گے'' (۱۶)

لیکن جس بات پر وہ آپے سے باہر ہو رہے تھے وہ عورتوں کی برابری کا مسئلہ تھا، جس سے بقول ان کے پورا نظام مراتب خطرے میں پڑ رہا تھا۔ وہ اور اس کے ساتھی بشپ چرچ کے اوپر جو نظام مسلّط کر نے کی کوشش کر رہے تھے اس میں عورتوں کی برابر کی شرکت تھی۔ پیجلز کہتی ہے ''ٹرٹولین کو خاص طور پر جس بات پر غصہ ہے وہ ملحدوں کے مابین پائی جانے والی وہ عورتیں ہیں جنہیں مردوں کے برابر بااختیار مناصب مل رہے ہیں۔ وہ درس دیتی ہیں، بحثوں میں حصہ لیتی ہیں، جھاڑ پھونک کرتی ہیں اور علاج بھی کرتی ہیں۔ ٹرٹولین کو خدشہ ہے کہ شاید وہ بپتسمہ بھی دیں گی جس کے معنی یہ ہوئے کہ وہ بشپ کے طور پر کام کریں گی'' (۱۷)

ٹرٹولین جیسے مردوں کے لئے عورتوں اور مردوں کے روحانی طور پر برابر قرار پانے سے بڑا ''کفر'' صرف ایک ہی ہے۔ یہ وہ تصور ہے جس نے مردوں کے بڑھتے ہوئے اقتدار کو خطرے میں ڈال دیا ہے اور یہ اب اپنے آپ کو کلیسا کی شہزادیاں اور خدا کو نسوانی روپ میں پیش کرنے والی ہیں۔ اور اس بات کا یسوع کے بعض ابتدائی پیروکار واقعتاً پرچار کر رہے تھے۔ ہم ایسے خیالات اب بھی ان غناسطی اناجیل میں اور دیگر مسیحی دستاویزات میں پڑھ سکتے ہیں جو سرکاری اناجیل یا عہد نامۂ جدید میں شامل نہیں ہیں۔

ایک قدیم روایت جواب تک یاد کی جا رہی ہے۔ وہ دیوی سے متعلق ہے جس میں اسے ماں اور ''سب کو عطا کرنے والی'' تسلیم کیا جاتا تھا اور Valentinus اور Marcus کے پیروکار ''ماں'' کے سامنے بطور "mystical and eternal silence"، بطور "Grace, she who is before all things" اور بطور "Incorruptible wisdom" دعا مانگتے تھے۔ (۱۸) ایک اور متن میں، جس کا عنوان "Trimorphic Protennoia" تھا، قوتِ فکر و ذہانت اور صلاحیتِ پیش

بنی کو بطور مؤنث ظاہر کر کے ان کی مدح سرائی کی گئی ہے اور سابق روایت کی پیروی کرتے ہوئے یہ دیوی کی صفات بتائی گئی ہیں۔ متن کا آغاز بطور ایک الوہی شبیہہ کے ہوتا ہے جو کہتی ہے ''میں پروٹینوا، وُہ قوتِ فکر ہوں جو روشنی میں رہتی ہے...... وہ ہوں جس کا وجود سب سے پہلے کا ہے...... میں ہر مخلوق کے اندر متحرک رہتی ہوں...... میں غیر مرئی ہوں اور سب کے اندر ہوں۔ میں ادراک وشعور اور علم ہوں جو بذریعہ فکر ایک آواز لگارہی ہوں، میں حقیقی آواز ہوں'' (۱۹)

ایک اور متن میں جو غناسطی استاد سائمن میگس سے منسوب ہے اس میں جنّت کو جہاں سے زندگی کا آغاز ہوا رحمِ مادر کے طور پر بیان کیا گیا ہے (۲۰) اور ان تعلیمات میں جو Theodotus یا Marcus (تقریباً ۱۶۰ عیسوی) سے منسوب ہیں، یہ بتایا گیا ہے ''مونث اور مذکر عناصر باہم مل کر ماں کی عمدہ ترین پیداوار، دانائی کی صورت میں پیش کرتے ہیں'' (۲۱)

ان ''کلماتِ کفر'' نے جو بھی شکل اختیار کی وہ واضح طور پر اُن قدیم مذہبی روایت سے ماخوذ تھے جب دیوی کی پرستش کی جاتی تھی اور خواتین پادری اس کی ارضی نمائندگان تھیں۔ چنانچہ تقریباً یکسانی سے الوہی دانش بطور مؤنث متشکل ہوتی تھی۔ جواب بھی نسوانی الفاظ میں بطور عبرانی ''ہوکما'' (hokma) اور یونانی ''صوفیہ'' پائی جاتی ہیں۔ دونوں کے معنی ''دانش'' کے ہیں۔ دوسری متصوفانہ روایات میں بھی اسی طرح آتا ہے جو مشرقی بھی ہیں اور مغربی بھی۔ (۲۲)

ان ''کفریہ'' کلمات کا ایک اور شکل میں اظہار ہوا جس میں برگزیدہ خاندان (holy family) کو غیر مسلمہ (unorthodox) انداز میں پیش کیا گیا تھا۔ پیجلز کہتی ہے ''غناسطی منابع کے ایک گروہ کا دعویٰ تھا کہ اس نے یسوع سے بذریعہ جیمز اور بذریعہ میری میگڈالین ایک خفیہ روایت وصول پائی۔ اس گروہ کے ارکان نے مقدس باپ اور ماں دونوں سے دعا کی: آپ سے اے باپ اور آپ کی وساطت سے اے ماں، دولافانی ناموں والو، الوہی ہستی کے والدین اور آپ سے اے جنت نشین، انسانیت اور قدرت کے عظیم نام''

اسی طرح استاد اور شاعر ویلنٹینس نے سبق دیا کہ الوہیت اگرچہ ناممکن البیان ہے خدا کا تصور دو کے مجموعے سے کیا جاسکتا ہے جو نر اور مادہ کے اصولوں پر ہیں۔ (۲۴) دیگر باتیں زیادہ تر استعاروں میں تھیں جن میں اصرار کیا گیا کہ الوہیت کو نر وماد (androgynous)

دونوں کی خصوصیات کی حامل سمجھا جانا چاہیے۔ یا وہ روح القدس کومؤنث بیان کرتے تاکہ اس کا روایتی کیتھولک تثلیث کی اصطلاحات میں اظہار ہوسکے۔ باپ کا روح القدس کے ساتھ یا الوہی ماں کے ساتھ الحاق تھا جس سے بیٹے مسیحا کرائسٹ نے جنم لیا۔[۲۵]

نسوانی بدعات

اوّلین عیسائیوں نے نہ صرف ''آبائے کلیسا'' کی بڑھتی ہوئی قوت کو دھمکایا بلکہ ایسے خیالات بھی پیش کئے جومرد کے زیرِاقتدار قائم خاندان کے لئے بھی براہ راست چیلنج کی حیثیت رکھتے تھے۔ یہ خیالات وتصورات عورت پر خدا کے حکم کے تحت قائم مرد کی حاکمیت کو کھوکھلی کررہے تھے۔ یہ وہ حاکمیت تھی جس پر پدرسرانہ خاندان استوار ہے۔

بائبلی سکالرز اکثر اس امر کا اظہار کرتے رہتے تھے کہ ابتدائی دور کی عیسائیت عبرانی اور رومی حکام کے لئے ایک خطرہ بننے جارہی ہے۔ یہ محض اس بنا پر نہیں تھا کہ عیسائی شہنشاہ کی پرستش اور ریاست کے ساتھ اظہار وفاداری سے گریزاں تھے۔ پروفیسر ایس سکاٹ بارشی (سابق ڈائریکٹر انسٹی ٹیوٹ برائے مطالعہ مسیحی منابع توبجن مغربی جرمنی) بتاتا ہے کہ یسوع اور ان کے پیروکاروں کی تعلیمات کوخطرناک حدتک انقلابی محسوس کرنے کا اصل سبب یہ تھا کہ یہ مروّج خاندانی روایات کے لئے چیلنج بن گئی تھیں جبکہ وہ عورتوں کو اپنے دائرۂ حق کے اندر سمجھتے تھے۔ پروفیسر سکاٹ بارشی اپنے حاصلِ مطالعہ کو اس بات پر لاکر ختم کرتا ہے کہ ان تعلیمات سے اصل خطرہ یہ تھا کہ وہ اس دور کے رومن اور یہودی خاندانوں کی ساختوں کی تذلیل کرتی تھیں، ان دونوں خاندانی نظاموں میں عورتیں محکوم اور مرد حاکم ہوتے تھے۔[۲۶]

اگر ہم خاندان پر وسیع تر دنیا کے ایک عالم صغیر (microcosm) کے طور پر نظر ڈالیں جسے کہ ایک ننھا، لچکیلے بدن والا بچہ اپنی اکلوتی دنیا سمجھتا ہے، مرد کی زیرِ حاکمیت چلنے والے خاندان میں جس میں باپ کے منہ سے نکلا ہوا ہرلفظ قانون کا درجہ رکھتا ہے اس کی ''تذلیل'' کو اس پورے نظام کے لئے خطرہ سمجھا جاتا ہے جو طاقت پر مبنی درجہ بندی پر قائم ہے۔ اس سے اس سبب کی وضاحت ہوتی ہے کہ ہمارے زمانے کے لوگ ہمیں کیوں ان ''پرانے اچھے زمانوں'' کی طرف دھکیل دینا چاہتے ہیں جس میں عورتوں اور ''کمتر مردوں''

MashalBooks.org

کو ابھی تک اپنا مقام یاد ہے اور وہ ''روایتی'' خاندان کی طرف واپسی کو اپنی اوّلین ترجیح سمجھتے ہیں۔ اس سے اس جدوجہد پر بھی روشنی پڑتی ہے جس نے دوہزار سال قبل دنیا کو ٹکڑے ٹکڑے کردیا تھا جب یسوع رحم، عدم تشدد اور محبت و آشتی کی انجیل کی تبلیغ کر رہا تھا۔

ہمارے زمانے اور رومن ایمپائر کے متلاطم زمانے میں بہت سی دلچسپ مشابہتیں ہیں۔ وہ تسلّط پر مبنی معاشروں میں سے انتہائی مضبوط اور طاقتور ترین سلطنت ہوتی تھی جس میں بالآخر ٹوٹ پھوٹ کا عمل شروع ہوکر رہا۔ دونوں زمانے ماہرین نظریہ ''انتشار'' کی نگاہ میں نظاموں میں عدم توازن بڑھنے کی حالت ہیں، ایسے زمانوں میں کوئی بھی بے مثال اور غیر متوقع تبدیلی آسکتی ہے۔ اگر ہم وفاتِ مسیح سے فوری پہلے اور فوری بعد کے سالوں کو مردانہ نظام اور زنانہ نظام کے مابین جاری کشمکش کے تناظر میں دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ ہمارے اپنے دور کی طرح وہ بھی زنانہ(glyanic) حیاتِ نو کی زبردست سرگرمیوں کا دور تھا۔ اس میں کسی بڑی حیرت کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ ایسے ہی شدید سماجی اضطراب کے زمانے ہوتے ہیں جن کے دوران، بقول نوبیل انعام یافتہ ''الیا پیریگوجین''(Ilya Prigogine) کے، ابتدائی چھوٹے پیمانے کی ''جنبشیں'' نظامہائے تقلیب برپا کردیتی ہیں۔ (۲۷)

اگر ہم قدیم عیسائیت کی طرف دیکھیں تو ابتدائی ہلکی جنبشیں جو رومن ایمپائر کے کنارے (چھوٹے سے صوبے جوڈیامیں) رونما ہوئیں ان کی امکانی قوت ہمارے ثقافتی ارتقا کے لئے ایک نئے معنی رکھتی ہے اور اس کی ناکامی اس سے بھی کہیں زیادہ تکلیف لاسکتی ہے۔ مزید برآں اگر ہم قدیم عیسائیت کو ایسے وسیع تر ڈھانچے میں رکھ کر غور کریں جو یہ دیکھتا ہو کہ تمام باہمی طور پر منسلک نظاموں میں کیا کچھ ہوتا رہا ہے تو ہم یہ بھی دیکھ سکیں گے کہ نسوانیت کی حیاتِ نو کی دیگر شہادتیں خود روم کے اندر بھی موجود تھیں۔

مثال کے طور پر، تعلیم میں تبدیلیاں آرہی تھیں اور لڑکیوں اور لڑکوں کے لئے بعض اوقات یکساں نصاب وضع کرلیا جاتا تھا۔ جیسا کہ مذاہب کی تاریخ دان کانسٹینس پاروے لکھتی ہے ''پہلی صدی عیسوی میں رومن ایمپائر کے اندر بہت سی عورتیں تعلیم یافتہ تھیں اور بعض انتہائی بااثر تھیں اور پبلک لائف میں اپنی آزادی کو بھرپور طریقے سے کام میں لاتی تھیں''۔ (۲۸) پھر بھی قانونی بندشیں موجود تھیں، رومن عورتوں کو مرد محافظ رکھنے پڑتے تھے اور انہیں ووٹ دینے کا حق کبھی حاصل نہیں رہا۔ لیکن بالائی طبقوں کی عورتیں بڑی تعداد

MashalBooks.org

عوامی زندگی میں حصہ لے رہی تھیں۔ بعض آرٹس کے شعبے میں گئیں اور بعض میڈیسن، بعض تجارت، قانون، انصاف سماجی سرگرمیوں، اتھلیٹکس، تھیٹر، اور کنسرٹس میں حصہ لیتی تھیں جبکہ بعض مرد محافظوں کے بغیر بھی سفر کرنے کی مجاز تھیں۔ (۲۹) بہ الفاظ دیگر جیسا کہ پاروے اور پیجلز دونوں لکھتی ہیں، اس پیریڈ میں ''آزادیٔ'' نسواں کی ایک تحریک چل رہی تھی۔

''اینڈروکریٹک'' (مردانہ) نظام کے لئے دوسرے کئی چیلنج تھے، مثلاً غلاموں کی بغاوتیں اور دور افتادہ صوبوں کی بغاوتیں۔ بار کوخبا (۱۳۲۔۱۳۵ عیسوی) کی زیر قیادت یہودیوں کی بغاوت جو کہ جوڑیا کے خاتمے کا اعلان تھی (۳۰) مگر جونہی اینڈروکریسی کی طاقت پر مبنی نظامِ مراتب کو چیلنج کیا گیا اور جونہی ابتدائی عیسائیوں نے عدم تشدد کے نعرے بلند کر کے رحم دلی اور امن کی تبلیغ شروع کی، روم اور بھی زیادہ پُر تشدد اور استبدادی ملک بن گیا۔

جب شہنشاہوں (بشمول مسیحی کانسٹینٹائن کے) کی زیادتیاں بہت بڑھ گئیں جن کی گواہی رومن ایمپائر کے مشہور خونی سرکس دیتے تھے اس خونریز تسلط پر مبنی معاشرے کے لئے نسوانی نظام یعنی گائلینک چیلنج فیل ہو گیا۔ درحقیقت خود عیسائیت کے اندر گائیلنی کامیاب ہوتے دکھائی نہیں دے رہی تھی۔

رائے عامہ کی نااستواری

پیجلز کہتی ہے ''عیسائی عورتوں کی سابقہ پبلک سرگرمیوں کے باوجود، ۲۰۰ عیسوی میں مسیحی معاشروں کی اکثریت نے ٹیمتھس کے جعلی پال سے منسوب خط کو جائز قانونی حیثیت دے دی جس میں پال کے نظریات میں شامل نسواں دشمن عنصر پر (بلکہ کچھ مبالغے کے ساتھ) زور دیا گیا: 'عورت کو خاموشی سے، پوری اطاعت کے ساتھ سیکھنے دو۔ میں کسی عورت کو مردوں کو درس دینے یا ان پر تفوق جمانے کی اجازت نہیں دیتا۔ اس کا کام خاموش رہنا ہے...... دوسری صدی کے اواخر تک عبادت میں عورت کی شرکت کی واضح طور پر مذمت کر دی گئی: ایسے گروہ جن میں عورتوں کی قیادت بدستور جاری تھی وہ کافرانہ قرار دے دیئے گئے'' (۳۱)

جیسا کہ پیجلز مزید لکھتی ہے ''جو کوئی بھی مسیحیت کی ابتدائی تاریخ کی تفتیش کرتا ہے

(اس شعبے کو قرونِ اولیٰ کے مسیحی علما کی تاریخ کہا جاتا ہے) اسے اس عبارت کو پڑھنے کے لئے تیار رہنا چاہیے جو تھامس کی انجیل کے آخری حصے میں ہے: سائمن پیٹر نے ان (شاگردوں) سے کہا: میری ہمیں چھوڑنا چاہتی ہے تو اسے ایسا کرنے دو، کیونکہ عورتیں زندہ رہنے کی اہل ہی نہیں۔ یسوع نے کہا میں اسے مرد بننے کی راہ خود دکھادوں گا تاکہ وہ بھی ایک زندہ روح بن سکے اور تم سے مماثل ہوجائے کیونکہ ہر عورت جو اپنے آپ کو مرد بنائے گی، آسمان کی بادشاہت میں داخل ہوجائے گی''(۳۲)

اس طرح انسانیت کے نصف حصے کو یکبارگی انسان کے طور پر زندگی گزارنے کی اہلیت سے خارج کردیا گیا۔ یہ بات صرف مردانہ جبر کے اس ڈھانچے کے سیاق وسباق میں ہی سمجھ میں آسکتی ہے جو اب تعمیر ہونے جارہا تھا۔ اس سے اس امر کی تصدیق میں مدد ملتی ہے جسے دلی طور پر تو ہم سب سمجھتے ہیں لیکن واضح طور پر اس کی نشاندہی نہیں کرسکتے کہ معاملہ کیا تھا: ہوا یہ تھا کہ عیسائیت سے اس کی اصل کتاب انجیلِ محبت کے سلسلے میں ہی کوئی غلطی ہوگئی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ایسی انجیل کو تمام اذیتوں، فتوحات اور ان خون ریزیوں کا جواز پیش کرنے کے لئے کیسے استعمال کیا جاسکتا تھا، یہ وہ مظالم تھے جو خود عبادت گزار مسیحیوں نے دوسروں پر کئے اور آپس میں ایک دوسرے سے بھی کئے، ہمارے مغرب کی بہت سی تاریخ انہی مظالم سے عبارت ہے؟

چونکہ آخری مغربی دنیا کے نظاموں میں غیر متوقع اور ناقابل پیشگوئی تبدیلیاں ہوئیں، روم کی کلاسیکی دنیا میں شکست وریخت کے باعث ایک نئے عہد نے جنم لے لیا، جو چیز ایک ادنیٰ مسلکی اسرار کے طور پر پیدا ہوئی وہ مغرب کا نیا مذہب بن گئی لیکن اگرچہ اس کا مسلسل ملنے والا پیغام اپنی ذات اور معاشرہ، دونوں میں تبدیلی لانے کا پیغام تھا مگر معاشرے کو تبدیل کرنے کی بجائے یہ ''مضافاتی حملہ آور'' خود تبدیل ہوگیا۔ چنانچہ سابقہ نظاموں کی طرح مسیحیت بھی ایک مردانہ یعنی اینڈروکریٹک مذہب بن گئی اور اب تک کے مذاہب سے زیادہ مردانہ بن گئی اور رومن ایمپائر کی جگہ مقدس رومن ایمپائر نے لے لی۔

۲۰۰ عیسوی آنے سے پہلے ہی اس مثالی کیس میں روحانیت اپنے سر کے بل کھڑی ہوگئی اور عیسائیت اس راستے پر تیزی سے گامزن ہوگئی جہاں سے اس نے پوری طرح درجہ بندی اور تشدد پر مبنی نظام مراتب بننا تھا، ویسا ہی نظام جس کے خلاف یسوع نے علم بغاوت

بلند کیا تھا اور شہنشاہ کانسٹیٹائن کے عیسائی بن جانے کے بعد یہ ایک سرکاری اسلحہ بن گئی یعنی ریاست کی ملازمہ بن گئی۔ جیسا کہ پیجلز لکھتی ہے جب ''عیسائیت چوتھی صدی میں سرکاری طور پر منظور شدہ مذہب بن گئی، مسیحی بشپ جو پہلے پولیس تشدد کا نشانہ بنتے تھے، اب وہ اس تشدّد کی کمان کرنے لگے۔ (۳۳)

مسیحی تواریخ کی روشنی میں، کہا جاتا ہے کہ ۳۱۲ء میں جب کانسٹیٹائن نے اپنے حریف میکنٹیئس کو شکست دے کر قتل کر دینے اور پھر اپنی بادشاہت کا اعلان کرنے سے ایک دن قبل ڈوبتے ہوئے سورج کی روشنی میں خدا کی طرف سے دکھایا ہوا ایک خواب دیکھا، کہ آسمان پر ایک صلیب اُبھری جس پر لکھا تھا ''اس نشان میں تم فاتح ہوگے'' ایک ایسی بات جسے عیسائی مؤرخین عموماً ضابطۂ تحریر میں لانے میں ناکام رہتے ہیں، اس کو یوں بیان کیا گیا ہے اس اولین عیسائی شہنشاہ نے اپنی بیوی فاسٹا کو زندہ ابلتے پانی میں ڈال کر ہلاک کرادیا اور اپنے بیٹے کرسپس کے قتل کا حکم دے دیا تھا۔ (۳۴) لیکن یورپ کے مسیحیت قبول کرنے پر جبر وتشدد اور خون کی ندیاں بہائے جانے کا جو دور شروع ہوا وہ کانسٹیٹائن کے نجی اقدامات تک محدود نہیں رہا تھا اور نہ اس کے اور اس کے جانشینوں کے سرکاری اقدامات اور ان شاہی فرمانوں تک محدود رہے کہ اب سے چرچ کے عقائد کے منافی خیالات کو دغابازی سمجھا جائے گا جس کی سزا سخت اذیّت اور موت ہوگی۔

اب یہ ایک مقررہ طریق کار بن گیا کہ جو لوگ اس نئے حکم کو نہ مانتے چرچ کے حکام خود ہی ان کو اذیتیں پہنچاتے اور سزائے موت دید یتے۔ (۳۵) اور یہ بھی ایک مقررہ طریقہ تھا کہ ''کفریہ'' کلمات جو آگے چل کر مردانہ نظام مراتب کے لئے خطرہ بن سکتے ہوں، انہیں سختی سے کچل دیا جائے۔

نیک روحیں جن کی کبھی ماں اور کبھی باپ کی شکل میں پرستش کی جاتی تھی اب ان کی جگہ واضح طور پر مذکر خدا نے لی اور جیسا کہ یورپ پال ششم دوہزار سال بعد بھی اپنا اثرورسوخ استعمال کر رہا تھا عورتوں کو پادری کے منصب کے لئے نااہل قرار دے دیا گیا ''کیونکہ ہمارا خدا ایک مرد تھا'' (۳۶) اس کے ساتھ ساتھ غناسطی اناجیل اور ان جیسے دیگر متون جو مسیحی عہد شروع ہونے سے اب تک آزادی سے پھیلائے جا رہے تھے، کافرانہ قرار دے کر تلف کر دیئے گئے۔ یہ کام ان لوگوں کے ہاتھوں ہوا جو خود کو راسخ العقیدہ کہتے اور

واحد جائز چرچ کہلاتے تھے۔

جیسا کہ پیجلز لکھتی ہے ''یہ تمام منابع (خفیہ اناجیل، الہامات اور صوفیانہ تعلیمات) ان صحائف میں سے ہیں جو اس منتخب فہرست میں شامل نہیں ہیں جنہیں عہد نامۂ جدید کا مجموعہ کہاجاتا ہے......ان خفیہ متون میں سے ہرایک کو جسے غناسطی گروپس احترام کی نگاہ سے دیکھتے تھے مسلمہ کلیسائی مجموعے میں سے حذف کردیا گیا اور متذکرہ بالا راسخ العقیدہ مسیحیوں کی نظر میں وہ کفر قرار پا گیا۔ اور جب مختلف تحریروں کی اسی طرح کی چھان پھٹک کا عمل پایۂ تکمیل کو پہنچا وہ غالبًا ۲۰۰ عیسوی کا سال تھا، خدا کے لئے استعمال ہونے والی ساری کی ساری شبیہات راسخ العقیدگی کی روایت میں سے غائب ہوچکی تھیں'' (۳۷)

عیسائیوں کی طرف سے ان عیسائیوں پر کفر کی چھاپ لگانا جو مساوات پر ایمان رکھتے تھے اس بنا پر خاص طور پر قابل فضیحت ہے کہ ابتدائی حواریوں کے معاشروں میں عورتیں اور مرد یسوع کے احکامات کے مطابق مل جل کر رہتے اور اکٹھے کام کرتے تھے۔ ان کے مابین بھائی بہنوں جیسے تعلقات تھے۔ یہ اس وقت اور بھی زیادہ قابل فضیحت بات نظر آتی ہے اگر ہم اس بات پر غور کریں کہ یہ اکٹھے رہنے والے اور ہاتھ سے ہاتھ ملا کر کام کرنے والی عورتیں اور مرد وہ لوگ تھے جو مسیحی شہدا کے طور اگلے جہاں سدھار گئے تھے۔ مگر ان مردوں کے لئے، جو ہر جگہ عیسائیت کو اپنی حکمرانی قائم کرنے کا ذریعہ بنا رہے تھے، مسیحی زندگی اور مسیحی آئیڈیالوجی کو مردانہ سانچے میں ڈھالنا ہی سب سے بڑا کام رہ گیا تھا۔

جوں جوں سال گزرتے رہے یورپ کے لادینوں کو مشرف بہ عیسائیت کرنا، تسلط کے نظام کو ایک بار پھر مضبوطی سے بحال کرنے کا ایک بہانہ بنالیا گیا، یہ وہی نظام ہے جس میں صرف طاقت معیارِ حق ہوتی ہے۔ اس کے لئے نہ صرف مخالفین کو شکست دینا اور ان لوگوں کو مذہب کی تبدیلی پر مجبور کرنا شامل تھا جو سرکاری عیسائیت میں داخل نہیں ہونا چاہتے تھے بلکہ اس میں یہ بھی شامل تھا کہ مشرکین کی عبادت گاہیں، خانقاہیں اور ''بُت'' توڑ دیئے جائیں اور وہ قدیم یونانی اکیڈمیاں بھی بند کردی جائیں جہاں ''زندیقانہ'' انکوائری کا اب تک انعقاد ہوتا آرہا تھا۔ کلیسا کی طرف سے ''اخلاقی'' طاقت پر مبنی حق کی جانچ پڑتال اتنی کامیاب تھی کہ ایک ہزار سال سے زائد عرصہ بعد نشاۃ ثانیہ تک جس فنکارانہ تخیل یا تجربی علم کے شغل کو کلیسا کی ''برکت'' حاصل نہ ہوتی وہ یورپ میں عملاً مفقود ہوتا تھا۔ تمام بچے کھچے

علم کو اتنے منظّم طریقے سے تباہ کرنے کی مہم چلائی گئی کہ اندرون یورپ کتابوں کو نذر آتش کرنے کے بعد یورپ سے باہر بھی، جہاں تک بھی مسیحی اتھارٹی کا ہاتھ پہنچ سکتا تھا، علمی ذخیرے تلف کرادیئے گئے۔

اس طرح ۳۹۱ عیسوی میں تھیوڈوسیس ''I'' کے زمانے میں مرد کی بالادستی کے علمبردار عیسائیوں نے سکندریہ کے عظیم الشان کتب خانے کو جلا کر راکھ کردیا جو کہ قدیم دانش وحکمت کے آخری ذخیروں میں سے ایک تھا۔ (۳۸) ان لوگوں کو سینٹ سرل کی تائید وحمایت حاصل تھی جسے بعد میں بشپ آف الیگزینڈریا کا منصب ملنے والا تھا۔ عیسائی راہبوں کے ایک ہجوم نے ایک ممتاز ریاضی دان، فلکیات دان اور فلاسفر ہائپٹیا(Hypatia) کو صدفیہ / کستورا کے خولوں سے مارمار ہلاک کردیا۔ یہ سکندریہ کے سکول آف نیوپلیٹونیک فلاسفی میں بلند علمی منصب پر فائز تھی کیونکہ یہ سینٹ سرل کے خیال میں ایک سیاہ کار عورت تھی جس نے خدا کے احکامات کی خلاف ورزی کرتے ہوئے مردوں کو پڑھانے کی جسارت کی تھی۔ (۳۹)

سرکاری طور پر منظور شدہ تحریروں میں پال کے اذعانی اصولوں میں حتمی طور پر کہا گیا ہے کہ عورتیں اور تمام چیزیں جن پر عورت کا لیبل ہو گھٹیا اور خطرناک ہوتی ہیں لہٰذا ان پر سختی سے کنٹرول کیاجانا چاہیے اس میں پھر بھی چند مستثنیات تھیں، بالخصوص کلیمنٹ آف الیگزینڈریا جس کا اصرار تھا کہ خدا میں مذکر ومونث، دونوں خصوصیات ہیں۔ اس نے لکھا کہ ''انسانیت کا نام مرد اور عورت دونوں میں مشترک ہے۔ (۴۰) لیکن اصل میں یسوع نے انسانی تعلقات کا جو ماڈل تجویز کیا، اس میں کہا گیا تھا کہ مردوعورت، دولتمند اور غریب یہودی اور غیر یہودی، سب برابر ہیں۔ اسے تمام نظریات میں سے اور آرتھوڈاکس کرسچین چرچ کے روزمرہ کی معمولات میں سے حذف کردیا گیا۔

ممکن ہے کہ نئے آرتھوڈاکس چرچ کے معاملات کے منتظمین رسوم کلیسا کے دوران قدیم جام کو اب عشائے ربانی کے شراب کے پیالے کے طور پر مسیح کے علامتی خون سے بھرا ہوا اٹھائیں لیکن درحقیقت سب چیزوں پر ایک بار پھر خنجر سایہ فگن ہے۔ کلیسا اور حکمران طبقے کے اتحاد کی تلوار اور آگ کی زد میں صرف آفتاب پرستوں جیسے ملحدین ومشرکین، یہودی یا ایلیوسس اور ڈیلفی کے پُراسرار مذاہب کے عقیدت مند ہی نہ آئیں بلکہ کوئی عیسائی بھی آجائے جو سرِ اطاعت خم کرنے سے صاف صاف انکار کردے۔ وہ اب بھی یہی دعویٰ رکھتے

ہیں کہ ان کا مقصد یسوع کی انجیلِ محبت پھیلانا ہے لیکن وہ اپنی صلیبوں کی وحشت وبربریت، بے گناہوں کو پھنسانے کے طور طریقوں، مذہبی عدالتوں، کتابوں کو نذر آتش کرنے اور انسانوں کو زندہ جلانے کے ذریعے محبت نہیں پھیلاتے بلکہ ان کا جبر واستبداد ان کی تباہ کاریاں اور موت کے پرانے، مردانہ حربوں کی یادیں تازہ کررہے ہیں۔

اور اس طرح طنزیہ طور پر یسوع کا انقلابِ عدم تشدد، جس کے دوران اس نے صلیب پر موت پائی قوت اور دہشت پر مبنی انداز حکمرانی میں تبدیل ہوگیا۔ جیسا کہ نامور تاریخ دانوں وِل ڈیورانٹ اور ایریل ڈورانٹ نے لکھا ہے یسوع کی تعلیمات مسخ ہوجانے کی وجہ سے عہد متوسط کی عیسائیت درحقیقت اخلاقی پستیوں کی گہرائی میں گرگئی تھی، یہ اب سختی سے جمے ہوئے مردانہ تسلط کے لئے کوئی خطرہ نہیں رہی تھی بلکہ کرۂ ارض پر پائے جانے والے دیگر مذاہب کی طرح، جو روحانی روشن خیالی اور آزادی کے علمبردار بنے ہوئے تھے، یہ بھی اسی نظام کو دوام بخشنے کا ایک ذریعہ بن گئی۔

تاہم ''اینڈروکریسی'' (مردانہ جبر پر مبنی نظام) کے خلاف ''گائیلنی'' (خواتین کی حق رسی) کی جدوجہد ختم ہونے سے کوسوں دور ہے۔ اینڈروکریٹک مسیحیت کی صدیوں پر محیط تاریکیوں کے دوران (اور اس کے نام پر حکمرانی کرنے والے مطلق العنان بادشاہوں اور پوپوں کے زمانے میں) کسی نہ کسی مقام پر اور کسی نہ کسی زمانے میں گائیلنک جذبوں کا اظہار ہوتا رہا، اور یہ اب بھی اپنے بل بوتے پر ثقافتی ارتقا کو نئے سرے سے آگے بڑھا کر دم لیں گے۔ جیسا کہ ہم اگلے ابواب میں دیکھیں گے کہ یہ پیہم جاری جدوجہد ایک بڑی غیرمرئی قوت کے طور پر مغرب کی تاریخ پر اثرانداز ہوتی رہی ہے اور اب ہمارے دور میں بھی سامنے آرہی ہے۔

باب 10

نقوشِ ماضی: نسوانیت اور تاریخ

بیشتر سکولوں میں پڑھائی جانے والی تاریخ زیادہ تر جنگِ اقتدار کی کہانی ہوتی ہے جو مردوں اور قوموں کے درمیان لڑی گئی ہے۔ مثلاً کون کون سی جنگیں کن کن سالوں مہینوں اور دنوں میں لڑی گئیں، ان میں حصہ لینے والے بادشاہوں اور جرنیلوں کے کیا کیا نام تھے، یا انہوں نے کون کون سے قلعے، محلات اور مذہبی یادگاریں تعمیر کیں یا ان کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ لیکن اگر ہم تاریخ پر ان نئی معلومات کی روشنی میں نظر ڈالیں جن پر ہم نے غور کیا اور جس نئے نظریاتی فریم ورک کو آگے بڑھایا تو ایک بالکل مختلف قسم کشمکش سامنے آتی ہے۔ اب ان تمام خون آشام واقعات کی تاریخوں اور ناموں کے پیچھے وہی طریقِ عمل کارفرما ہے جس کا مطالعہ الیا پریگوجین (Ilya Prigogine)، ازابیل سٹنجرز (Isabel Stengers)، ایڈورڈ لورنز (Edward Lorenz) اور رالف ابراہم (Ralph Abraham) جیسے سائنسدان دنیائے فطرت میں کررہے ہیں۔ [۱] یہ طریق عمل کہیں محض ایک تغیر یا الل ٹپ حرکت کی صورت میں ہوتا ہے کہیں تھرتھراہٹ یا چکردار حرکت میں ہوتا ہے اور کہیں کسی نازک موڑ پر نظاموں کی دوشاخہ تقسیم کی صورت میں ہوتا ہے۔ اس تقسیم کا ذکر کرتے ہوئے پریگوجین اور سٹنجرز لکھتی ہیں یہ وہ مقام ہوتا ہے جہاں نظام ایک سے زائد امکاناتِ مستقبل کا انتخاب کرسکتا ہے۔ [۲]

اس کی ظاہری سطح پر نظر ڈالی جائے تو اوّلاً ہمیں تاریخ کے مختلف ادوار میں واقع ہونے

MashaiBooks.org

والے تغیرات کا جائزہ لینا ہوگا۔ جنگ سے ہوتے ہوئے نسبتاً کچھ پُرامن حالات تک، مطلق العنانیت سے آتے ہوئے قدرے آزادیٔ عمل ملنے تک، اُس زمانے سے لے کر جب عورتیں بہت زیادہ دبا دی گئی تھیں آج تک، جب کم ازکم کچھ عورتوں کو وسیع مواقع میسر آ چکے ہیں، ایک روایتی مؤرخ کے لئے اس قسم کے تغیرات اپنے اندر کوئی سامانِ حیرت نہیں رکھتے۔ وہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ موجود ہے، وہ بس موجود ہے۔ اس کے اندر ضروری نہیں کہ کوئی بڑے معنی پائے جاتے ہوں۔

کیا یہ واقعی کوئی الل ٹپ اور انوکھی تحریک ہے؟ اگر ہم زیادہ گہرائی میں جا کر دیکھیں تو پتہ چلے گا کہ ایسے تاریخی تغیرات کے کئی نمونے موجود ہیں جس تناظر میں ہم آگے بڑھ رہے ہیں اس سے معلوم ہوسکتا ہے کہ جنگوں کے جو زمانے ہوتے ہیں وہ عموماً شدید قسم کے استبداد کے زمانے بھی ہوتے ہیں۔ زیادہ پُرامن ادوار اور زیادہ مساوات کے ادوار بھی ہوتے ہیں، اور ہوسکتا ہے کہ وہ ثقافتی ارتقا اور اعلیٰ درجے کی تخلیقیت کے ادوار بھی ہوں۔ اگر ہم مزید گہرائی میں جائیں تو متدائرارتعاش (oscillation in cycles) بھی واضح طور پر دکھائی دینے لگتے ہیں۔ مزید برآں یہ بھی نظر آجاتا ہے کہ ان دوری حرکات کے پیچھے ایک زبردست قوتِ متحرکہ کارفرما ہے۔ جس کو اب تک محض سرسری طور پر دیکھا یا محسوس کیا جاتا رہا ہے۔

اگر ہم تاریخ پر نظریۂ کلیت کے تناظر میں نگاہ ڈالیں اور انسانیت کے دونوں نصفوں اور اپنے ثقافتی ارتقا کے پورے دور کا جائزہ لیں تو ہم دیکھ سکیں گے کہ یہ متدائر نقوش اس بنیادی تقلیب سے، جس کا ہم نے پیچھے ذکر کیا تھا، کس قدر مربوط ہیں۔ ہمارے زمانہ قبل از تاریخ میں نظاموں کی تبدیلی نے ہمیں ثقافتی ارتقا کے بالکل ایک مختلف راستے پر ڈال دیا ہے۔ اگر ہم نظامِ شراکت سے نظامِ تسلّط میں تبدیلی کے بعد رونما ہونے والے واقعات کو نظاموں کے استحکام اور ان کے تغیر کے ان اصولوں کی روشنی میں دیکھیں جو قدرتی سائنسز نے دریافت کئے ہیں، تو ریکارڈ شدہ تاریخ ایک نئی وضاحت اور ایک نئی پیچیدگی بھی اختیار کرلے گی۔

نظاموں کی حرکیات کا مطالعہ کرنے والے ریاضی دان ایک اصطلاح ''کشش انگیز'' (attractors) استعمال کرتے ہیں جو اندازاً مقناطیس کے مماثل ہوتے ہیں۔ یہ ایک ''نقطہ'' یا

''ساکن''، کشش انگیز ہوتے ہیں، یہ حالتِ توازن میں موجود نظاموں کی حرکات کو اپنے تابع رکھتے ہیں جبکہ میعادی کشش انگیز(periodic attractors)، متدائر حرکات کو اپنے تابع رکھتے ہیں اور ''اجنبی'' کشش انگیز(chaotic or strange attractors) حالتِ عدم توازن یا حالتِ بعیدازتوازن کی خصوصیت ہوتے ہیں۔ (۳) یہ اجنبی یا حالتِ بدنظمی کے کشش انگیز جو کسی قدر ''گاوَلڈ'' اور ''ایلڈرج'' کے peripheral isolate کی طرح ہوتے ہیں بعض اوقات نہایت تیز رفتاری سے اور انتہائی غیرمتوقع طور پر بالکل نئے نظام کی تعمیر کے لئے ''مرکزوں'' (nuclei) کی شکل اختیار کر لیتے ہیں۔ لیکن یہ کسی وقت تدریجی یا ''لطیف'' تقلیب(transformations) بھی ہوسکتی ہے اور ایسا اس صورت میں ہوتا ہے جب point attractors اپنی کششِ جاذبہ کسی قدر کھودیں یا میعادی کشش انگیز بہت زیادہ جاذب ہوجائیں۔

اسی طرح ''الیاپریگوجین'' اور ''ازابیل سٹنجرز'' ان تغیرات(fluctuation) کا ذکر کرتی ہیں جو کسی نظام کے چھوٹے سے حصے میں محدود ہوتے ہیں۔ اگر نظام مستحکم ہے تو ان تغیرات کی نئی فعالیت یا اثرانگیزی باقی نہیں رہے گی۔ لیکن اگر یہ ''نئی راہیں نکالنے والے'' (متجدّد) کافی حد تک تیزی سے پھلنے پھولنے لگیں تو سارا نظامِ کارکردگی کی نئی شکل اختیار کرسکتا ہے۔ (۵) بہ الفاظ دیگر اگر تغیرات اس حد سے متجاوز ہوجائیں جسے ''الیاپریگوجین'' اور ''ازابیل سٹنجرز'' نے ''تشکیل مرکزہ کی دہلیز'' قرار دیا ہے تو وہ ''پورے نظام کے اندر پھیل جائیں گے''۔ جوں جوں یہ ابتدائی چھوٹے چھوٹے تغیرات بڑھتے بڑھتے فیصلہ کن ''نقاطِ تقسیم'' پر پہنچتے جاتے ہیں تو نظاموں کی تقالیب کے ممکنہ راستے کھلتے جاتے ہیں۔ جب معاملہ نقاطِ تقسیم پر آپہنچتا ہے تو یہ ''جبریت یا تعیینی خصوصیت'' ٹوٹ جاتی ہے اور اس وقت یہ پیشگوئی کرنا ممکن نہیں رہتا کہ ''شاخ'' یا کون سے ''مستقبل'' کا راستہ اختیار کیا جائے گا۔ (۶)

ہم ان معاشرتی تعاملات(social processes) یا ان فطری تعاملات کے مشاہدات کا اطلاق کس طرح کریں؟ صاف ظاہر ہے کہ کیمیاوی، حیاتیاتی اور معاشرتی تعاملات میں اہم نوعیت کا فرق وامتیاز ہوتا ہے۔ ان میں نہ صرف بہت زیادہ پیچیدگی بلکہ بہت زیادہ عنصرِ انتخاب(element choice) ہوتا ہے۔ تاہم معاشرتی تعاملات میں جو کچھ رونما ہوتا ہے اسے لازماً کم کر کے تنظیم کی سادہ سطحوں پر لاگو کرنے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے۔ اگر ہم تمام

زندہ اجسام کا بنظرِ غائر جائزہ لیں تو استحکام اور تغیر، دونوں حالات پر حکمرانی کرنے والے نقوش کا حیرت انگیز حد تک متشاکل ہونا صاف ظاہر ہوجاتا ہے۔ اگر ہم تاریخ کو ان نئے نئے نمودار ہونے والے نظاموں اور ان کے تغیرات کے حرکیاتی تناظر میں دیکھیں تو ہم ثقافتی تقلیب کا نیا نظریہ وضع کرنے کی کوشش کرسکتے ہیں، یا زیادہ تخصیص کے ساتھ ہم مردوزن کے غلبے کے نظاموں میں ردّوبدل کے اثرات کا بہتر طور پر جائزہ لے سکتے ہیں۔

ریکارڈ شدہ تاریخ میں اٹھنے والی واقعاتی لہروں کو بے تکی سمجھ کر نظرانداز کرنے کی بجائے انہیں مروّجہ مردانہ نظام میں اس گردشی تحریک کا اظہار سمجھا جانا چاہیے جو سماجی تنظیم کے شراکتی ماڈل کی ''کشش انگیزیوں'' کی جانب رُخ کئے ہوئے ہے۔ ساختیاتی ڈھانچے کی سطح پر اس کا اظہار انسانوں کے باہمی تعلقات کے نظم وربط میں وقتاً فوقتاً پڑنے والے تغیرات سے ہوتا ہے، خاص طور پر اس کی عکاسی انسانیت کے دونوں نصفوں کے باہمی تعلقات میں ردّ وبدل میں ہوتی ہے۔ اقدار کی سطح پر یہ (ادب سے لے کر معاشرتی پالیسیوں تک، ہر چیز میں) گھسی پٹی سخت گیر ''مردانہ'' اقدار (جن کی علامت خنجر ہے) اور گھسی پٹی نرم وملائم ''نسوانی'' اقدار (جن کی علامت جام ہے) کے مابین مختلف اوقات میں ہونے والی کشمکش میں دکھائی دیتی ہے۔

مزید برآں ان تاریخی حرکیات کو وسیع ارتقائی تناظر میں بھی دیکھا جاسکتا ہے جیسا کہ ہم پچھلے ابواب میں ذکر کرچکے ہیں کہ انسانی تہذیب کے تشکیلی برسوں کے دوران ہماری انواع کا اصل ثقافتی رُخ اس سمت میں تھا جسے ہم ابتدائی شراکتی یا حامیٔ زن(protogylanic) معاشرہ کہہ سکتے ہیں۔ ہمارے ثقافتی ارتقا کا روپ ابتدائی طور پر اسی نمونے (ماڈل) کی عطا تھا جس نے اپنا ابتدائی عروج کریٹ کے بے حد تخلیقی کلچر میں پایا۔ پھر ایک شدید عدم توازن یا انتشار کا دور آگیا۔ بعد میں معاشرہ ایک کے بعد ایک یلغار کی زد میں آتا چلا گیا۔ پھر قلم اور تلوار کی قوتیں باری باری طاقت پکڑتی رہیں۔ مردانہ نظام پہلے بطور ایک قوتِ انتشار اور بعد میں بطور ایک قوتِ جمود مغربی تہذیب کے مختلف مرحلوں میں نمودار ہوتا رہا۔ لیکن ساری ریکارڈ شدہ تاریخ میں اور بالخصوص معاشرتی عدم استحکام کے ادوار میں نسوانی (gylanic) ماڈل ایک کمزور مگر بطور ایک مستقل کشش کے، وقتاً فوقتاً رونما ہوتا رہا ہے۔ یہ ایک پودے کی مانند قتل ہونے سے انکاری رہا ہے، خواہ اسے کتنی بار کچلا جائے، یا کاٹا

جائے۔ ہم تاریخ کے حوالوں سے بتائیں گے کہ نسوانیت(gylany)روئے زمین پر بار بار اپنے لئے مقام بناتی رہی ہے۔

''نسوانیت'' بطور ایک تاریخی قوت

تاریخ کا یہ تصور کہ یہ متصادم قوتوں کی ایک ''جدلیاتی تحریک'' ہے ہیگل، مارکس اور دیگر مؤرخین کے تجزیات کا ماحاصل ہے جبکہ آرنلڈ ٹوائن بی، آسوالڈ سپنگلر، آرتھر شلسنگر اور دیگر مؤرخوں نے ''ادوارِ تاریخ'' کا نظریہ پیش کیا ہے۔ (۷) تاہم مردوں کی لکھی ہوئی تاریخ کی کتابوں میں جانے بوجھے طور پر نسوانی عروج(gylanic ascendancy)اور مردانہ رجعت (androcratic regression) کے طاقتور ادل بدل کا کوئی ذکر نہیں ملتا لہٰذا اس دوری ادل بدل کو سمجھنے کے لئے ہمیں غیر روایتی مؤرخین کی کتابوں کی طرف رجوع کرنا ہوگا۔ ادوار کے اس ادل بدل کو سمجھنا اب اس لئے زیادہ ضروری ہوگیا ہے کہ امن کا ایک بار پھر جنگ میں بدلنا ہمارا آخری دور ہوسکتا ہے۔

ایسا ایک غیر روایتی مؤرخ ہنری ایڈمز ہے۔ اگرچہ وہ بعض پہلوؤں سے تصور پرست ہے اور بنیادی طور پر قدامت پسند اور محتاط شخص ہے مگر اس کا اصرار ہے کہ ہمیں لازماً قدیم اور زیادہ مذہبی اقدار کی طرف واپس جانا چاہیے۔ لیکن اگر ہم ایڈمز کی تحریروں کی سطح سے نیچے جائیں تو پتہ چلتا ہے کہ وہ تاریخ کی ایک طاقتور اور روایتاً نظر انداز کی گئی ''نسوانی'' قوت کا قدر شناس ہے۔ ایڈمز کا دعویٰ ہے کہ ''جنس کی تحریک کو سمجھنے کے بغیر تاریخ محض ایک نمودِ علمیت رہ جاتی ہے۔ اس نے امریکی تاریخ پر تنقید کرتے ہوئے کہا کہ اس میں بمشکل ہی کہیں عورت کا نام پایا جاتا ہے۔ برطانوی تاریخ پر اس کی تنقید یہ ہے کہ اس میں عورت کا ذکر اس قدر ہچکچاہٹ سے کیا گیا ہے جیسے کہ وہ کوئی عجیب اور ناقابلِ بیان نوعِ انسانی ہو۔ (۸) درحقیقت ایڈمز کے تجزیئے میں اصل زور اس امر پر تھا کہ مغربی تاریخ میں تمدنی قوت کنواری رہنے کے عہد پر کاربند مذہبی عورت تھی۔ اس نے لکھا کہ ''دنیا بھر کی بھاپ بھی اس کنواری کی طرح شہر ''شارترے(Chartres) کی تعمیر نہیں کرسکتی تھی تاہم یہ کنواری مغربی دنیا کی ''سب سے بڑی قوت رہی ہے جس نے خود کو محسوس کرایا ہے''۔ (۹) کنواری کی مثبت قوت کے مدمقابل ایک منفی اور تخریبی قوت، کرخت قوت تھی جسے ایڈمز نے

''ڈائنمو'' یا متشدّد اور عاری از احساسِ مروّت ٹیکنالوجی قرار دیا۔

ایڈمز نے اپنے مشاہدات کو جنس کے متعلق مردوں کے گھسے پٹے خیالات اور پُراسرار عمومیت کاری کے ملغوبے کی صورت میں پیش کیا۔لیکن اس میں سے جو کچھ ان حدبندیوں میں سے ماورا ہو کر باہر آتا ہے، دراصل وہی کشمکش ہے جسے ہم نے قوت کے دو نظریات کے طور پر بیان کیا ہے: ''اینڈروکریسی'' اور ''گائیلینی''، تسلّط ماڈل اور شراکت داری ماڈل یا خنجر اور جام کے مظاہر۔ درحقیقت ایڈمز کی کنواری اور ڈائنمو کی علامتیت جام اور خنجر کے بالکل قریب دو متوازی قوتیں ہیں۔ جام اور کنواری، دونوں ''نسوانی'' قوت کی علامات ہیں جو جنم دیتی اور پرورش کرتی ہیں۔ اور خنجر اور ڈائنمو جذبات سے عاری تباہ کن ٹیکنالوجی کی ''مذکر'' علامات ہیں۔

مردانہ اور زنانہ اقدار کے مابین کشمکش کی روشنی میں تاریخ کے تجزیئے کا اس سے بھی زیادہ نمایاں پیشرو اور نقیب G.Rattray Taylor ہے جس نے "Sex in History" میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ (۱۰) لیکن جیسے ایڈمز کا مسئلہ تھا ہمیں ٹیلر کے ''ڈیٹا'' کو استعمال کرتے ہوئے اس کے بیان کردہ حقائق کے پس منظر میں جانا چاہیے کہ وہ دراصل کیا کہنا چاہتا ہے۔ ویلہم ریک اور دیگر ماہرین نفسیات کے معروف نظریات (جو پدرسری معاشروں کو جنسی طور پر متشددانہ قرار دیتے تھے) کی پیروی کرتے ہوئے ٹیلر کہتا ہے کہ جس طرح تاریخ کی پینگیں جنسی آزادی اور جنسی جبر کے درمیان جھولتی رہی ہیں، اسی طرح ''آزاد''، ''زیادہ تخلیقی'' ''زیادہ استبدادانہ'' اور ''کم تخلیقی'' ادوار بھی آتے رہے ہیں۔ (۱۲) لیکن اس کی کتاب جو شہادتیں پیش کر رہی ہے وہ یہ ہے کہ ان گردشوں (cycles) کی تہہ میں جو اقدار پائی جاتی ہیں وہ کبھی ماں کے گرد گھومتی ہیں، اور کبھی باپ کے گرد گھومنے لگتی ہیں۔ جن کا حوالہ ٹیلر بطور "either mother-or father-identified" دیتا ہے۔ اس سے مراد اولاد کی ماں کے ذریعے یا باپ کے ذریعے شناخت ہے۔

ٹیلر نے matrism (شناخت بذریعہ ماں) اور patrism (شناخت بذریعہ باپ) کی اصطلاحیں اس لئے استعمال کیں کہ اس کے پاس اس چیز کے لئے الفاظ کم تھے جسے وہ دیکھ رہا تھا، ان دو اصطلاحوں کی تطبیق کم وبیش gylany اور androcracy سے ہو رہی ہے۔ Matrist ادوار وہ تھے جب عورتیں اور ''نسوانیت'' (جسے ٹیلر شناخت بذریعہ ماں کہتا ہے)

برتر حیثیت رکھتی تھیں۔ یہ ادوار خصوصیت کے ساتھ نسبتاً زیادہ تخلیقیت اور کمتر معاشرتی و جنسی جبر، نسبتاً زیادہ انفرادیت ومعاشرتی اصلاح کے زمانے ہوا کرتے تھے۔ اس کے برعکس Patrist ادوار وہ تھے جن میں عورتوں اور نسوانیت کی تذلیل زیادہ نمایاں تھی۔ یہ ادوار جب باپ ذریعۂ شناخت ہے مذکر اقدار ایک بار پھر مائل بہ عروج ہیں، اس میں معاشرتی اور جنسی جبر نمایاں تر ہو رہا ہے جبکہ تخلیقی فنون اور معاشرتی اصلاح کو اتنی اہمیت نہیں دی جا رہی جتنی کہ دی جانی چاہیے تھی۔ (۱۳)

ٹیلر جنوبی فرانس کے رئیسوں اور ان کی مطلوبہ حسیناؤں کی محبت کے عشقیہ گیتوں کے دور (گیارہویں تا تیرھویں صدی) کو ماں کے ذریعے شناخت یا "matrist" دور کو بطور نمونہ استعمال کرتا ہے جو کہ ہمارے نزدیک وہ نسوانیت کی نئی سرگرمیوں کا مظہر (gylanic resurgence) کا زمانہ تھا۔ یہ وہ دور تھا جب بارہویں صدی کی ایلینر آف ایکوئیٹین اور اس کی بیٹوں میریؔ اور ایلکسؔ کی عدالتوں سے عورتوں کے لئے محبت اور احترام پر مبنی فیصلے صادر ہوئے جو شاعری اور زندگی، کے لئے مرکزی خیال رہے۔ (۱۴) اس کا نظریۂ نسوانیت ایک طاقتور اور ذی وقار ہستی تھا نہ کہ مقہور اور مستحقِ جبر عورت کا۔ اس سے اظہار نفرت کا کہیں دور دور تک نشان نہ تھا۔ جبکہ مرد عزت مند اور شریف النفس ہستی تھا لیکن وہ جبر اور وحشیانہ پن کا مظہر ہرگز نہیں تھا۔ ان اقدار کی گونج ہمیں کریٹ اور جدید حجری، دونوں ادوار میں سنائی دیتی رہی۔ مگر ایک ایسے دور میں جس میں مردانہ وحشت وبربریت اور عیاشی ایک روایتی طرز عمل تھا، گیارہویں صدی سے تیرھویں صدی تک کے تصوراتِ شجاعت، شرافت اور رومانی محبت، جیسا کہ ٹیلر کہتا ہے حقیقتاً انقلابی تصورات تھے۔ ٹیلر نے اس دور کو "troubadour period" کہا ہے۔

ٹیلر اس بات کو بھی ثابت کرتا ہے کہ یہ دعویٰ کوئی حیثیت نہیں رکھتا کہ عہد ''ٹربیڈور'' کی نسوانی (یا اس کی اصطلاح کے مطابق، ماں کی وجہ سے شناخت کی) اقدار نے مغربی تاریخ کو انسانی اقدار سے روشناس کرایا اور اس پر بے پناہ اثرات مرتب کئے۔ اس نے کہا کہ یہ اقدار نہ صرف بہت بعد میں ایک حد تک اثرانداز ہوئیں (یہ صرف اس وقت فروغ پاتی ہیں ''جب matrists کو عروج حاصل تھا) حتیٰ کہ patrists نے بھی تسلیم کیا کہ کمزوروں، بچوں اور عورتوں کے ساتھ نرمی وشفقت کا سلوک صرف اس شرط پر ہوتا تھا کہ یہ عورتیں اس کے

اپنے طبقے سے ہوتیں۔(۱۶)

ٹیلر، ٹروبیڈورز کے بارے میں لکھتا ہے کہ ''یہ اختراع پسند اور روبہ ترقی لوگ تھے جنہیں علوم وفنون میں آگے بڑھنے میں بے حد دلچسپی تھی اور بعض اوقات سماجی اصلاحات کے لئے بھی زور دیتے تھے۔ وہ طاقت کے استعمال سے گریزاں اور خوش خوراکی اور خوش پوشی کے شوقین تھے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ Virgin Mary کا مجسمہ اپنے ایک خاص انداز میں کھڑا کرتے تھے۔ ان کی بہت سی نظموں میں اسے مخاطب کیا گیا ہے۔ اور ۱۱۴۰ء میں ''لی آن'' (Lyon) میں ایک نئی ضیافت متعارف کرائی گئی جس پہ سینٹ برنارڈ آف کلیرؤ ونے احتجاج کیا کہ یہ کلیسا کے رسم ورواج میں ایک اجنبی چیز ہے، اس کی روایت میں اجازت نہیں ہے۔ "feast of Immaculate conception" تھی۔ (یہ ایک عقیدہ تھا جس کا اعلان اس واقعہ کے سات سو برس بعد ۱۸۵۴ء میں کیا گیا کہ مریم عذرا کو خلقی گناہ، جنسی عمل سے پاک حمل ہوا تھا) (۱۷)

سینٹ برنارڈ کا یہ موقف بالکل بے بنیاد تھا کہ ایسی ماں کی پرستش کا کوئی روایتی جواز نہیں جس نے الوہی بچے کو جنم دیا ہے۔ مریم (میری) کی تعظیم وتکریم، قدیم دور کی دیوی پوجا کی طرف واپسی کی مظہر تھی اور کلیسا کی طرف سے مریم کی پوجا کی شدید مزاحمت نہ صرف اس قدیم مذہب کی اب تک باقی رہنے والی قوت کا خاموش اعتراف تھا بلکہ یہ "patrist" مزاحمت کا اظہار بھی تھا جو اُن "gylanic" اقدار کی حیاتِ نو تھی جس کا اظہار ''ٹروبیڈور'' تحریک کے ذریعے ہو رہا تھا۔

اگر ہم ٹیلر کی اصطلاحات "matrist" اور "patrist" کو اپنی اصطلاحات "gylanic" اور androcratic سے بدل ڈالیں تو عہد متوسط کی تاریخ میں جو چیز کافی حد تک ناقابل فہم دکھائی دیتی ہے وہ ایک خصوصی سیاسی معنی اختیار کر لیتی ہے۔ کلیسا کی طرف سے عورت کو موردِ ملامت، محکوم اور ''بے زبان'' رہنے کی جو حیثیت دی گئی تھی، اسے ایک ادنیٰ تاریخی راز کے طور پر نہیں دیکھا جانا چاہیے بلکہ اسے کلیسا کا ایک بنیادی اظہار مردانہ تسلط سمجھا جانا چاہیے۔ اگر مردانہ تسلط کے نظام اور عہد متوسط کے کلیسا کے اقتدار کو برقرار رکھنا مطلوب تھا تو عورت کو مطیع فرمان اور خاموش رکھنا یقیناً ایک لازمی امر تھا۔

عہد متوسط کی تاریخ کا ایک اور بصورت دیگر ناقابلِ توضیح پہلو ایک قابل فہم سیاسی معنی

اختیار کر جاتا ہے۔ یہ ہے کلیسا کی جانب سے عورت کی انتہائی تذلیل کا رویہ اختیار کرنا۔ "Hammer of witches" کے مصنف کے الفاظ میں ''عورت تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے'' (۱۸)

تاریخ کی بہت سی کتابوں میں کلیسا کے حکم پر وقفوں وقفوں سے جادوگر عورتوں کو اذیت ناک سزائیں دینے کی مہمات کا سرسری طور پر ذکر آتا ہے یہ مہمات صدیوں چلتی رہیں جن میں لاکھوں عورتوں کو جادوگرنی ہونے کا الزام لگا کر انتہائی وحشیانہ مظالم کا نشانہ بنایا گیا، یہاں تک کہ بعضوں کو ہلکی آنچ دے کر آہستہ آہستہ مرنے کے لئے چھوڑ دیا جاتا، تاکہ انہیں زیادہ سے زیادہ اذیت پہنچ سکے۔ ان واقعات کو انبوہ کثیر پر دیوانگی کے دورے پڑنے سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ بتایا جاتا ہے کہ یورپ میں تیرھویں صدی سے سولہویں صدی تک جادوگرنیوں کو شکار کرنے کے لئے کندۂ ناتراش کسان غولوں کی شکل میں نکل پڑتے، کبھی تو یہ خود پاگل ہوجاتے اور کبھی کبھی جادوگرنیاں پاگل ہو جاتیں۔ گریگوری زیلبورگ نے لکھا ہے کہ ''لاکھوں کی تعداد میں جادوٹونہ کرنے والی عورتیں یا جنات کے زیر سایہ ہونے کی کیفیات میں مبتلا عورتیں پائی جاتی تھیں یا وہ نفسیاتی عوارض کی شکار ہوتی تھیں۔'' (۱۹) ان عوارض کو جنوں وغیر کی کارستانی قرار دے کر علاج کے نام پر انہیں جنوں سمیت جلا دیا جاتا تھا'' لیکن جیسا کہ ''باربرا اہرن ریک'' اور ''ڈیڈرے انگلش'' لکھتی ہیں ''جادوگرنیوں کو جلانا نہ تو کوئی بے لگام طریق کار تھا اور نہ ہسٹیریا میں مبتلا عورتوں کی اجتماعی خودکشی تھی بلکہ منظم مہمات ہوتی تھیں جن کا آغاز، ان کے لئے فنڈز کی فراہمی اور انتظامات کلیسا اور ریاست کے ہاتھ میں تھے'' (۲۰)

ان ایذارسانیوں کی تاریخ اندازاً تیرہویں صدی میں بادشاہوں اور شرفا کے علاج سے شروع ہوئی۔ کلیسا کی تعلیم سے بہرہ ور ''معالجوں'' کو (جنہیں عملاً فن علاج کی کوئی تربیت حاصل نہ ہوتی تھی) انہیں روایتی ''سیانی عورتوں'' سے مسابقت درپیش تھی جن پر اب جادوئی قوتوں کے ذریعے علاج کرنے کا الزام لگنے لگا تھا۔ اس کی پاداش میں انہیں اکثر کھونٹے کے ساتھ باندھ کر آگ لگا دی جاتی تھی۔ (۲۱) ایک اور رویت یہ مشہور ہوئی کہ جادوگرنیوں کی منڈلیاں ہوتی ہیں جو جنگل یا درختوں کے جھنڈ میں لگائی جاتی ہیں ان میں لادین لوگ شیاطین کے ساتھ اکٹھے ہوتے ہیں۔ ان کے مقاصد لوگوں میں پھوٹ ڈالنا، فساد کھڑے

کرنا اور بعض اوقات علاج کے پُراسرار طریقے وضع کرنا بھی تھا۔ ان کی رسوم میں دیوی کی پوجا اور اس حلقے کے مردوں اور عورتوں کے درمیان جنسی مشاغل بھی شامل تھے۔ حلقے کے باہر کے لوگوں میں ان سے خوف بھی محسوس ہوتا اور بیماروں کی بیماریاں دور کرانے کے لئے جن بھوتوں کی مدد حاصل کرنے کی تمنا اور جائز وناجائز دیگر کام کرانے کی ترغیب بھی پائی جاتی تھی۔ کلیسا کی نگاہ میں یہ سب افعال کبیرہ گناہ تھے۔ لوگوں کی اکثریت چونکہ کلیسا کے ساتھ تھی اور ان جادوئی گروہوں کا سارا جال عورتوں کے گرد گھومتا تھا، اس لئے ایک بات یہ بھی کہی جاتی تھی کہ یہ عورت ہی تھی جو مرد کے جنت سے اخراج کا باعث بنی تھی، یہ جادوگرنیاں بھی اسی کی پیروی میں یہاں گھروں کی جنت اجاڑتی ہیں۔ یہ اگر اجاڑتی ہیں تو مرد اور عورت کو قریب بھی لاتی ہیں۔ چرچ کی طرف سے ان پر جنسی بے راہ روی پھیلانے کا الزام اکثر دوہرایا جاتا اور کہا جاتا کہ جادوگرنیوں کی اصل قوت ان کے گناہگار جنسی افعال ہیں۔ (۲۲)

عورتوں کے بارے میں یہ مریضانہ اور نفرت بھرا نقطۂ نظر، جنسی ناآسودگی میں مبتلا مردوں کی نامعقولیت کے طور پر سامنے آتا ہے۔ لیکن کلیسا کی طرف سے عورتوں سے اظہار نفرت وحقارت ایک نفسیاتی ستم ظریفی سے کہیں بڑھ کر تھا۔ یہ مردانہ اقتدار کا ایک جواز تھا اور androcratic system کی طرف سے ایک متلازم اور لفظ کے اس مفہوم کے مطابق معقول بھی تھا کیونکہ سابق gylanic روایات کے باقی ماندہ اثرات بار بار نمودار ہو رہے تھے اور کبھی کبھی اتنی تند وتیز موجوں کی صورت میں ظاہر ہو رہے تھے کہ بقول ٹیلر ''باپ کی اتھارٹی کا تختہ الٹتا ہوا دکھائی دیتا تھا'' (۲۳)

بہ الفاظ دیگر جادوگرنیوں کو پھانسنے کے لئے سرکار کی منظوری سے قائم شدہ تفتیشی مراکز اور کلیسا کی طرف سے عورتوں کی بطور جنس بتکرار مذمت ہوتے رہنا نہ کوئی انوکھی اور عجیب بات تھی اور نہ غیر متعلقہ حرکت تھی، یہ ''اینڈروکریسی'' کے نفاذ اور بعدازاں اس کو سختی سے مسلّط رکھنے کے لئے لازماً درکار اجزا تھے اور اس لحاظ سے معقول تھے کہ بار بار موجوں کی طرح اٹھنے سے روکنے کے لئے اس نظام کے پاس اور کوئی طریقہ نہیں تھا۔

کلیسا کی جانب سے جنس (Sex) کی شدید مذمت اور اس کے بارے میں متشددانہ رویے نے ''اخلاقی'' عہد متوسط کو ایک صلیب بنا کر رکھ دیا جس کی ایک لکڑی ایک مردہ خانہ

تھی اور دوسری لکڑی ایک پاگل خانہ۔ (۲۴) ٹیلر نے اس صورت حال کا جائزہ لیتے ہوئے کلیسا کے سراسر دشمنِ نسوانیت کردار کو نظر انداز کر دیا ہے۔ تاہم جو data وہ پیش کرتا ہے اسے دیکھ کر انسان اس مخمصے میں پڑ جاتا ہے کہ ان باتوں کے بعد وہ کیا چیز ہوگی جسے کلیسا ''کافرانہ'' کہتا ہوگا۔ ٹیلر بار بار دکھاتا ہے کہ مختلف کافر فرقے جنہیں کلیسا نے انتہائی ظالمانہ طریقے سے کچلا، انہیں آپس میں جوڑنے والا جو دھاگہ تھا وہ نسوانی اقدار کی نشاندہی کرتا تھا۔ یہ فرقے خصوصی طور پر حضرت مریم، Virgin کی بطور "Our Lady of Thought" پرستش کرتے تھے اور قدیم عیسائی فرقوں کی طرح جنہوں نے اپنے اپنے دور میں نسوانیت کو نئی زندگی دلانے میں اہم کردار ادا کیا، یہ بھی عورتوں کو اعلیٰ حیثیت دیتے تھے حتیٰ کہ قیادت کے منصب پر بھی فائز کر دیتے تھے۔ (۲۵)

جیسا کہ ٹیلر خود لکھتا ہے ''ایک سوال جسے پیش کرنا ہم اپنے لئے لازم سمجھتے ہیں یہ ہے کہ کلیسا نے یہ کیوں محسوس کیا (خواہ کتنا ہی مبہم طریقے سے محسوس کیا ہو) کہ ٹروبیڈورز، کتھارز، بغاردز اور مختلف دیگر چھوٹے فرقے جو پاکدامن محبت کی تبلیغ کرتے رہے انہیں آپس میں جوڑنے والا کوئی مشترک عامل تھا؟......اس کا صرف ایک ہی جواب ہوسکتا ہے، جی ہاں ایسا مشترک عامل موجود تھا.......ان کے عقائد اور رسوم میں بہت فرق تھا اور ان میں سے بعضوں کا پھر بھی دعویٰ رہا کہ وہ چرچ کے دائرے کے اندر ہیں، نفسیاتی طور پر ان میں ایک چیز مشترک تھی: ماں کی شناخت۔ یہ واحد کلمۂ کفر تھا جس میں عہد متوسط کے کلیسا کو واقعی دلچسپی تھی۔ (۲۶)

تاریخ خود کو دہراتی ہے

"Sex in history" سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ عہد متوسط کے کلیسا کی بنیادی خصوصیت اس کی patrism یا شناختِ پدری تھی جو ہماری اصطلاح میں اس کا androcratic یا مردانہ تسلّط پر مبنی کردار ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھنا شروع کر دیا ہے کہ تاریخ کے گردشی اتار چڑھاؤ کے پیچھے تسلّط ماڈل اور شراکت ماڈل کی اقدار کے مابین مخصوص آویزشیں کارفرما رہی ہیں۔

مثال کے طور پر ٹیلر کہتا ہے کہ برطانیہ میں جب ایک خاتون، ملکہ الزبتھ اوّل تخت نشین ہوئی تو ''مادرانہ شناخت'' یا نسوانی اقدار عروج کی طرف جارہی تھیں۔ اگرچہ یہ اس وقت بھی

ایک وحشیانہ دور تھا۔ یہ الزبتھ ہی کا انگلینڈ تھا کہ ''دوسروں کا خیال رکھنے کی ذمہ داری کا احساس بڑھ گیا اور غریبوں کی امداد کا قانون وجود میں آ گیا''، تعلیم مفت ہوگئی، 'علم و فضل تک رسائی عام ہوگئی اور نئے نئے کالج بننے لگے، تخلیقی قوتوں کا سیلاب آ گیا' خاص طور پر شاعری اور ڈراموں کو پذیرائی ملنے لگی۔ آرٹ، پینٹنگ فن تعمیر اور موسیقی کے چشمے ابلنے لگے۔ (۲۷) یہ بھی ایک معنی خیز بات ہے کہ (نظاموں کی اصطلاح میں، جس کا آگے ذکر آئے گا) نسوانیت کے فروغ کے ٹروبیڈورز، عہد الزبتھ اور نشاۃ ثانیہ میں بالائی طبقے کی عورتوں کو دیگر عورتوں کی بہ نسبت زیادہ آزادی اور تعلیم تک زیادہ رسائی حاصل ہوئی۔ (۲۸) مثال کے طور پر شیکسپیئر کے ڈراموں میں ''پورشیا'' اور دیگر ہیروئنیں خاصی لکھی پڑھی عورتیں تھیں، یعنی وہ اس عہد کے بلند حیثیت طبقے سے متعلق تھیں۔ لیکن جیسا کہ "The Taming of the Shrew" اور دیگر ادبی تصانیف میں شیکسپیئر کی کفر تک پہنچی ہوئی باغی Kate کا اسلوب ظاہر کرتا ہے کہ مردانہ عہد اپنے ازسرنو عروج کے لئے الزبتھ عہد کے خاتمے سے بھی پہلے سر اٹھا رہا تھا۔

درحقیقت اس امر کے واضح ترین نشانات میں سے ایک جو پنڈولم کے ہلارے کی واپسی کی خبر دے رہا تھا۔ زن بیزار عقائد (misogynoist dogmas) کا احیا تھا۔ عورتوں کو محکوم رکھنے کے لئے متعارف کردہ ''حقائق'' کے ساتھ ساتھ یہ وہ سگنل ہے جسے ٹیلر مردانگی کے علمبر داروں patrists کی یہ ''مستقل خودفریبی قرار دیتا ہے کہ طرز عمل کے معیارات تبدیل ہورہے ہیں'' اور یہ کہ ''والد کی شناخت'' کی اقدار کے ازسرنو نفاذ کو ہر قیمت پر یقینی بنایا جانا چاہیے۔ (۲۹) سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ ایک اوّلین وارننگ سگنل ہے کہ اینڈروکریٹک (مردانہ) رجعت پسندی کا خون آشام دور شروع ہوا ہی چاہتا ہے۔

یہاں اس سے خاص طور پر متعلقہ تصنیف ماہر نفسیات ڈیوڈ ونٹر کی "The Power Motive" ہے۔ (۳۰) وہ بطور ایک معاشرتی نفسیات دان معروضی جانچ پڑتال سے تاریخی نقوش کو بے نقاب کرتا ہے۔ اور اگرچہ ہمیں دوبارہ اس سے پیچھے دیکھنا چاہیے جس پر اس نے روایتی مردانہ نفسیاتی تناظر میں زیادہ زور دیا ہے۔ اس کی دریافتیں حیرت انگیز طور پر شہادت دیتی ہیں کہ عورتوں سے متعلق متشددانہ رویّے جارحانہ جنگی ادوار کے پیش خیمہ ہوتے ہیں۔

لٹریچر اور ڈرامے کی مشہور رومانٹک شخصیات کے حوالہ سے ونٹر نے "Don Juan" جیسے عورتوں کے رسیا کا ذکر کرتے ہوئے جو سماجی اور نفسیاتی تجزیہ کیا ہے وہ ادبی تصانیف کے عمومی موضوعات پرمبنی ہے۔ ونٹر کہتا ہے کہ ''ڈان جوآن'' کی گمراہ کن حرکتوں کو غلیظ اور قابل نفریں سمجھنے کے باوجود اسے دراصل ''سپین کے سب سے زیادہ پُرکشش مرد کے طور پر آئیڈیل مانا جاتا ہے۔ وہ اس امر کی نشاندہی بھی کرتا ہے کہ ''ڈان جوآن'' کی ان حرکتوں کی تہہ میں جنسی تسکین حاصل کرنے کی خواہش نہیں بلکہ جذبۂ جارحیت ونفرت کا اظہار تھا جس کے تحت وہ عورتوں کو جسمانی اذیت پہنچا کر جنسی تلذّذ حاصل کرتا تھا۔ اس نے کچھ اور نفسیاتی اور تاریخی اہمیت کی بات بھی نوٹ کی: جب مرد عورتوں کو سختی سے کچلنے لگتے ہیں تو ان کا روّیہ اس زمانے کی ایک خصوصیت ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں وہ سپین کے کلاسیکل دور کی روایات کا حوالہ دیتا ہے جنہوں نے ''ڈان جوآن'' کی داستان کو جنم دیا۔ ان روایات کے تحت عورتوں کو گوشۂ تنہائی میں محبوس رکھا جاتا تھا، یہ وہی طور طریقے تھے جو افریقہ کے قدیم باشندوں کے ہاں پائے جاتے تھے۔ [۳۱] عورتوں سے اس شدید معاندانہ سلوک کے پیچھے کارفرما نفسیات پر روشنی ڈالتے ہوئے ونٹر کہتا ہے کہ ایسے زمانوں میں ماں اور بیٹے کا تعلق بھی (عورت اور مرد کے عمومی تعلقات کی طرح) سخت کشیدہ ہوجاتا ہے۔ [۳۲]

اس سیاق وسباق میں صاف ظاہر ہے کہ ونٹر نے جس ''طاقت کی دسترس'' کا ذکر کیا ہے وہ ہماری اصطلاحات میں وہ مظہرِ قوت (androcratic drive) ہے جو مرد کو اکساتی ہے کہ وہ زیادہ سے زیادہ فتوحات کرے اور دیگر ابنائے نوعِ انسانی کو مغلوب کرتی رہے۔ ونٹر نے پہلے یہ ثابت کرنے کے بعد کہ ''ڈان جوآن'' کا عورتوں کو ذلیل کرنا اس کی طاقت کی دسترس کا مظاہرہ تھا، وہ قومی لٹریچر میں شاہانہ توسیع پسندیوں اور جنگوں کے مختلف ادوار میں ''ڈان جوآن'' کی کہانیوں کے حوالے دیتا ہے۔

اس کی تحقیق سے جن چیزوں کی شہادت ملتی ہے، انہی کو استعمال کرکے ہم زنانہ اور مردانہ ماڈلز کے باری باری ظہور کی پیشگوئی کرتے ہیں: عورتوں پر مردوں کے غلبے کے اس نمونۂ اول کی کہانیاں بڑھتی ہوئی عسکریت اور شہنشاہیت کے ادوار سے پہلے اور ان کے دوران میں تاریخی طور پر بہتات سے ملتی ہیں۔ [۳۳]

ونٹر اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ نظاموں کی اصطلاحات میں مرد کا غلبہ جنگوں میں

مردانہ تشدد کے ساتھ ناقابلِ انخلاص طور پر جڑا ہوا ہے۔ وہ اس کی بھی تصدیق کرتا ہے کہ زنانہ ومردانہ نظاموں کے ادل بدل کا ایک پہلو جسے ''کیٹ ملٹ'' اور ''تھیوڈورروسزک'' نے بہت پہلے کہا تھا کہ مردانہ برتری کو ازسرِ نو آئیڈیل بنانا ان اقدار اور رویّوں کی طرف منتقلی کا سگنل ہے جو تاریخی طور پر مردانہ رجحتوں کے تشدد کو ایندھن فراہم کرتے رہے ہیں۔ (۳۴)

کیٹ ملٹ کی روشن فکر تصنیف Sexual Politics ہماری سیاسی تاریخ کا ایک چشم کشا مطالعہ ہے جسے مصنفہ نے وجدانی طور پر ہماری زندگی کا ایک اہم ترین عامل سمجھتے ہوئے اس کا جائزہ لیا اور اس نتیجے پر پہنچی کہ جنسی سیاست دراصل مرد کے غلبے کی مظہر ہے۔ (۳۵) اور اگرچہ تھیوڈور روسزک معاشرے کے روایتی مردانہ تجزیئے کے لئے شہرت رکھتا ہے اس نے اپنے ایک مضمون "Hard and Soft: The Force of Femininism in Modern Times" میں جو''اینڈروگائیلینک نظاموں کے ادل بدل کے نظریئے کو آگے بڑھاتا ہے تاریخ کا اسی تناظر میں تجزیہ کیا ہے۔ (۳۶)

تھیوڈور روسزک نے تشدد اور عسکریت کے بڑھتے ہوئے رجحانات (جو پہلی جنگ عظیم پر منتج ہوئے) پر لکھے گئے سینکڑوں تحقیقی کاموں کا وسیع وعمیق تجزیہ کرتے ہوئے قرار دیا کہ ''یہ جنگ عظیم مرد کے غلبے سے پیدا شدہ تاریخی بحران تھی'' (۳۷) اس نے کہا کہ انیسویں صدی کی تحریکِ نسواں نے نہ صرف مرد کے غلبے اور عورتوں کی اطاعت پر مبنی مروّجہ گھسے پٹے رویّوں کو چیلنج کیا بلکہ ریکارڈ شدہ تاریخ میں پہلی بار مروّجہ نظام کو سامنے سے جا کر للکارا اور سیدھے اندر جا کر اس کے نظریاتی تخمدان پر بھی حملہ کر دیا۔ انیسویں صدی کا یہ چیلنج اپنی مثال آپ تھا۔ ہماری مروّجہ کتبِ تاریخ اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہیں۔ لیکن اس پر اتنی ہی گرما گرم بحثیں اور پُر جوش مناظرے دیکھنے میں آئے جتنی ہمارے دور کی تحریک آزادئ نسواں کو مزاحمتیں پیش آئی ہیں۔ کیونکہ اس نے نہ صرف عورتوں پر مردوں کی روایتی بالادستی کو چیلنج کیا، اس نے ہمارے نظام کی اساسی اقدار کو بھی چیلنج کر دیا جس میں شفقت، نرم دلی، تلطّف اور امن پسندی نسوانی اوصاف سمجھی جاتی ہیں۔ جو حقیقی یا ''مردانہ'' مزاج مردوں کے لئے کلیتًا نامناسب قرار دی جاتی ہیں، ان اوصاف کو معاشرتی حکمرانی کے لئے انتہائی غیر موزوں سمجھا جاتا ہے۔ (۳۸)

اس چیلنج سے نمٹنے کے لئے اینڈروکریٹک نظام کا جواب بے حد متشددانہ مردانگی کا

مظہر تھا، پرانے گھسے پٹے دعوے نئی زبان اور نئے اسلوب میں دہرائے جانے لگے۔ جیسا کہ روسزک نے جنگ عظیم اول سے پہلے ،انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کے برسوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے ''اس عہد کا سیاسی اسلوب بجا و بے جا مردانگی کے اظہار سے مملو تھا''۔ امریکہ میں تھیوڈور روز ویلٹ نے ''غیر جنگویانہ اور انوکھی آرام طلبی کے کینسر'' اور ''مردانہ اور مہم جوئی کی صفات'' کا ذکر کیا۔ آئرلینڈ میں انقلابی شاعر پیٹرک پیئرز نے یہ درس دیا ''خون ریزی ایک عمل تطہیر اور مظہر تقدیس ہے اور جو قوم بعد میں ہونے والی تباہ کاریوں کا ذکر کرے تو سمجھو کہ وہ اپنی مردانگی کھو بیٹھی ہے''۔ اٹلی میں فلیپو مرینٹی نے اعلان کیا ''ہم جنگ کی عظمت بیان کرتے ہیں۔ دنیا کو صحت عطا کرنے کا واحد نسخہ: عسکریت! حب وطن! انارکسٹ کے تباہ کن بازو! اور عورت کے لئے نفرت ہے۔''

جہاں تک ''ڈان جوآن'' کی مقدس داستان کا معاملہ ہے، عورتوں کے لئے یہ وحشیانہ نفرت تھی اور جو چیز بھی نسوانی سمجھی جاتی وہ خطرے کا سگنل تھی جبکہ پیغام یہ تھا کہ ''غیر رزمی'' اور ''غیر مردانہ'' دنیا جو ''مردانہ'' خنجر (Blade) کی زیر فرمانروائی نہ ہو قطعاً ناقابل برداشت ہوگی۔

روسزک نے اس صدی کے موڑ پر دنیا بھر کے بااختیار مردوں بلکہ پوری انسانی تاریخ کے بااختیار مردوں کے کوائف اکٹھے کئے جنہوں نے انسانیت کو جنگ کے شعلوں میں جھونکا تھا۔ اس نے ان کے قومی اور نظریاتی اختلافات کی سطح کے نیچے ان میں پائی جانے والی مشترک خصوصیات کا بھی تجزیہ کیا۔ اس نے انکشاف کیا کہ وہ تندی و تشدد کو مردانگی کا جزو سمجھتے تھے، اور تشدد کو مروّجہ نظامِ مراتب کی بقاواستحکام کے لئے استعمال کرنا ضروری قرار دیتے تھے۔ اس نے تمثیلی طور پر اس حرکیات (dynamic) کی توثیق کی جس کا اظہار ونٹر نے اپنی تحقیق کیا تھا یعنی گھسے پٹے ''مردانہ'' طور طریقوں کی ازسرنو تمثیل گری نہ صرف اقدار کی رجعت پسندانہ تبدیلی کی نشاندہی کرتی ہے بلکہ امن سے جنگ کی طرف قدم بڑھنے کا اشارہ بھی کرتی ہے۔

اس کی اسی طرح کی ناگزیر توثیق جسے اسی طریقے سے عموماً نظرانداز کر دیا جاتا ہے وہ ماہرِ نفسیات ڈیوڈ میکلیلینڈ (Mc clelland) کی تحقیق میں پائی جاتی ہے۔ وہ اپنی کتاب "Power:The "Inner Experience" میں بتاتا ہے کہ جنگ یا امن کے ادوار کی پیشنگوئی

زیرغور زمانے سے ماقبل کی تحریروں یا بیانات کے مطالعے سے کی جاسکتی ہے (۴۰) ان تحریروں میں آئندہ کے لئے اشارات لازماً موجود ہوتے ہیں۔ اس کے تحقیقی کاموں سے اس امر کی توثیق ہوتی ہے کہ ہم تاریخ کے نسوانی ومردانہ ماڈلوں (نمونوں) کو استعمال کرکے آئندہ کے تغیر وتبدّل کی پیشگوئی کرسکتے ہیں۔

ڈیوڈ میکلیلینڈ امریکی تاریخ کے مختلف ادوار کے ادبی مواد پر تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچا کہ وہ ادوار، جن میں شراکت کے جذبات کو تقویت ملتی ہے، ان کے بعد لامحالہ امن وسکون کے ادوار آجاتے ہیں۔ (انہیں اس نے affiliation motive کی تقویت کہا ہے اور ہم انہیں امن ورحمدلی کی اقدار کے فروغ کا نام دیتے ہیں) مثال کے طور پر میکلیلینڈ نے کھوج لگایا کہ ۱۸۰۰ سے ۱۸۱۰ تک اور ۱۹۲۰ سے ۱۹۳۰ء تک (۴۱) تک کے پُرامن برسوں میں شراکت کے جذبات اوپر کی طرف جارہے تھے، اس کے برعکس جن ادوار کی ادبی تحریریں پھر ''شاہی اقدار'' کی طرف منتقل ہوئیں اور جذبات تسلّط ماڈل کی جانب مائل ہوئے تو جنگوں کی نوبت آکر رہی۔ انگلش ہسٹری میں بھی ''شاہی اقتدار'' کے رجحانات کے عروج اور شراکت ماڈل کے رجحانات میں کمی کی ملی جلی کیفیات تاریخی تباہ کاریوں کے زمانے کی پیشرو رہی ہیں مثلاً ۱۵۵۰، ۱۶۵۰ اور ۱۷۵۰۔ (۴۲) دوسری طرف انگلش ہسٹری میں کم اقتدار اور زیادہ شراکت کے ادوار زیادہ پُرامن زمانوں کے نقیب رہے۔

ٹیلر کی تصانیف کی طرح میکلیلینڈ ایک اور اہم نقطے کی وضاحت کرتا ہے وہ یہ ہے کہ کسی معاشرے کے شراکتی ماڈل کی ''ملائم تر'' اور ''گداز تر'' خصوصیات اس کی مخصوص سماجی اور نظریاتی ہیئت کا وہ حصہ ہوتی ہیں جو تباہ کاری کی بہ نسبت تخلیق پر زور دیتا ہے۔ جیسا کہ ہم جدید حجری دور اور قدیم کریٹ کے حسین دیواری نقش ونگار اور محلّات میں پاتے ہیں۔ اور وہ ان زمانوں میں بھی پائے گئے ہیں جنہیں ٹیلر مادرانہ (matrist) ادوار مثلاً ملکہ الزبتھ کا دور کہتا ہے۔ زیادہ مادریّت کے ادوار (gylanic periods) بھی وافر ثقافتی تخلیقیت کے زمانے ہوتے ہیں۔

میکلیلینڈ اپنے اس پُرکشش اور مسحور کن نظام کے لئے مخصوص ''شارٹ ہینڈ'' اور اصطلاحات استعمال کرتا ہے۔ ان اصطلاحات میں وہ کہتا ہے کہ ''الزبتھ کے عہد کے بارے میں جو چیز واقعتاً قابل ذکر ہے وہ یہ ہے کہ ترغیبی اشاریئے اس امر کی شہادت دیتے ہیں کہ

یہ واقعی اچھی زندگی بسر کرنے کا زمانہ ہوگا، جیسا کہ مؤرخین ہمیشہ کہتے رہے ہیں۔ شراکت کے لئے ضرورت پیدا ہوچکی تھی، اقتدار ذرا پست سطح پر آچکا تھا۔ کچھ امن کی علامات بھی نمایاں ہوگئی تھیں۔ کافی کارنامے وجود میں آگئے تھے اور کچھ خوشحالی بھی آتی دکھائی دے رہی تھی'' (۴۳) لیکن اس کے فوراً بعد ''بہت دیکھی بھالی'' تبدیلی آگئی۔ Cavaliers اور Roundheads کی کشمکش اور خانہ جنگی کے دوران مردوں کی قوت تیزی بڑھ گئی اور عورتوں کی قوت پست سطحوں کو چھونے لگی۔ اس سے یہ اشارہ ملا کہ اب بے حد تشددوفساد اور بے رحمی وشقاوت کا زمانہ آجانا چاہیے، اور فی الواقعہ ایسا ہو کہ رہا''۔ (۴۴) یا ہماری اصطلاحات میں مرد کے غلبے کے تحت پیداشدہ حالات میں ثقافتی ارتقا کے اعلیٰ مدارج کی طرف پیش قدمی صرف اس حد تک رہ سکتی تھی، اس سے آگے نہیں ہو سکتی تھی۔ نظام کو برقرار رکھنے سے ثقافتی تنزل واقع ہونا لازمی تھا۔ اور نظام کو اینڈروکریٹک فسادات اور تشدد کی ''نارمل'' حرکیات میں دوبارہ غوطہ لگانا پڑا۔

اینڈروکریٹک سسٹم کی جُملہ تشکیلی خصوصیات کا جس طرح ہم نے جائزہ لیا میکلیلینڈ کا تجزیہ بھی اس کی تائید کرتا ہے کہ ان زمانوں میں جب جارحانہ قوت کی تحریصات ایک بار پھر غالب آگئیں تو سسٹم کا تیسرا بڑا اجزوِ ترکیبی مطلق العنانیت (authoritarianism) مستحکم تر ہوگئی۔ وہ لکھتا ہے کہ جو جدید ریاستیں آمریت کی راہ پرگامزن ہیں وہ بے محابا طاقت آزمائی کرنے، آزادیوں کو سلب کرنے اور داخلی وبین الاقوامی تشدد کے حربوں کو استعمال کرنے کی خوگر ہیں وہ شراکت کے جذبوں کو کمتر سطح پر لاکر مردانہ نظام کی برتری کا مظاہرہ کررہی ہیں۔ (۴۵)

تحریک نسواں کے لئے کام کرنے والے نئے سکالرز نے بھی طاقت اور اقتدار کا خصوصی طور پر مطالعہ کیا ہے۔ ممتاز ماہر سماجیات جیسی برنارڈ، ہاروڈ کی سائیکالوجسٹ کیرل جلیگن اور سائیکائرسٹ جین بیکرملر نے اس امر کی متعدد شہادتیں اکٹھی کی ہیں کہ مرد کے زیر تسلط قائم معاشروں میں نرمی اور لطافت کونسوانیت سے منسلک کیا جاتا ہے جبکہ اقتدار کو مردانگی کا جزو سمجھا جاتا ہے۔ (۴۶)

ان تصانیف سے کسی اور اہم ترین چیز کا انکشاف بھی ہوتا ہے: اقتدار کی جس تشکیل کو میکلیلینڈ نے نرمی اور لطافت کی مظہر کہا ٹیلر نے اسے مادریت کی مظہر (Matrist) کہا اور ہم

نے اس کو نسوانیت(gylanic) کہا وہ مردانہ نظاموں میں عموماً ایک الگ دنیا کے اندر مقید کردی جاتی ہے جو''مردوں'' کی دنیا یا ''حقیقی'' دنیا کی اطاعت گزار یا ذیلی حیثیت رکھنے والی دنیائے نسوانیت ہوتی ہے۔

یہاں آ کر اقتدار کی نسوانی تعریف(gylanic definition) کے بطور ''اختیار دہندہ'' متعیّن ہوتی ہے جسے اب بھی دیکھا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ جین بیکر ملر کہتی ہے یہ کافی حد تک عورتیں ہی ہیں جو اقتدار کی تعریف بطور ایک ذمہ داری کرتی ہیں وہ بطور ماں اپنے بچوں بالخصوص بیٹوں کی مدد کرتی ہیں اور ان کی صلاحیتوں اور قابلیتوں کو ترقی دیتی ہیں۔ (۴۷) یہاں آ کر جیسی برنارڈ جس ''نسوانی خصوصیتِ محبت وفرض شناسی'' کا ذکر کرتی ہے وہ فکر اور عمل کا ایک بنیادی ماڈل ہے، مگر یہ صرف عورتوں کے لئے مخصوص ہے۔ (۴۸) اور یہاں آ کر وہ چیز سامنے آتی ہے جسے کرل جلیگن نسوانی اخلاقیاتِ محافظت وذمہ داری کا نام دیتی ہے، اس کے اندر ایک قسم کی حکمرانی بھی شامل ہوجاتی ہے۔''ہم دوسروں کے لئے ایک مثبت خدمت انجام دیتی ہیں اور اس کے بدلے میں دوسروں سے بھی یہی توقع کرتی ہیں''۔ لیکن ایک بار پھر یہ صرف فکروعمل کا ایک نمونہ ہے ان لوگوں کے لئے جن سے یہ توقع نہیں کی جاتی کہ وہ معاشرے، (عورتوں) کے حکمران بن بیٹھیں۔

انسانیت کے نصف حصے کو نظرانداز کرنے کے عمومی رویے کی نئی تحقیق کو سامنے رکھتے ہوئے ہمیں یہ دکھائی دینے لگا ہے کہ جب پیار محبت اور موانست کی نسوانی اقدار کمزور پڑ جائیں یا جارحیت اور قوتِ بازو پر مبنی مردانہ اقدار بہت زیادہ مضبوط ہوجائیں تو جنگ اور استبداد کے زمانے شروع ہوجانے کی پیشگوئی کرنا مشکل نہیں ہوتی۔ ہم یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ ریکارڈ شدہ تاریخ کو متاثر کرنے والی بظاہر ناقابل تشریح تبدیلیاں کس طرح ہمارے ثقافتی ارتقا کی راہ میں بنیادی نوعیت کی مزاحمت ثابت ہوتی ہیں: یہ وہ معاشرتی نظام ہے جس میں انسانیت کا نصف حصہ جو عورتوں پر مشتمل ہے اسے مغلوب اور معتوب کرکے رکھ دیا جاتا ہے۔

عورت بطور ایک قوتِ تاریخ

اگر یہ اینڈروکریٹک اور گائیلنک سسٹمز اتنے واضح ہیں تو ان کی قوت سے واقع ہونے

والی حرکات (حرکیات) کا اتنا کم مطالعہ کیوں کیا گیا؟ بلاشبہ وہ ہمارے انواع کا نصف حصہ ہیں تو ان کے رویے، سرگرمیاں اور خیالات گہرے مطالعے کے مستحق کیوں نہ بن سکے؟ پھر ہمیں ان فروگزاشتوں میں سے ایک ایسی فروگزاشت کا سامنا کرنا پڑ رہا ہے جس پر سائنس دان اور تاریخ دان مدتوں اظہار حیرت کرتے رہیں گے۔

اس وقت انسانی معاشرے کے جامع مطالعے کا دروازہ صرف تھوڑا سا ہی کھلا ہوا ہے۔ اس میں ذرا سی درز اس وقت دکھائی دی جب مؤرخوں نے یہ تسلیم کرنا شروع کر دیا (جیسا کہ لین وائیٹ جونیئر نے کہا ہے) کہ تاریخ نویسی طبعی رجحان کے تحت ہوتی رہی ہے، یعنی ان لوگوں نے لکھی یا ان لوگوں کے لئے لکھی گئی جو تاریخی طور پر غالب گروہ تھے۔ (۵۰) لیکن یہ اب آ کر ہوا ہے جب تاریخ میں سے غائب نصف حصے (عورتوں) پر سنجیدگی سے غور وفکر شروع کر دیا گیا ہے۔ ہم تاریخ اور ثقافتی ارتقا کا ایسا نظریہ وضع کر سکتے ہیں جس میں انسانی معاشرے کو ''کلیتاً'' ملحوظ رکھا گیا ہو۔

یہ کوئی تعجب خیز امر نہیں کہ ہماری مروّجہ تواریخ ہر اُس چیز کو خوب سوچ سمجھ کر حذف کر رہی ہیں جو طبقۂ نسواں یا نسوانیت سے متعلق ہو۔ تھوڑا ہی عرصہ پہلے تک کسی ایک امریکی یونیورسٹی میں بھی ''ویمن سٹڈی پروگرام'' نہیں تھا۔ اور اب بھی ہمارے ہائی سکولوں اور گرامر سکولوں کی وسیع تعداد میں ایسی کوئی چیز نہیں پائی جاتی۔ حتیٰ کہ جہاں جہاں ایسے پروگرام ہیں بھی، تو انہیں نہایت حقیر بجٹ دیئے جاتے ہیں اور ان کی حیثیت (status) بھی کم تر رکھی جاتی ہے۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے نظامِ مراتب میں بھی ان کو کم ترجیح دی جاتی ہے۔ صرف چند ایک جگہیں ہیں جن میں محض ایک ویمن سٹڈیز گریجویشن پروگرام رکھا گیا ہے۔ اس لئے یہ بات بھی حیرت انگیز نہیں کہ بیشتر ''تعلیم یافتہ'' لوگ یہ ماننے کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ کچھ ایسی عورتیں بھی ہوگزری ہیں جنہوں نے تاریخ میں قابل قدر کردار ادا کیا تھا یا عورتوں جیسے ثانوی حیثیت کے حامل انسانوں نے مرکزی قوت بن کر دکھا دیا تھا۔ نہ صرف ماضی میں ایسا ہوا بلکہ آئندہ کے بہتر مستقبل میں بھی ایسا کردار ادا کر سکتی ہیں۔

بیسویں صدی میں ایسی اوّلین کتاب، جس نے عورتوں کو تاریخ میں سے حذف کئے جانے کی وجہ سے ہونے والے نقصان کی تلافی کرنے کی کوشش کی، وہ میری بیرڈ نے

"Woman as a Force in History" کے نام سے لکھی ہے۔ (۵۱) اس میں اس نے بتایا کہ عورتوں نے مرد کے غلبے کے باوجود مغربی معاشرے کی تشکیل میں کس طرح اہم کردار ادا کیا۔ اس نے زمانہ قبل از تاریخ میں گمشدہ انسانی ورثے کو بطور ماخذ استعمال کیا۔ یہاں خاص طور پر قابل ذکر بات یہ ہے کہ اس نے ان شہادتوں کو بھی استعمال کیا جو روایتی مؤرخوں کے نزدیک ونٹر اور میکلیلینڈ کے نسوانی اقدار اور مردانہ اقدار کے درمیان ارتباط قائم کرنے سے بھی زیادہ دھماکہ خیز تھا۔ اس طرح اس نے ثابت کیا کہ عورتوں کی بڑھتی ہوئی حیثیت کے ادوار ثقافتی سرگرمیوں کے عروج کے ادوار ہوتے تھے۔

ہم جس نظریۂ ثقافتی تقلیب کو آگے بڑھا رہے ہیں، اس کے تناظر میں عورتوں کی حیثیت اور معاشرے کے عام مزاج کے مابین ارتباط تلاش کرنا حیرت انگیز بات نہیں ہے۔۔ معاشرہ مزاجاً امن پسند ہے یا جنگجو، معاشرہ عوامی بہبود اور مساوات کا خیال رکھتا ہے یا اس سے لاتعلق رہتا ہے، عمومی نظامِ مراتب پر سختی سے کاربند ہے یا لوگوں کو ان کی صلاحیتوں کے مطابق آگے بڑھنے کے مواقع دیتا ہے۔ ان سب باتوں کا عورتوں کی حیثیت کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ کیونکہ جیسے اس ساری کتاب میں ہم نے دیکھا ہے کہ جس طرح معاشرہ ، انسانیت کے دونوں نصفوں کے مابین تعلق کو متشکل کرتا ہے، اس کے گہرے مضمرات ہوتے ہیں اور مستقبل کی راہیں بھی متعین ہوتی ہیں۔ اس میں حیرت انگیز بات یہ ہے کہ میری بیئرڈ نے اس بارے میں اپنے سامنے کوئی واضح نقشہ نہ ہونے کے باوجود اس موضوع پر کتاب لکھی ہے۔ یہ اس صدی کے شروع میں لکھی گئی تھی وہ اس وقت دیکھ سکتی تھی کہ اس کی سوچ آئندہ حالات پر کس طرح اثر انداز ہوگی اور مغربی تاریخ میں عورتوں کی سرگرمیاں کونسا رُخ اختیار کریں گی۔

بیئرڈ نے "Women as a force in history" میں نشاۃ ثانیہ کے دوران انسان شناسی کے فروغ میں اطالوی عورتوں کی دور رس اور متاثر کن سرگرمیوں کا جائزہ لیتے ہوئے کہا کہ یہ وہ وقت تھا جب عورتوں نے (مع اپنے فنکارانہ اور پُر تجسّس مزاج اور دیگر ''نسوانی'' قدروں کے) اپنے آپ کو عہد متوسط کے چرچ کے کنٹرول سے جان چھڑانے کا آغاز کیا تھا۔ وہ شہادتوں کے حوالے سے کہتی ہے کہ عورتوں نے سترھویں اور اٹھارہویں صدی کی فرانسیسی روشن خیالی (enlightenment) کی تحریک میں بھی ایسا ہی کردار ادا کیا تھا۔ واقعتاً

جیسا کہ ہم آگے دیکھیں گے، اس عرصہ کے دوران (جبکہ پرانے نظام کی بربریت اور غلط کاریوں کے خلاف سیکولر بغاوت کا آغاز ہو چکا تھا) بااثر عورتوں میڈم ریمیو لے، نینن ڈی لینکلوس اور میڈم جیوفرن کے ''دیوان خانے'' (Salons) ہی تھے جہاں سے جنم لینے والے تصورات ونظریات بعد میں مسلکِ انسانیت کے مزید فروغ کا ذریعہ ثابت ہوئے یا جن میں سے ہماری اصطلاحات کے مطابق جدید gylanic نظریات نے شروع میں جنم لیا تھا۔ (۵۲)

یہ کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ عورتوں نے مردوں اور ''مردانہ'' اقدار کو برسرِ اقتدار لانے اور برقرار رکھنے میں کوئی مدد نہیں کی۔ یہاں وہاں بڑی بڑی شخصیتوں کے ظہور کے باوجود ہمارے ریکارڈ شدہ ماضی میں androcratic system میں بھی مرد کے مقررہ کردار کے ساتھ ساتھ اس کی ''مددگار'' کے طور پر عورتوں کا کردار ناگزیر رہا ہے۔ لیکن جیسا کہ بیئرڈ بار بار کہتی ہے اگرچہ عورتوں نے مردوں کو جنگیں لڑنے میں مدد دی ہے اور بعض اوقات انہوں نے خود بھی جنگیں لڑی ہیں لیکن ان کے کردار کی نوعیت بالکل مختلف رہی ہے۔ وہ مزاجاً سخت جان، جار اور فتح شناس نہیں ہیں۔ یہ اپنی زندگیوں، عملوں اور تصورات میں نرمی وملائمت کی خصوصیات رکھتی ہیں۔ یعنی کم متشدد، زیادہ رحمدل اور متردّد ہوتی ہیں۔ مثال کے طور پر جیسا کہ بیئرڈ کہتی ہے، جنگی نغموں، نفرت اور انتقام کے جذبات جنہیں ہومر نے لافانی بنادیا تھا، ان کی اوّلین مخالفت عورتوں کی طرف سے ہوئی جن میں سے بے حد قابل ذکر اولس (یونان) کی شاعرہ "sappha" تھی جو بعدازاں Sappho کے نام سے مشہور ہوئی۔ (۵۳)

یہ چشم کشابات ایک اور بصیرت افروز کتاب میں بھی ہے جس میں تاریخ میں خواتین کے اہم کردار پر روشنی ڈالی گئی۔ اس کا نام "The First Sex" ہے جو الزبتھ گولڈ ڈیوس نے لکھی (۵۴) دیگر مصنف خواتین کی طرح جنہیں ماضی میں کسی ادارے یا پڑھے لکھے رفقائے کار کی مدد حاصل نہ ہونے کی وجہ سے نقصان پہنچا، اور اب وہ اپنی اصلاح کے لئے کوشاں ہیں۔ ڈیوس کی کتاب کو بھی خیالی باتیں کرنے، توہمات پھیلانے اور من موجی تصورات کی تانیں بکھیرنے وغیرہ قسم کی تنقید کا نشانہ بننا پڑا۔ لیکن یہ کتابیں اپنی خامیوں کے باوجود عورتوں کی حیثیت کی طرف توجہ دلانے اور آگے چل کر نسوانی اقدار کو اجاگر کرنے میں کامیاب رہیں۔

بیئرڈ کی کتاب کی طرح ڈیوس کی کتاب بھی عورتوں کو اسی مقام پر لائی ہے جہاں سے مردانہ نظام کے حامی مؤرخوں نے انہیں حذف کیا تھا۔ یہ وہ کوائف ومعلومات بھی فراہم

MashalBooks.org

کرتی ہے جو ان نازک تاریخی موڑوں پر اس امر کو ممکن بناتی ہیں کہ ہم عورتوں کو دبانے اور نسوانی اقدار کو دبانے کے درمیان تعلق کو دیکھ سکیں۔ مثال کے طور پر ڈیوس عہدِ الزبتھ اور اس کے بعد آنے ولے پیوریٹنوں(puritans) کے عہد میں ہونے والے تنزل کا تقابل پیش کرتی ہے جس میں عورتوں کو دبانے کے لئے شرمناک ہتھکنڈے استعمال کئے گئے ان میں ''جادوگرنیوں'' کو زندہ جلانے کے واقعات بھی شامل ہیں۔

لیکن یہ بنیادی طور پر آج کے بے لچک موقف رکھنے والے حقوق نسواں کے حامی مؤرخین اور ماہرین معاشرتی علوم کی کتابیں ہیں جن میں سے ہم ایسی معلومات اکٹھی کر سکتے ہیں جو زنانہ ومردانہ تقلیب اور ادل بدل کے سلسلے میں نئے جامع نظریات وضع کرنے میں کام دے سکتی ہیں۔ ایسی مفید وکار آمد کتابوں کی مصنف خواتین کے نام یہ ہیں: 'Renate Bridenthal, Eleanor Leacock, Dorothy Dinnerstein, Gerda Lerner, Nancy Cott, Donna Haraway, JoAnn McNamara, Caroll Smith-Rosenberg, Elizabeth Pleck, Claudia koonz, Joan Kelly, Susanne Wemple, Francoise d,Equbonne, Marilyn French, Carolyn Merchant, Jane Jaquetta, Annette Ehrlich, Susan Brownmiller, Rayna Rapp, Itsue Takamure, Lourdes Arizpe, Bettina Aptheker, Gloria La Frances Rodgers-Rose, Orenstein, Kathlene Newland Lester Kirkendal, P.Steven Sangren, Carol Jacklin, مرد مصنفین مثلاً Carl Degler اور Randolph Trumbach، جنہوں نے بے حد عرق ریزی کی اور اکثر مبہم اور نایاب مآخذ مثلاً عورتوں کی ڈائریوں اور دیگر اب تک نظر انداز شدہ ریکارڈز سے استفادہ کیا۔ جنہیں ڈھونڈ ڈھانڈ کر از سر نو یکجا کیا گیا تو پتہ چلا کہ یہ ناقابل یقین حد تک نصف تاریخ ہے جو نظر انداز کر دی گئی تھی۔ (۵۵) اور اس طریقے سے وہ لاپتہ بلڈنگ بلاکس دریافت ہو گئے جن کو ملا کر تعمیر مکمل کرنا تھی۔ یہ ایسا تاریخی مواد تھا جسے سمجھنے اور اس سے آگے قدم بڑھانے کی سخت ضرورت تھی۔ اس کی عدم موجودگی کی وجہ سے ریکارڈ شدہ تاریخ کبھی ایک قدم آگے بڑھتی اور کبھی ایک قدم پیچھے چلی جاتی تھی۔ یہ نئے حامیانِ تحریک نسواں کی کاوشوں کا نتیجہ ہے کہ ایک صدی سے زائد عرصہ قبل فرانسیسی فلسفی چارلس فوریئر نے جو کچھ کہا تھا ہم اس کے پیچھے کارفرما دلائل کو سمجھنے لگے ہیں: کہ عورتوں کی آزادی

MashalBooks.org

(emancipation) جس درجے پر ہوگی وہ معاشرے کی آزادی کے درجے کا اشاریہ ہوگا۔ (۵۲)

عورتوں کی سماجی اخلاقیات

ہم پہلے ہی دیکھ چکے ہیں کہ سخت گیر'اینڈروکریٹک' کنٹرول کے ادوار میں نسبتاً زیادہ ملائم اور زیادہ ''نسوانی'' اقدار کو کس طرح سختی کے ساتھ ماتحت دنیائے نسواں کے اندر محدود کردیا جاتا ہے جبکہ گھر کی پرائیویٹ دنیا پر مردوں کی انفرادی حکمرانی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس ہم نے یہ بھی دیکھا کہ 'gylanic' عروج کے ادوار میں یہ اقدار کس طرح باہر نکل کر وسیع پبلک یا مرد کی دنیا میں آجاتی ہیں جہاں وہ معاشرتی ترقی پر کسی حد تک اثرانداز ہوتی ہیں۔

نسوانی امور پر تحقیق کرنے والے نئے سکالرز نے جو چیز ممکن بنائی ہے وہ اس امر کے شواہد ہیں کہ یہ سب کچھ کسی پُراسرار دائروی اور کڑے اصول یا ''مقدر'' (ایڈمز کی "Virgin" بمقابلہ "Dynamo") کے تحت نہیں ہوتا۔ یہ ایک بہت سادہ عملی سبب کے تحت ہوتا ہے۔ یہ مؤرخین کو واضح طور پر دکھائی دے سکتا تھا بشرطیکہ وہ عورتوں کو اپنے مطالعے میں شامل کرنا گوارا کرلیتے۔ جن ادوار میں اور جن مقامات پر عورتوں کو سختی سے ان کے گھر کی پرائیویٹ دنیا میں محدود نہیں کردیا جاتا تھا وہ gylanic نقطۂ نظر کو زیادہ موثر طریقے سے معاشرتی زندگی میں داخل کرتی رہی ہیں (یہ وہ زمانے ہوتے تھے جب وہ زیادہ آسانی سے نقل وحرکت کرسکتی تھیں۔گروہوں کی صورت میں متحرک تھیں اور ''نسوانی اخلاقیات'' کا آزادی سے پرچار کرتی تھیں)۔

جیسا کہ ہم نے کلاسیکی یونان میں اور پھر یسوع کے دور میں دیکھا عورتوں کا معاشرتی زندگی کو بہتر بنانے میں بہت زیادہ کردار تھا لیکن اس سلسلے میں سب سے زیادہ نمایاں کیس جدید زمانے کی دوسروں کے ساتھ دوستانہ میل جول کی تحریک ہے مگر اسے ماسوائے حامیانِ حقوقِ نسواں کے، تقریباً مکمل طور پر نظرانداز کردیا گیا ہے۔حقوقِ نسواں کی تحریک پہلے ۱۹ ویں صدی میں اچانک ابھری تھی اور اب یہ ۲۰ ویں صدی میں آگ پکڑ رہی ہے۔

اگرچہ اسے معیاری تاریخی کتابوں میں عمومی طور پر نظرانداز کیا گیا ہے۔ انیسویں صدی

کی سینکڑوں حامیانِ حقوقِ نسواں مثلاً لُوسی سٹون، مارگریٹ فُلر، میری لیون، الزبتھ کیڈی سٹینٹن اور سوسن بی انتھونی جیسی مصنفین کی سینکڑوں کتابیں غیر معروف رہیں مگر انہوں نے انسانیت کے نسوانی نصف حصے کے حالات کو کافی بہتر بنادیا۔ خانگی زندگی گزارنے والی جدید نسوانیت کی ان ''ماؤں'' نے عورتوں کو ان قوانین سے نجات دلادی جن میں بیویوں کو زدوکوب کرنے کی اجازت ہوتی تھی۔ اقتصادی طور پر انہوں نے عورتوں کو ان قوانین سے بچنے میں مدد دی جو خاوندوں کو اپنی بیویوں کی جائداد پر کنٹرول کرنے کی اجازت دیتے تھے۔ انہوں نے عورتوں کے لئے قانون اور طب جیسے پیشوں کے دروازے کھول دیئے اور انہیں اعلیٰ تعلیم تک رسائی بھی دلادی۔ اس طرح وہ ان کی اور ان کے خاندانوں کی زندگیوں میں خوشحالی لانے میں کامیاب ہوگئیں۔ (۵۷)

لیکن انیسویں صدی کی تحریک آزادیٔ نسواں نے عورتوں کو مردوں کے صریحاً ظالمانہ جبر سے آزادی دلاتے ہوئےgylanicابھار کو ایک اور راستے پر ڈال دیا جو اپنی خصوصیات کے باعث اس وقت دکھائی دیتا ہے جب ہم اپنی معیاری کتبِ تاریخ سے باہر نکل کر دیکھیں۔ اس تحریک نے عورتوں کی پہلے سے کہیں زیادہ تعداد کو اس قابل بنا دیا کہ وہ گھر کی چاردیواری سے باہر جا کر اپنے لئے خواہ جزوی طور پر سہی، قدم رکھنے کی جگہ بنا سکیں۔ اس تحریک کی بدولت معاشرے میں وسیع پیمانے پر انسانیت دوستی کا مزاج پیدا ہوگیا۔ Jane Addams, F.Nightingale, Sojourner Truth اورDorothea Dix جیسی خواتین جو ''نسوانی اخلاق'' کا مجسمہ تھیں، گروہوں کی صورت میں ''پبلک ورلڈ'' میں داخل ہونے لگیں تو نرسنگ اور سوشل ورک جیسے نئے پیشے وجود میں آنا شروع ہوگئے۔ غلاموں کو آزاد کرانے کی تحریک ''تنسیخ غلامی'' کو وسیع پیمانے پر عوامی تائید حاصل ہوگئی اور پاگلوں اور دفاعی طور پر کمزور لوگوں کا علاج زیادہ مشفقانہ شکل اختیار کرگیا۔ (۵۸)

مزید برآں یہ وہی زیادہ ''نسوانی'' نظریہ یا شراکتی نظریۂ تعلقاتِ انسانی ہے جو بیسویں صدی کی تحریک آزادیٔ نسواں کے ذریعے معاشرے کے مرکزی دھارے کا حصہ بن گیا۔ انیسویں صدی کی ''تحریکِ نسواں'' کی طرح تحریک آزادیٔ نسواں'' نے بھی عورتوں کے حالاتِ زندگی کو وسیع پیمانے پر بہتر بنایا۔ ایک ایسے دور میں جب فنیاتی ترقی تیزی سے عورتوں کے گھروں کے اندر کے ''خدمت گزار'' کردار کو لیبر فورس میں ''خدمت گزار''

MashalBooks.org

کردار میں تبدیل کررہی ہے تو تحریک آزادیٔ نسواں نیا قانون بنانے کا مطالبہ کررہی ہے تاکہ عورتوں کے گھر کے اندر اور باہر دونوں جگہوں پر آزادی حاصل ہوسکے۔ لیکن ایک بار پھر جدید نسوانیت کی اس دوسری لہر نے عورت اور مرد ''دونوں'' کے حالات کو بہتر بنادیا ہے۔ یہ بہتری اس لئے آئی ہے کہ glyanic شعور سرگرمیوں کے ان دائروں میں بھی داخل ہو چکا ہے جو پہلے صرف مردوں کے کنٹرول میں ہوتے تھے۔

جس طرح انیسویں صدی میں عورتوں نے سیاہ فام غلاموں کو آزاد کرانے کی تحریک میں اہم کردار ادا کیا تھا، بیسویں صدی میں بھی انہوں نے سیاہ فاموں کے شہری حقوق کو تقویت دینے کی حمایت کی ہے اور اس کے لئے موت تک قبول کرلی ہے۔ اسی طرح ساری مغربی دنیا میں جو چھوٹی بڑی سینکڑوں تنظیمیں زیادہ منصفانہ، پُرامن اور ماحولیاتی ہم آہنگی کے لئے جدوجہد کررہی ہیں ان میں عورتوں کی تعداد مردوں سے کہیں زیادہ ہے۔ (۵۹)

تاہم ایک بات واضح ہے کہ سب کی سب عورتیں gylanic اقدار کو پبلک لائف میں نہیں لاتیں۔ مثال کے طور پر جو ''اکلوتی'' عورتیں مردانہ نظامِ مراتب کے اندر رہتے ہوئے بھارت کی اندرا گاندھی یا برطانیہ کی مارگریٹ تھیچر کی طرح بلند مرتبہ پر پہنچ جاتی ہیں وہ عہدے کی لاج رکھتے ہوئے یہ ثابت کرنے میں لگی رہتی ہیں کہ وہ اتنی نرم وملائم، یا ''زنانہ'' نہیں جتنی کہ دکھائی دیتی ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی واضح امر ہے کہ مرد بھی معاشرے کی بہتری اور قیامِ امن کے لئے کام کرتے ہوئے عورتوں کی بہتری یعنی gylanic اقدار کو ملحوظ رکھتے رہے ہیں لیکن ایسا کرنے کے اسباب میں سے ایک سبب یہ ہے کہ یہ وہ زمانے ہوتے ہیں جب نسوانی اقدار (اور خود عورتیں بھی) "Less privitized" ہوتی ہیں۔

۱۹۶۰ء کے عشرے کے اواخر اور ۱۹۷۰ء کے عشرے کے اوائل کے برسوں میں بہت سے امریکیوں کا ویٹ نام کی جنگ کے ''حب الوطنی اور شرافت'' پر مبنی ہونے کے تصور کو مسترد کردینا اس نقطے کی وضاحت کردیتا ہے۔ یہ نہ صرف وہ وقت تھا جب بہت سی عورتوں نے مردوں کے گھروں کے پرائیوٹ دائرے میں محبوس رہنے سے انکار کردیا تھا، بلکہ یہ وہ وقت بھی تھا جب بہت سے مردوں نے اس فرسودہ ''مردانہ'' مطالبے کو مسترد کردیا کہ ان کے پبلک رویئے کو ''حقیقتاً مردانہ'' ہونا چاہیے، ''زنانہ'' نہیں ہونا چاہیے۔ یعنی انہیں شریف، امن پسند اور مشفق ہونا چاہیے۔

MashalBooks.org

یہ کہنے کا یہ مطلب نہیں کہ عورتوں کی حیثیت میں تبدیلی اور زنانہ اقدار کے عروج کے مابین سیدھا سار اعلّت ومعلول کا تعلق ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس وقت جب عورتوں کی خاصی تعداد جبراً اپنا مطالبہ منوالیتی ہے یا سب فوائد سمیٹ لیتی ہے تو ''اینڈروکریٹک backlash'' (مردانہ ردّعمل کا ڈنڈا) پہلے ہی حرکت میں آنے کی تیاریوں میں مصروف ہوتا ہے۔

مثلاً ۱۹۶۰ کے عشرے اور ۱۹۷۰ء کے عشرے میں جوابی ثقافتی تحریک کے دوران نوجوانوں نے جنگ وجدل کے ''مردانہ'' اور ''جوانمردانہ'' کارناموں سے اظہار نفرت کرتے ہوئے نسوانی انداز دلربائی اختیار کرنا شروع کردیئے، عورتوں جیسے بال بنانے اور لباس پہننے لگے۔ دوسری جانب عورتیں مساوی حقوق کے نعروں سے اہم فوائد حاصل کرنے لگیں۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہی پرانے جنسی طور طریقوں کو زبردست انداز میں چیلنج کیا جانے لگا۔ قدامت پسندی کی قوتیں اور مردانہ ردّعمل کی لہریں یکجا ہوکر مساوی حقوق کے قانون (anti ERA) کی دیوار کے ساتھ ٹکرا رہی تھیں۔ اسی طرح نشأۃ ثانیہ اور عہدِ الزبتھ میں جہاں ہم "gylanic" قوتوں کا زور وشور پا رہے تھے وہاں ساتھ ساتھ ''اینڈروکریٹک'' مزاحمت بھی صاف دکھائی دے رہی تھی۔ ایک طرف حکمران طبقے کی عورتوں کے لئے مساوی تعلیم کا رجحان نظر آتا تھا جس کے ہمراہ کرسٹائن ڈی پیسان کی کتاب ''بک آف سٹی لیڈیز'' (۶۰) قسم کا نسوانی ادب لکھا جارہا تھا، اور دوسری جانب عورتوں کی تذلیل مہم شدّت پکڑ رہی تھی۔ نئے قوانین ان کی اقتصادی اور سیاسی قوت کو محدود کررہے تھے اور ادب کی ایک ایسی صنف ابھر رہی تھی جس میں عورتوں کو واقعتاً ان کے ''نسوانی روپ'' یعنی تابعدار اور خدمت گزار کردار میں دکھایا جارہا تھا۔

یہ سب کچھ ہمیں ایک آخری اور بنیادی نقطے کی پہنچا رہا ہے وہ یہ کہ عورتوں کے عروج کے ادوار میں مردانہ نظام کے ڈھانچے میں وقتاً فوقتاً واقع ہونے والی کچھ کمزوری کے باجود حالیہ وقتوں تک عورتوں کی اطاعت گزاری کی حیثیت میں کوئی خاص تبدیلی نہیں آئی۔ اسی تناظر میں شفقت، پالنے پوسنے اور عدم تشدد کی جو پرانی اقدار عورتوں کے ساتھ وابستہ چلی آرہی ہیں، ان کی کم حیثیتی بھی برقرار ہے۔

آخری حد

جیسا کہ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ساری ریکارڈ شدہ تاریخ میں مردانہ (اینڈروکریٹک) نظامِ زندگی میں پہلی ''دفاعی'' لائن یہ رہی ہے کہ مرد کا کنٹرول ہر قیمت پر قائم رکھا جائے۔ تاریخ کی روشنی میں اس سے بھی صحیح تربات وہ ہے جیسے کہ پچھلے صفحات میں جائزہ لیا گیا ہے، عورتوں کو مزید دبانے کے لئے قدم بڑھائے گئے تو وہ اس امر کی پیشنگوئی ہوگی کہ تاریخ کا ایک استبدادی اور خون ریز زمانہ شروع ہونے والا ہے۔ جیسا کہ میکلیلینڈ روسزک اور ونٹر نے اتنی واضح شہادتوں کے حوالے سے کہا ہے کہ یہ سب نقاط اس وحشت انگیز نتیجے کی طرف اشارہ کرتے ہیں کہ اگر عورتوں کا جبری استحصال ختم نہ کیا گیا اور شراکت دارانہ احساسات اور التفات ونگہداشت کی اقدار کے تحفظ کا حتمی فیصلہ نہ کیا گیا تو ہم ناگزیر طور پر جنگ سے دوچار ہوکر ایک اور خون آشام عہد کی طرف لڑھکتے چلے جائیں گے۔

میکلیلینڈ کی ریسرچ بتاتی ہے کہ لٹریچر اور آرٹ میں تشدد پر مبنی موضوعات کی بھرمار کس طرح جنگ وجدل اور جبرواستبداد کے زمانوں کی پیشنگوئی کرتی ہے۔ عصمت دری کے خوگر ''ڈان جوآن'' پر ونٹر کی ریسرچ بتاتی ہے کہ عورتوں پر استحصالی جبر کا موضوع اور بھی زیادہ خصوصیت کے ساتھ تشدد اور جنگ کے ادوار کی پیشنگوئی کرتا ہے اور آج کی دنیا میں عورتوں پر بڑھتے ہوئے مظالم صرف کہانیوں میں نہیں بلکہ حقیقت میں برپا ہیں۔

نظریاتی طور پر ہماری دنیا عیسائیت اور اسلام کی بنیاد پرستی پر مبنی عورت دشمن عقائد کے نرغے میں ہے۔ ادب اور فلموں میں عورتوں پر ایسے تابڑتوڑ حملوں کی داستانیں دکھائی جاتی ہیں، جن کی اس سے پہلے کوئی مثال نہیں ملتی، کہیں عورتوں کو قتل ہوتے اور کہیں ایسے طریقے سے عصمت دری کی شکار ہوتے دکھایا جاتا ہے کہ جن کے سامنے میں پرانا ادبی تشدد (مثلاً Taming of the Shrew یا Don Juan) مدھم پڑجاتا ہے۔ اور حال میں اربوں ڈالر کی صنعت کے ذریعے جوسخت جان فحش گوئی، فحش بیانی اور فحش نمائشی کی جارہی ہے، اس کی بھی ماضی میں کوئی مثال نہیں ملتی، مارکیٹ میں بے شمار کتابیں رسالے فلمیں اورحتیٰ کہ کیبل ٹیلی ویژن یہ پیغام پھیلارہے ہیں کہ ''جنسی تلذّذ کا اصل راز تشدد میں مضمر ہے، عورت کو جتنی

زیادہ ذلیل کیا جائے گا، جتنی زیادہ اذیت دی جائے گی۔ اس کے اعضا کے ساتھ جتنا زیادہ ناروا سلوک کیا جائے گا، اتنی ہی زیادہ لذت حاصل ہوگی۔'' (۶۱)

جیسا کہ تھیوڈور روسزک نے نوٹ کیا کہ ۱۹ ویں صدی کی تحریک نسواں کو درپیش مزاحمت کی ایک خصوصیت یہ تھی کہ اس پر ''تندوتیز حملے'' کئے جارہے تھے۔ گھروں میں عورتوں کی نہ صرف مارکٹائی ہوتی تھی بلکہ انہیں زندہ جلانا ہڈیاں توڑ دینا، یا آنکھیں نکال دینا بھی عام بات تھی۔ (۶۲) کیونکہ پوری ریکارڈ شدہ تاریخ میں جب کبھی اینڈروکریٹک نظام کو بنیادی خطرہ محسوس ہوتا تھا وہ خطرہ بننے والوں پر ہر تشدد کو جائز سمجھتا تھا۔ بیسویں صدی میں تحریک آزادئ نسواں کے دوران عورتوں پر مظالم مسلسل بڑھتے رہے۔ اس کی مثالیں ہندوستان میں دلہنوں کو جلا دینا، ایران میں عورتوں کو سرعام پھانسی چڑھا دینا، لاطینی امریکہ میں قید اور اذیت رسانی اور دنیا بھر میں بیویوں پر تشدد اور زنا بالجبر عالمی دہشت گردی کی طرح پھیل گیا ہے۔ سکالرز کا اندازہ ہے کہ اس وقت امریکہ میں ہر ۳ اسکنڈوں میں ایک زنا بالجبر کا واقعہ ہورہا ہے۔ (۶۳)

نظریۂ ثقافتی تقلیب کے تناظر میں دیکھا جائے تو آج جگہ جگہ عورتوں پر مظالم ڈھائے جانے کے واقعات موجودہ نظام کی کارگزاری (function) کے طور پر ہوتے دکھائی دیتے ہیں۔ اگر ''اینڈروکریسی'' برقرار رکھنی ہے تو عورتوں کو ہر قیمت پر کچلا جانا چاہیے۔ اور اگر یہ تشدد ہمارے پورے کرۂ ارض پر بڑھا جارہا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اس سے پہلے مرد کے غلبے کو عورتوں کی ایک طاقتور اور عالمی سطح پر منظم تحریکِ انسانی آزادی کے ذریعے اتنی شدت سے کبھی چیلنج نہیں کیا گیا۔ فطرتِ انسانی ظلم وتشدد کو زیادہ دیر تک برداشت نہیں کرسکتی۔ اس سے زیادہ ظلم کیا ہوسکتا ہے کہ مرد اپنے جنسی جذبے کی تسکین عورتوں کو ایذا پہنچا کر، زنا بالجبر کرکے اور قتل کرکے حاصل کرنے لگیں انہیں لگام دینے کے لئے عورتوں کا ہر سطح پر منظم ہونا ایک فطری جواب تھا، جواب دیا جارہا ہے۔

دنیا نے اس پہلے سرکاری اور غیر سرکاری تنظیموں کی کھمبیوں کی طرح تیز رفتاری سے پھیلتی ہوئی تعداد کبھی نہیں دیکھی جن کی رکنیت بھی لاکھوں میں ہے۔ ان کی گروپنگ سرکاری آل چائنا ویمنز فیڈریشن سے لے کر نیشنل ویمنز سٹڈیز ایسوسی ایشن، نیشنل آرگنائزیشن فارویمن اور اولڈ ویمنز لیگ اِن یونائیٹڈ سٹیٹس تک پھیلی ہوئی ہے۔ ان سب نے عورتوں کی

MashalBooks.org

حیثیت بہتر بنانے کا عزم کر رکھا ہے۔ اس سے پہلے کبھی اقوام متحدہ کا عشرہ برائے خواتین نہیں دیکھا گیا۔ اس سے پہلے کبھی گلوبل کانفرنسز کی نوبت نہیں آسکی تھی جن میں دنیا کے کونے کونے سے آنے والی عورتیں مرد کی بالادستی سے پیدا ہونے والے مسائل پر اپنے خیالات کا اظہار کرتی رہیں۔ ساری ریکارڈ شدہ تاریخ میں اس سے پہلے اس کرۂ ارض کی ہر قوم کی عورتوں نے اکٹھی ہو کر جنسی برابری، اپنی ترقی اور امن کے لئے جدوجہد کے عزم کا اظہار نہیں کیا تھا۔ یہ تین مقاصد اقوام متحدہ کے اولین عشرہ برائے ترقی نسواں کے تحت متعین کئے گئے ہیں۔ (۶۵)

عورتوں (اور مردوں) کی طرف سے یہ روز افزوں آگہی کہ یہ تینوں مقاصد آپس میں گہرا تعلق رکھتے ہیں، اس حرکیات کے وجدانی شعور میں سے ابھری ہے جس کا ہم جائزہ لیتے رہے ہیں۔ کیونکہ اگر ایک بار عورتوں کے خلاف مردانہ تشدد کے اثرات ونتائج کا ادراک حاصل ہوجائے تو یہ دیکھنا مشکل نہیں رہے گا کہ جن مردوں کو یہ پڑھایا جاتا ہے کہ انہیں لازماً اس نصف انسانیت کو دبا کر رکھنا ہے جو جسمانی طور پر ان سے زیادہ مضبوط نہیں ہے، تو وہ یہ بات بھی سوچیں گے کہ کمزور مردوں اور قوموں کو فتح کرنا ان کی ''مردانہ'' ڈیوٹی ہے۔

خواہ یہ قومی دفاع کے نام پر کیا جائے جیسا کہ امریکہ اور روس کرتے ہیں یا خداوند تعالیٰ کے مقدس نام پر کیا جائے جیسا کہ مسلم دنیا کرتی ہے، جنگ یا جنگ کے لئے تیاری نہ صرف مرد کے غلبے اور مرد کے تشدد کو تقویت دیتی ہے بلکہ (جیسا کہ ہٹلر کے جرمنی اور سٹالن کے روس نے کر دکھایا تھا) یہ ''اینڈروکریسی'' کے تیسرے بڑے جزو مطلق العنانیت (authoritarianism) کو بھی تقویت دیتی ہے۔ جنگ کے ادوار قیادت کے لئے ''مردِ آہن'' کا جواز فراہم کرتے ہیں اور شہری آزادیوں اور حقوق کے تعطل کا بھی جواز بنتے ہیں۔ جس کی مثال ۱۹۸۳ء میں گریناڈا پر امریکی حملے کے موقع پر خبروں کا بلیک آؤٹ تھا۔ اسی طرح افریقہ، ایشیا اور لاطینی امریکہ میں یکے بعد دیگرے جنگ کی لپیٹ میں آنے والے ممالک میں لگنے والا مارشل لا تھا۔

ماضی میں پنڈولم ہمیشہ امن سے واپس جنگ کی طرف آتا رہا۔ جب بھی ''نسوانی'' اقدار تھوڑے سے وقفے کے لئے اوپر ابھریں، نظام کی تبدیلی کی دھمکی دی تو اینڈروکریسی

نے مشتعل اور خوف زدہ ہو کر ہمیں پیچھے کی طرف دھکیل دیا ہے لیکن کیا جھولے کے موجودہ ہلارے کو ناگزیر طور پر زیادہ سے زیادہ ملکی اور غیر ملکی تشدد کی طرف لوٹنا ہے اور اس کے ساتھ ساتھ شہری آزادیوں اور حقوق کو زیادہ سے زیادہ سلب کرنا ہے؟

کیا واقعی ایک اور جنگ (جو اس بار ایٹمی ہوگی) کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے؟ کیا یہ اس ثقافتی ارتقا کا خاتمہ ہے جو دیوی کے عہد میں شروع ہوا تھا جب زندگی بخش جام ہنوز اعلیٰ وارفع تھا؟ یا اب ہم اپنی وہ آزادی حاصل کرنے کے کافی قریب پہنچ چکے ہیں کہ اس انجام سے دوچار ہونے سے بچ سکیں؟

MashalBooks.org

باب 11

چھٹکارا: نامکمل تقلیب

ہمارے زمانے کو جدید دور بننا تھا، توہمات کی جگہ روشن خیالی نے لینا تھی، بربریّت کی جگہ انسان دوستی (humanism) نے لینا تھی اور ریاکاری اور کٹر مذہبی عقیدے کی جگہ بالآخر تجرباتی ومشاہداتی علم نے لینا تھی۔ شاید اس سے پہلے جادوئی قوتیں ''لفظ'' سے منسوب نہیں ہوئی تھیں کیونکہ یہ صرف الفاظ تھے اور وہ مادہ تھا جس نے انسانی ذہن کے لئے منطقی شعور کے ذریعے سوچنا ممکن بنایا تھا۔ اسی کے ذریعے تمام پرانی نامعقولیتوں، خام خیالیوں اور روگوں کا علاج ہونا تھا۔ جبکہ الفاظ اور بالخصوص تحریر شدہ الفاظ یہاں تک کبھی نہیں پہنچے تھے اور نہ انہیں اتنی وسعت حاصل ہوئی تھی۔

اس کا ایک سبب یہ تھا کہ اس سے پہلے انسانوں کی اتنی بڑی تعداد پڑھی لکھی نہیں تھی اور اس سے پہلے ابلاغ کے نئے ذرائع اتنے زیادہ نہیں تھے کہ وہ الفاظ کو ہمارے کرۂ ارض کے اتنے زیادہ باشندوں تک پھیلاتے۔ جب ہم اس دور میں داخل ہوتے ہیں جسے فلسفی مؤرخ ہنری ایکن آئیڈیالوجی کا دور [۱] کہتا ہے، اس میں ایک عظیم معاشرتی وفنیاتی تبدیلی آگئی۔ یہ تبدیلی یا ''دوسری لہر'' ایلوین ٹوفلر کی اصطلاح میں تناسب کے لحاظ سے ہزاروں برس پہلے آنے والے زرعی انقلاب کی ''پہلی لہر'' سے تقابل پذیر تھی۔ [۲] صنعتی انقلاب اگرچہ وہ ہنوز بنیادی طور پر مغرب تک محدود تھا، اپنے ہمراہ نئی ٹیکنالوجیز کی بھرمار لے کر آیا۔ ان ٹیکنالوجیز میں پرنٹنگ پریس بھی شامل تھا جس نے وسیع پیمانے پر کتابوں، رسالوں اور

MashalBooks.org

اخبارات کی اشاعت وتقسیم ممکن بنا دی۔ پھر سمعی میڈیا، ٹیلی گراف، ٹیلی فون اور ریڈیو آ گیا، آ گے چل کر ان کا تعاقب کرتا ہوا بصری ماس میڈیا، موویز اور ٹیلی ویژن آ گئے جنہوں نے بھاری بھرکم کتابوں، رسالوں اور اخبارات کے ساتھ مل کر دنیا بھر میں الفاظ کی بارش برسا دی۔

الفاظ نے بڑے پیمانے پر نظریات پھیلائے لیکن مغرب میں خصوصی طور پر جو نظریاتی دھماکہ ہوا اس کا ایک اور سبب تھا۔ تیز رفتار صنعت کاری کے باعث جوں جوں مذہبی نظریات کمزور پڑتے گئے، عوام میں نئے نئے خیالات کے لئے بھوک اور شوق بڑھتا چلا گیا۔ وہ اصل حقائق تک رسائی کے متمنی تھے جو انہیں الفاظ کے مجموعوں، یعنی نئے نظریات کی صورت میں ملے۔

جلد ہی کچھ ایسی آوازیں سنائی دینے لگیں جنہیں بعض لوگ ''سیکولر کلرجی'' یعنی فلاسفر اور سیاستدان کہتے تھے۔ مغربی دنیا نے ان کے نظریات بڑے ذوق وشوق سے سنے اور قبول کئے۔ انیسویں صدی میں وہ ہر کہیں موجود تھے۔ وہ حقیقت کی اپنے طور پر تشریحات کرتے تھے اور پہلے سے موجود معلومات کی از سرِ نو وضاحت کرتے جا رہے تھے۔ کانٹ اور ہیگل، کوپرنیکس اور گلیلیو، ڈارون اور لاووسائر، مِل اور روسو، مارکس اور اینجلز جدید اناجیل کے پرچارک تھے جنہوں نے پرانے سیکولر پیغمبروں کے طور پر سیکولر ''لفظ'' کی تشریح وتعبیر کی۔ ایسے فلسفی اور سائنسدان اور بھی تھے مگر انہیں خصوصی طور پر پڑھا اور سنا جاتا تھا۔

عقل کی کوتاہیاں

یہ ثقافتی تقلیب کے پیغمبر بنتے جا رہے تھے۔ انہوں نے انسانی دماغ کو عقل واستدلال کے ذریعے آزادی کی راہ دکھائی۔ اب ''معقول مرد'' (جو اٹھارہویں صدی کی روشن فکری کی پیداوار تھا) ماضی کی بربریت کو پیچھے چھوڑ کر آگے کو بڑھنے والا تھا۔

صنعتی انقلاب کے ذریعے ہمارا فنیاتی ارتقا تیزی سے اوپر کی جانب بڑھ رہا تھا، اس کے ساتھ جلد ہی ہمارے ثقافتی ارتقا نے آگے کی منزلیں طے کرنی تھیں۔ اسی طرح نئی مادی ٹیکنالوجیز مثلاً مشینیں اور دواسازی بظاہر کراماتی تبدیلیاں لا رہی تھیں۔ معاشرتی ٹیکنالوجیز مثلاً انسانی روّیوں کی تنظیم ورہنمائی کے بہتر طریقے انسان کی امکانی قوتوں اور جذبوں کو

تیزی سے بار آور کرنے والے تھے..... آخرکار انصاف، سچائی اور حُسن کے لئے انسان کی دیرینہ آرزوئیں پوری ہونے والی تھیں۔

مگر رفتہ رفتہ ان بڑی بڑی توقعات اور وعدوں میں کمی واقع ہونے لگی۔ کیونکہ انیسویں اور بیسویں صدیوں میں ''معقول مرد'' نے ہرموڑ پر اپنی ساتھی اور بہن اور دیگر انسانوں کو قتل کرنا، دباؤ میں لانا، ان کا استحصال کرنا اور ان کو ذلیل کرنا شروع کردیا۔ نئے ''سائنسی'' نظریات مثلاً انیسویں صدی کے سماجی ڈارون ازم سے جواز پاکر گھٹیا نسلوں کی اقتصادی غلامی کا سلسلہ جاری رکھا گیا۔ نوآبادتی جنگیں ''کافروں کو بچانے'' یا خداوند اور بادشاہ کی عظمت کی خاطر لڑنے کی بجائے ''معقول'' اقتصادی اور سیاسی مقاصد مثلاً ''فری ٹریڈ'' اور حریف اقتصادی اور سیاسی قوتوں کا ''راستہ بند''(containment) کرنے کے لئے لڑی جاتی رہیں اور اگر عورتوں پر مرد کے کنٹرول کو حوّا کی نافرمانیٔ رب کے حوالہ سے غیر معقول بنیادوں پر برقرار نہیں رکھا جاسکتا تھا تو اب اس کا جواز نئے ''معقول سائنسی'' عقائد کی روشنی میں تلاش کیا جانے لگا۔ جن میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ مرد کی بالادستی ایک حیاتیاتی اور (یا) سماجی قانون ہے۔

اب ''معقول مرد'' بتانے لگا ہے کہ وہ کس طرح فطرت کو ''قابو'' میں لائے گا، عناصر کو ''زیر کرے گا'' (اور عظیم ۲۰ ویں صدی میں ترقی کرتے کرتے) خلا کو ''مسخر'' کرے گا۔ اس نے یہ دعویٰ بھی کیا کہ اسے کس طرح امن، آزادی اور مساوات کے لئے جنگیں لڑنا پڑی ہیں۔ اسے دہشت گردی کرنے والے بچے، عورتیں اور مرد ہلاک کرنے پڑے ہیں تاکہ محکوم لوگوں کا وقار اور آزادی برقرار رہ سکے۔ سرمایہ دار اور اشترا کی دنیاؤں کے اشرافیہ کے رکن کی حیثیت سے اس نے جائدادوں اور مراعات پر قبضہ جمائے رکھا۔ منافع کمانے یا بھاری کوٹہ ہتھیانے کے لئے بھی وہ ماحول کو ایک ضابطے کے مطابق زہر آلود کرتا رہا اور مختلف انواع کو نابود کرنے کا باعث بنا۔ اس سے انسانی جانوں کو نقصان پہنچا اور بچے طرح طرح کی جسمانی معذوریوں کے شکار ہوتے رہے۔ لیکن یہ دعویٰ کرتے کرتے اس پر ذرا بھی تھکن طاری نہیں ہوئی کہ وہ سب کچھ حب وطن یا آئیڈیل ازم کے لئے کرتا رہا ہے، اور یہ سب کچھ معقولیت پر مبنی ہے۔

بالآخر آشوٹز (پولینڈ میں نازیوں کا عقوبت خانہ) اور ہیروشیما (جہاں امریکہ نے پہلی

بار ایٹم بم استعمال کیا) کے بعد معقولیت کے وعدے پر سوالات اٹھنے شروع ہوگئے۔ اس سوال کا معقول جواب کیا تھا کہ انسانی چربی کو صابن بنانے کے لئے کیوں استعمال کیا گیا؟ یا ''ہائی جینک شاور'' کو زہریلی گیس کے لئے کیوں استعمال کیا گیا؟ ایٹم بم کو فوجی تجربات کے طور پر اور بالکل بے بس انسانوں پر ریڈیائی تابکاری استعمال کرنے کا معقول جواز کیا تھا؟ کیا اتنے بڑے پیمانے پر تباہ کاری کو انسانیت کی پیشقدمی کہا جاسکتا تھا؟

کیا دھماکہ خیز بارود کی وافر مقدار میں تیاری، پوری پوری آبادیوں کو اسمبلی لائینز میں تبدیل کردینا اور افراد کی کمپوٹرائزیشن کر کے انہیں نمبروں میں تبدیل کردینا ہماری انواع کی آگے کو پیشقدمی تھی؟ یا کیا جدید پیشقدمی جس کے نتیجے میں زمین، سمندر اور ہوا زہر آلود ہوجاتی ہے ثقافتی رجعت کے مظاہر تھے یا ثقافتی ترقی کے؟ چونکہ ''معقول مرد'' ہمارے کرۂ ارض کی تذلیل اور اس کی تباہی پر کمربستہ ہے کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ اس زمانے کے ''مذہبی مرد'' کی طرف رجوع کیا جائے جب سائنس نے اتنی ترقی نہیں کی تھی جس نے ہمیں سیکولر ٹیکنالوجیکل دور میں لا پھینکا؟

بیسویں صدی کی آخری چوتھائی میں پہنچنے پر فلاسفر اور ماہرین معاشرتی علوم نہ صرف ''معقولیت'' کے بارے میں سوالات پوچھ رہے تھے بلکہ دور جدید کے تمام ترقی پذیر نظریات پر نئے سرے سے غور کرنے لگے تھے۔ نہ سرمایہ داری نے اور نہ ہی کمیونزم نے اپنا وعدہ پورا کیا۔ ہر جگہ ''لبرل ازم'' کی بات ہورہی تھی جیسا کہ ''حقیقت پسندوں'' کا دعویٰ تھا کہ آزادی اور مساوات پر مبنی معاشرے کا قیام سوائے یوٹوپیائی خواب کے کچھ بھی نہیں۔

دنیا بھر کے لوگ ترقی پسند سیکولر نظریات کی مبینہ ناکامی سے مایوس ہوکر بنیاد پرستانہ عیسائیت، مسلم اور دیگر مذاہب کی تعلیمات کی طرف واپس جانے لگے۔ عالمی سطح پر رونما ہونے والے انتشار سے خوفزدہ ہوکر وہ اس اینڈ وکرٹیک تصوّر میں پناہ لینے لگے کہ اصل چیز وہ زندگی نہیں جو اس زمین پر پائی جاتی ہے۔ اگر ہم احکامات الٰہی کی خلاف ورزی کریں تو آخرت کی دائمی زندگی میں عذاب پاتے رہیں گے۔

جب ایٹمی اسلحہ کے استعمال سے عالمی سطح پر ہونے والی تباہی کا اندیشہ ہے اور مروّجہ نظام کا کوئی حقیقی متبادل بھی موجود نہیں تو پھر ناقابلِ حل بحرانوں سے نمٹنے کے صرف تین طریقے ہوسکتے ہیں۔ ایک یہ کہ قدیم مذہبی نقطۂ نظر کے مطابق ہم پیچھے ماضی میں چلے

جائیں جہاں سے ہمیں بتایا جائے گا کہ واحد راہ نجات آخرت ہے۔ جیسا کہ بنیاد پرست عیسائی فرقہ "born-again" یا شیعہ مسلم بتاتے ہیں کہ خدا اپنے تابع فرمان بندوں کو جزا اور نافرمانوں کو سزا دے گا۔ دوسرا طریقہ فوری فرار کی شکلیں ہیں: "nihilism" (ہر شے کے وجود سے انکار یا عدمیّت) یعنی مذہب اور اخلاق سے روگردانی "desensitization" (ازالۂ حسیّت) اور "hopelessness" (نااُمیدی)۔ یہ زندگی کی بے ثباتی کے یاس انگیز نغمے الاپنے اور تکلیفوں کے احساس کو ختم کرنے کے اشغال اختیار کرنے کا راستہ ہے جو شراب، چرس ہیروئن اور کوکین کا استعمال سکھاتا ہے یا مکینیکل انداز میں جنسی سرگرمیوں میں پڑ کر سب کچھ فراموش کردینے اور ''ماڈرن تفریحات'' کی انڈسٹری کے ذریعے رحم وہمدردی کے جُملہ احساسات سے عاری ہوجانے کا راستہ ہے۔ جس کا آغاز رومن ایمپائر کے آخری دنوں کے خونی سرکسوں سے ہوتا ہے جبکہ تیسرا راستہ معاشرے کو دھکیل کر تصوراتی بہتر ماضی یعنی ''ان سہانے دنوں'' میں کھوجانے کا ہے، یہ اس سے پہلے کا زمانہ تھا جب عورتیں اور ''گھٹیا مرد'' فطری نظام میں اپنے صحیح مقام کے بارے میں استفسار کرنے لگے تھے۔

لیکن ہم اپنے حال وماضی کی ازسرنو جانچ پڑتال کے حوالے سے جس منظر کو آگے بڑھا رہے ہیں اس میں یہ ساری ناامیدی بے بنیاد ہے۔ یہ سب لاعلاج نہیں ہے اگر ہم یہ بات تسلیم کرلیں کہ یہ انسان کی فطرت نہیں بلکہ یہ معاشرے کے تسلّط ماڈل کا نتیجہ ہے کہ اس دور کی اعلیٰ ٹیکنالوجی ہمیں دھکیل دھکیل کر ایٹمی جنگ کی طرف لے جارہی ہے۔ یہ سب بیکار نہیں ہے اگر ہم یہ بات تسلیم کرلیں کہ یہ اس نظام کا نتیجہ ہے، نہ کہ کوئی بے رحم خدائی یا فطری قانون ہے جو فنیاتی ہنرمندیوں کو کسی کو مغلوب یا تباہ کرنے کے بہتر طریقے استعمال کرنے کا مطالبہ کررہا ہے۔ خواہ یہ ہمیں عالمی دیوالیہ پن اور بالآخر ایٹمی جنگ کی طرف دھکیل دے۔ مختصر یہ کہ اگر ہم اپنے حال کو نظریۂ ثقافتی تقلیب کے تناظر میں دیکھیں تو یہ واضح ہوجاتا ہے کہ طاقت کے بل بوتے پر قائم موجودہ نظام مراتب کے متبادل موجود ہیں۔ اس نظام نے ایک نصفِ انسانیت کو دوسرے نصف انسانیت کے زیر تسلط کر رکھا ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ مغربی معاشرے کی عظیم تقلیب جو اٹھارویں صدی کی روشن خیالی سے شروع ہوئی یہ ناکام نہیں ہوئی بلکہ نامکمل رہ گئی ہے۔

اینڈروکریٹک تصورات کے لئے چیلنج

اٹھارہویں صدی کی روشن خیالی میں سے جو نظریات برآمد ہوئے وہ درحقیقت جزوی طور پر نئے ہیں۔ یہ وہ "gylanic" نظریات ہیں جن کا ہم نے ابتدائی ابواب میں جائزہ لیا ہے، ان کی جڑیں ماضی کی گہرائیوں میں پیوست ہیں۔ یہ نظام تسلّط کی نسبت نظامِ شراکت سے زیادہ قربت رکھتے ہیں۔ یہ ان اقسام کے نظریات تھے جو روشن خیالی کے دور میں ازسرنو زیادہ جدید شکلوں میں ابھرے تاکہ Madame Geoffrin اور Madame du chatlet جیسی عورتوں کے Salons میں نئے سرے سے نشوونما پاسکیں۔ شروع میں صدیوں کے عدم استعمال یا غلط استعمال کی وجہ سے وہ ایک مختصر سے تعلیم یافتہ طبقے کے لئے کسی قدر جودتِ طبع کا سامان رہے۔ لیکن پھر ابلاغِ عامہ کی بہتر ٹیکنالوجیز کی وجہ سے پرنٹنگ پریس اور تعلیم عام ہوجانے کی بدولت یہ نظریات (اگرچہ معاشرے کے تسلّط ماڈل سے مناسبت نہیں رکھتے تھے) ہر جگہ موضوعِ بحث بننے لگے اور ان پر عمل بھی ہوتا تھا۔

ان میں سے ایک سب سے زیادہ پرانا اور اہم ترین تصور، نظریۂ ترقی تھا، کیونکہ اگر کائنات کو مذہبی عقیدے کے تحت ایک زبردست طاقت رکھنے والے خدا نے اپنی تشبیہہ کے مطابق نہیں بنایا تو عالمِ فطرت، معاشرے اور ''مرد'' میں اصلاح وترقی کا امکان حقیقتاً موجود ہوتا۔ اس نقطے پر زور وہ لوگ دیتے ہیں جن کا استدلال یہ ہوتا ہے کہ مغربی ثقافت میں سب سے بڑی پیش رفت یہ ہے کہ یہاں مذہبی تصورات کی جگہ سیکولر تصورات نے لے لی ہے۔ لیکن یہ نقطہ جسے نظرانداز کیا گیا یہ ہے کہ جس چیز کو مسترد کیا گیا ہے وہ مذہب نہیں ہے بلکہ مردانہ نظام کا یہ قضیہ (androcratic premise) مسترد ہوا ہے کہ جامد اور مراتب پر مبنی سماجی نظام منشائے خداوندی ہے۔ [۳]

جب ۱۷۳۷ میں ''ایبے ڈی سینٹ پیری نے اپنی کتاب "Observations on the Continuous Progress of Human Reason" لکھی تو اس نے اس بات کا شاید پہلی بار غیر مبہم الفاظ میں اظہار کیا کہ ''انسانیت کے سامنے ترقی پذیر دنیا کا ایک طویل اور وسیع منظر پھیلا ہوا ہے۔'' [۴] کرۂ زمین پر انفرادی اور اجتماعی زندگی کو ترقی دینے کے مواقع کا ذکر کرنا ان مسیحی عقائد کو کھلم کھلے طریقوں سے مسترد کردینے کے مترادف تھا کہ یہ زمین ایک قسم کی

MashalBooks.org

امتحان گاہ ہے جہاں انسانوں کو چند لگے بندھے طریقے سے زندگی گزارتی ہے تاکہ وہ آخری منزل کو اپنے لئے حقیقی طور پر آرام دہ بنا سکیں اور آخری منزل یہاں زمین پر نہیں بلکہ اس کے بعد کی زندگی ہے۔ ایسے ڈی سینٹ پیری کے خیالات سے جابرانہ غیر مبدّل حالت (status quo) کو حمایت نہیں ملتی، بلکہ یہ مسلسل آگے کو بڑھتے ہوئے انسانی تخیلات اور آرزؤوں کی حمایت کرتے ہیں کیونکہ نظریۂ ترقی اس قانونی معاشرتی اور اقتصادی پیش رفت کا جزوِ لازم تھا جو حقیقتاً اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں رونما ہوئی تھی۔

دو باہمی طور پر متصل تصورات ''مساوات'' اور ''آزادی'' بھی اینڈروکریٹک نظریے میں ایک بنیادی دراڑ بن کر سامنے آئے۔ ۱۶۵۱ء میں تھامس ہابز نے اپنی کتاب Leviathan میں لکھا کہ ''فطرت نے مردوں کو جسمانی اور ذہنی صلاحیتوں کے لحاظ سے اس قدر مساوی بنایا ہے کہ...... جب سب کا اکٹھا حساب کتاب کیا جائے، تو ایک مرد سے دوسرے مرد کا فرق اتنا زیادہ نہیں ہوتا کہ اس کے نتیجے کے طور پر وہ اپنے لئے ان فوائد کا دعویٰ کر سکے جن کا دعویٰ کوئی دوسرا نہ کر سکتا ہو'' (۵)

اس کے بعد کی صدی میں فرانس میں ژین ژاک روسو نے لکھا کہ نہ صرف ''مرد'' آزاد اور مساوی پیدا ہوئے بلکہ یہ کہ یہ ان کا ''فطری حق'' تھا جس نے انہیں ''اپنی زنجیریں تڑوانے'' کے مستحق بنادیا۔ (۶) یہ اس حقیقت کا روپ تھا جو امریکی انقلاب اور فرانسیسی انقلاب کا مرکزی حصہ بننے والا تھا۔ اسی صدی میں برطانیہ میں میری وولسٹون کرافٹ نے زور دیا کہ یہ ''فطری حق'' جس طرح مردوں کا ہے اسی طرح عورتوں کا بھی ہے۔ یہ نقطۂ نظر دیگر جاری نسوانی تحریکوں میں بھی مرکزی حیثیت رکھتا تھا۔ (۷)

پھر انیسویں صدی میں اگسٹ کونٹ نے ''واقعیت'' (positivism) اور قانونِ ترقیِ انسان کے بارے میں لکھا۔ جان سٹوارٹ مل نے نمائندہ حکومت کو مطلوب اخلاقی اور ذہنی صفات کے فروغ کے لئے بے حد موزوں قرار دیا اور کارل مارکس نے، (جو اینڈروکریٹک عہد سے قبل کے زمانے کی اوّلین دریافتوں سے کسی حد تک متاثر تھا) غیر طبقاتی معاشرے کو وجود میں لانے کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ ''ہر فرد کی آزادانہ نشوونما، سب کی نشوونما کے لئے شرطِ اولین ہے'' (۸)

ان جدید سکیولر فلسفیوں کے مابین بہت سے اختلافات سے صرف نظر کرتے ہوئے ان

کا جو مشترکہ ردِ ''اینڈروکریٹک'' مفروضہ سامنے آیا وہ یہ تھا کہ مناسب معاشرتی حالات میں بنی نوع انسان آزادانہ اور منصفانہ آہنگ کے ساتھ زندگی گزارتا تھا اور آئندہ بھی گزار سکتا ہے۔ بہ الفاظِ دیگر اگرچہ ان اصطلاحات کو استعمال نہیں کیا گیا لیکن جو کچھ ان عورتوں اور مردوں نے تصوّر کیا تھا وہ تسلّط پر مبنی معاشرہ نہیں بلکہ شراکت پر مبنی معاشرے کا خواب تھا۔

''بنی نوع انسان'' کی اصطلاح کو اس وقت ''مردوں'' اور ''مذکر اولاد'' کے مترادف سمجھا جاتا تھا اور اب بھی ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔ اس طرح اٹھارہویں اور انیسویں صدی میں انسانی حقوق کے نئے عہدو پیمان کا عمومی اطلاق مردوں پر سمجھا گیا۔ درحقیقت اولاً یہ عہدو پیمان صرف ان مردوں کے لئے مخصوص تھا جو سفید فام، آزاد اور صاحبِ جائیداد تھے تاہم ماضی سے مختلف مواقع پر بنیادی نظریاتی انقطاع کے باعث معاشرتی حقائق میں بھی بنیادی تبدیلیاں آ گئیں جنھوں نے تمام عورتوں اور مردوں کی زندگیوں پر بے پناہ اثرات مرتب کئے۔

امریکی انقلاب اور بعدازاں فرانسیسی انقلاب میں بادشاہت کے ادارے کو چیلنج کر دیا گیا (جو کہ صدیوں سے اینڈروکریٹک معاشرتی تنظیم کا بنیادی پتھر چلا آ رہا تھا) لوگوں کی بہت بڑی تعداد کے ذہنوں میں موجود تین جملوں ''آقا سے وفاداری'' ''نظم وضبط'' اور ''اطاعت'' کی جگہ ''مساوات''، ''آزادی'' اور ''ترقی'' نے لے لی۔ بیشتر مغربی دنیا میں بادشاہتوں کی جگہ بتدریج جمہوری مملکتیں قائم ہو گئیں اور مذہبی مدرسوں کی جگہ سیکولر سکول وجود میں آ گئے۔ مرد کے زیر تسلّط خاندان جن میں باپ اور خاوند کے منہ سے نکلا ہوا لفظ بادشاہوں کے لفظ کی طرح ایک قطعی قانون کہلاتا تھا ان کی جگہ کم درجے کے مطلق العنان گھرانے وجود میں آ گئے۔

آج خاندانوں کے اندر مردانہ کنٹرول میں مسلسل واقع ہونے والی کمزوری کو بہت سے لوگ خاندان کے لئے خطرناک انحطاط سے تعبیر کر رہے ہیں۔ لیکن انصاف و مساوات پر مبنی معاشرہ قائم کرنے کے لئے ایک بالکل جدید تحریک برپا کرنے کے لئے باپ اور خاوند کے مطلق اختیار کی بتدریج شکست وریخت ایک لازمی شرطِ اوّل تھی۔ اس اہم نقطے پر توجہ مرکوز کرنے والوں میں ایک نمایاں شخصیت ماہرِ سماجیات رونلڈ فلیچر ہے جس نے اپنی تصنیف

"The Family and Its Future" میں لکھا ہے کہ ''حقیقت یہ ہے کہ جدید خاندان، پورے معاشرے کی تشکیلِ نو کے لئے سماجی انصاف کے مرکزی تصورات کو عملی جامہ پہنانے کے وسیع تر طریقِ عمل کے ایک ضروری حصے کے طور پر تخلیق کیا گیا تھا'' (۹)

ایک حالیہ کتاب جس میں ان اہم ترین مگر پھر بھی عموماً نظرانداز کی گئی نفسیاتی حرکیات پر روشنی ڈالی گئی وہ رینڈولف ٹرمباخ نے لکھی ہے اسکا نام The Rise of the Equalitarian Family ہے۔ اس میں وہ بتاتا ہے کہ جدید مساوات پسند خاندان کا سب سے پہلے انگلینڈ میں نمودار ہونا ایک حقیقت ہے یہ براعظم میں بعد میں وجود میں آیا، یہ حقیقت اس بات پر روشنی ڈالتی ہے کہ فرانس روس اور جرمنی کے برعکس انگلینڈ میں اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں شدید نوعیت کے شہنشاہیت دشمن انقلابات کیوں نہیں آئے۔ اس کی تحقیق ظاہر کرتی ہے کہ برطانیہ کے حکمران طبقوں کے خاندانوں میں عورتوں کی بڑھتی ہوئی طاقت ان مردوں میں اہم تبدیلیاں لے آئی تھی جو اس وقت انگلینڈ پر حکمرانی کررہے تھے اور ان تبدیلیوں نے ان مردوں کو سماجی اصلاحات قبول کرنے کے لئے زیادہ تیار کردیا تھا۔ سب سے بڑی تبدیلی یہ تھی کہ ایسی پارلیمانی حکومت قائم ہوگئی جس میں بادشاہ صرف برائے نام سربراہ رہ گیا تھا۔ اس کے بالکل برعکس روس، جرمنی اور فرانس کے بادشاہوں میں مطلق العنانیت دیر تک موجود رہی۔

سیکولر نظریات

اگر ہم اپنے ثقافتی ارتقا کا اینڈروکریسی اور گائیلنی کے دومختلف راستوں کے مابین چپقلش کے تناظر میں جدید تاریخ کا تجزیہ کریں تو جدید ترقی پسند سیکولر نظریات کا ظہور نئے امید افزا معنی اختیار کر جاتا ہے۔ نظریۂ ثقافتی تقلیب کے نئے تجزیاتی اوزار استعمال کرکے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ مساوات اور آزادی جیسے تصورات کے جواب الجواب نے کس طرح ہمیں رفتہ رفتہ دنیا کو دیکھنے کے نئے فارمولے عطا کردیئے ہیں۔ عورتوں کے حالات کو بہتر بنانے کے پُرکشش (gylanic) تصورات نے عقائد ونظریات کے نئے نظام وضع کرنے کے لئے نیوکلیئس کا کام دیا ہے۔ یہ تصورات معاشرتی نظام کے ذریعے بتدریج پھیلتے رہے اور انہوں نے کم ازکم جزوی طور پر ضرور مردانہ جبری ماڈل (androcratic paradigm) کی جگہ لی ہے۔

ان نظریات نے مختلف اوقات میں مختلف طریقوں سے دنیا کے اس بلند اہرام کو چیلنج کیا ہے، جس کی چوٹی پر ایک مرد، خدا بنا بیٹھا ہے اور اس کی نیچے کی سطحوں دوسرے مرد بیٹھے ہیں جو عورتوں بچوں اور دیگر مخلوقات پر خدائی کررہے ہیں۔

ان ''ترقی پسندانہ'' نظریات میں سے ایک قدیم ترین نظریہ، جسے آج کے ترقی پسند کڑی تنقید کا نشانہ بناتے ہیں وہ کیپٹل ازم (نظام سرمایہ داری) ہے۔ اس کے لئے نظریاتی زمین ۱۷ویں صدی کی ''پروٹسٹنٹ اصلاحات'' پہلے ہی ہموار کرچکی تھیں۔ صنعت کی تجارتی صفات، انفرادی استعداد اور دولت کی اہمیت بڑھ جانا (پروٹسٹنٹ اخلاقیات) کیپٹل ازم کے عروج کے لئے شرطِ اولین تھی۔ [۱۱] (جبکہ اس کے برعکس سستی وکاہلی کے تجارتی گناہ، انفرادی ناکامی، اور غربت ایک طعنہ بن گئی تھی) اٹھارہویں صدی آئی تو سرمایہ دارانہ نظام، کیپٹل ازم بطور ایک سیکولر نظریئے کے نمودار ہوگیا۔ ایک متفقہ خیال کے مطابق، اس کا سب سے بڑا اور اوّلین مصنف ایک دنیادار فلاسفر ایڈم سمتھ تھا۔ [۱۲] بطور ایک معیشت دان کے، سمتھ ایک فری مارکیٹ کو ایک آزاد اور خوشحال معاشرے کے لئے بنیادی پتھر قرار دیتا تھا۔

کیپٹل ازم ماضی سے ایک نئے انقلابی سفر کا آغاز تھا۔ اب وہ پرانا نظریہ دم توڑ رہا تھا جس میں انسان کی سماجی حیثیت اور دولت بنیادی طور پر اس کی پیدائش سے متعین ہوتی تھیں۔ ایک دولتمند شخص کے ہاں جنم لینا، کسی ہنرمند گھرانے میں آنکھ کھولنا یا کسی غلام کے گھر میں پیدا ہونا بچے کی آئندہ حیثیت کو متعین کردیتا تھا۔ اب کیپٹل ازم دراصل ایک نسبتاً آزاد معاشرے کی طرف پیشقدمی تھی۔ اس نے بنیادی طور پر قدیم سخت گیر نظامِ مراتب یا ''پروٹو اینڈرک''، تنظیم معاشرہ کو چیلنج کیا تھا جس میں، طاقتور، متشدّد، جنگجو فاتحین، بادشاہ، اس کی اولاد اور اس کے مقرر کردہ امرا ونائبین بلاخوف وتردّد اپنے استبدادی اختیارات کو استعمال کرتے تھے جنھیں مذہبی نظریات کی تائید اور خدا کی پیشگی منظوری حاصل تھی۔

کیپٹل ازم جو ایک اوّلین جدید نظریہ تھا، بنیادی طور پر ایک اقتصادی یا مادی اساس پر قائم ہوا تھا۔ اس طرح یہ تسلط پر مبنی معاشرے سے شراکت پر مبنی معاشرت کے قیام کی طرف بڑھتا ہوا ایک اہم قدم تھا۔ نیز اس نے نئی اور سماجی طور پر زیادہ ذمہ دارانہ سیاسی

تشکیل کے لئے بھی جوش وخروش پیدا کردیا، جس کے نتیجے میں آئینی بادشاہتیں (constitutional monarchies) اور جمہوری مملکتیں قائم ہوگئیں۔ سرمایہ دارانہ معیشت، جاگیردارانہ معیشت، سے یقیناً بہت زیادہ قابل ترجیح تھی کیونکہ مؤخر الذکر معیشت بنیادی طور پر تشدد، قتل وغارت اور لوٹ مار کے اس تسلسل کا حصہ تھی جو امراء اور بادشاہوں نے زیادہ سے زیادہ زمینیں ہڑپ کرنے کی بھوک مٹانے کے لئے جاری رکھی ہوئی تھی۔ اور یہی ان کی بنائے اقتدار تھی لیکن سرمایہ دارانہ معیشت میں چونکہ انفرادی رغبتِ املاک، مسابقت اور حرصِ منافع پر زیادہ زور دیا جاتا ہے اور اس کے اندر وراثتی رجحانات (طبقاتی ڈھانچے) اور اس کے تشدد پر انحصار (نوآبادیاتی جنگیں) بھی بڑھتا رہتا ہے۔ اس لئے کیپیٹل ازم بنیادی طور پر اینڈروکریٹک (مردانہ نظام) ہی رہا۔

جدید سرمایہ داری کے نظریہ سازوں میں سے کئی ایک نے مثلاً جارج گلڈر نے نہایت درجے کی صاف گوئی کے ساتھ کہا کہ کیپیٹل ازم کو جیسا کہ ہم پہنچانتے ہیں مردوں کی بالادستی پر قائم ہے۔ اس نے اپنی کتاب "Wealth and Poverty" میں ''مرد کی اعلیٰ جارحیت'' کو تمام سماجی اور اقتصادی اقدار میں سے بہترین قدر قرار دیا ہے۔ سابق امریکی صدر رونلڈ ریگن نے اس کتاب کو ایڈم سمتھ کی تصنیف "The Wealth of Nations" کے بعد اس موضوع پر لکھی گئی کتابوں میں سے بہتر کتاب قرار دیا ہے۔ (۱۳)

سوشل ازم اور کمیونزم، اس کے بعد ابھرنے والے بڑے بڑے نظریات تھے۔ اس کے ابتدائی نظریہ سازوں نے کیپیٹل ازم کے علمبرداروں کے بہت سے اینڈروکریٹک قضیات کو مسترد کردیا۔ چارلس فوریئر جیسے یوٹو پیائی سوشلسٹوں کی کتابیں اور مارکس اور اینجلز کی ''سائینٹیفک سوشلزم'' مساوات کے تصورات کو فروغ دینے کے طاقتور عوامل تھیں۔ یہ ایک ایسی ریاستی تنظیم کا تصور تھا جو نظامِ مراتب یا نظامِ تسلّط کی بجائے ربط وضبط یا شراکت وموانست پر مبنی تھا۔ (۱۴) اور اگرچہ یہ ان کی ضخیم ترین تصانیف میں ''پہلو سے آنے والی روشنی'' (سائیڈ لائیٹ) کی طرح تھا لیکن مارکس اور اینجلز نے ان میں عورتوں پر مردوں کے جبر کا واضح طور پر اعتراف کیا ہے، جسے اینجلز نے ''اوّل درجے کا جبر'' یا ''جنسِ لطیف کی عالمی تاریخی شکست'' قرار دیا ہے۔ (۱۵)

لیکن اس عمل کے دوران سوشلسٹ خیالات نے دنیا کے بہت سے ممالک پر اپنے

اثرات مرتب کئے (مثلاً فری پبلک ایجوکیشن اور گریجویٹڈ انکم ٹیکس) اور کافی حد تک سماجی مساوات قائم کرنے میں مدد دی اور لاکھوں کسانوں اور صنعتی کارکنوں کو بے رحم غربت کی زد میں آنے سے بچایا۔ سوشلزم اور کمیونزم نے بھی اپنے اندر اہم اینڈروکریٹک اجزا کو سموئے رکھا۔ اس مسئلے کا ایک حصہ کمیونسٹ نظریئے کے اندر اپنی جگہ بنائے بیٹھا ہے۔۔ مارکسزم جو جدید دور کے مؤثر ترین نظریات میں سے ایک تھا اپنے اس اینڈوکریٹک کو اصول کو کبھی ترک نہ کرسکا کہ اقتدار تشدد کے ذریعہ ملتا ہے جس کی توثیق اس مشہور مقولے سے ہوتی ہے کہ ''مقاصد ذرائع کا خود جواز ہوتے ہیں'' اور مسئلے کے اس جزو کا اطلاق اس پہلی قوم پر ہوا جس نے کمیونزم کو اپنا سرکاری نظریہ بنایا، اور وہ سوویٹ یونین تھا۔ مارکس اور انجلز نے تسلیم کیا تھا کہ زمانہ قبل از تاریخ میں عورتوں اور مردوں کے تعلقات میں شدید ردّ وبدل کا نتیجہ طبقاتی معاشرے کی صورت میں نکلا جو ان کے نزدیک قابل نفرت صورت حال تھی۔ چنانچہ روسی انقلاب کے ابتدائی برسوں میں عورتوں کو مساوی درجہ دینے کی کچھ کوششیں کی گئی تھیں لیکن آخر میں آکر مردمع اپنی اقدار کے بالادست ہی رہے۔ (۱۶)

واقعتاً جدید تاریخ کا ایک کارآمدترین سبق یہ ہے کہ سٹالن کے دور میں تشدد اور استبداد کی بڑے پیمانے پر رجعت ہوئی اور سابق پالیسیاں واپس آگئیں جن کے نتیجے میں پدرسرانہ خاندانی تعلقات عورتوں اور مردوں کے مساویانہ تعلقات میں بدل گئے۔ جیسا کہ ٹراٹسکی یہ کہنے پر مجبور ہوگیا (مگر اقتدار سے محروم ہو کر جلاوطن ہونے کے بعد) کہ کمیونسٹ انقلاب اپنے مقاصد حاصل کرنے میں اس لئے ناکام ہوا کہ اس کی لیڈرشپ خاندان کے اندر پدرسرانہ تعلقات میں تبدیلی لانے میں ناکام رہی ہیں۔ (۱۷) یاہماری اصطلاحات میں یہ صورت حال انسانیت کے دونصفوں کے تعلقات میں بنیادی تبدیلیاں لانے میں ناکامی کا نتیجہ تھی۔ معاشرہ مساویانہ تعلق کی بجائے مراتب پر استوار رہا۔

انیسویں اور بیسویں صدی کے دوران اور بھی کئی جدید انسانیت دوست نظریئے نمودار ہوئے جن میں "abolitionism" (انسدادیّت)، pacifism (صلح جوئی)، anarchism، (نراج، لاقانونیت) anticolonialism (انسداد نوآبادیات) اور environmentalism (شعورِ ماحولیات) شامل تھے۔ لیکن جیسا کہ ''اندھوں نے ہاتھی کی جسامت بیان کی'' والی ضرب المثل چلی آرہی ہے، ہر کسی نے اینڈروکرٹیک دیو کے بارے میں جو جو رائے ظاہر

کی، ان کی الگ الگ سوچ تھی۔ کوئی بھی سارے مسئلے یکجا کر کے نہ دیکھ سکا۔ ساتھ ہی ساتھ وہ اس حقیقت کا ادراک کرنے میں ناکام رہے کہ مسئلے کا قلب مرد کا تسلّط اور عورت کی محکومی ہے جب تک یہ صورت حال نہیں بدلے گی، قلب صحتیاب ہو سکے گا۔

واحد آئیڈیالوجی جو انسانی تعلقات کے اس ماڈل کو سامنے آ کر چیلنج کرتی ہے اور ساتھ ساتھ تشدد پر مبنی نظامِ مراتب کا حل بھی پیش کرتی ہے، وہ بلاشبہ تحریکِ آزادیٔ نسواں (feminism) ہے۔ اسی بنا پر یہ جدید تاریخ اور ہمارے ثقافتی ارتقا کی تاریخ میں ایک منفرد حیثیت رکھتی ہے۔

ثقافتی ارتقا کے طویل منظر کو دیکھتے ہوئے جس پر پچھلے ابواب میں روشنی ڈالی گئی ہے، تحریک آزادیٔ نسواں کی وضاحت ہو چکی ہے، یہ کوئی نیا نظریہ نہیں ہے۔ اینڈروکریٹک نظاموں کے اندر رہتے ہوئے دیگر انسانوں سے شرکت یا رابطے (affilation or linking) ایک زبانی کلامی ہمدردی سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ ثقافتی ارتقا کے ہزاروں برس اس کا مساوات پر مبنی امن پسند معاشروں میں عملی مظاہرہ ہوتا رہا ہے۔ ریکارڈ شدہ تاریخ کے پورے عرصے میں قدیم یونان اور روم میں گیارھویں تا تیرھویں صدی کے روم، یونان اور فرانس کے ''ٹروبیڈور'' عہد الزبتھ کے دور میں اور پھر نشاۃ ثانیہ اور تحریکِ روشن خیالی کے زمانے میں ''عورت کا مسئلہ'' بقول مارکس اور اینجلز بار بار سامنے آتا رہا ہے۔

لیکن تحریک نسواں بطور ایک جدید نظریہ انیسویں صدی کے وسط تک سامنے نہیں آئی۔ اگرچہ اس تحریک کی فلسفیانہ بنیادوں پر اہل علم خواتین مثلاً میری وولسٹون کرافٹ، فرانسس رائٹ، ارنسٹائن روز، جارج سینڈ، سارہ اور انجلینا گرمکے اور مارگریٹ فلر بڑی وضاحت سے روشنی ڈال چکی ہیں۔ اس کا رسمی یوم پیدائش ۱۹ جولائی ۱۸۴۸ ہے اور مقام پیدائش سینکا فالز، نیویارک ہے۔ (۱۸) یہاں ریکارڈ شدہ تاریخ کے اوّلین کنونشن میں عورتوں کی ماتحتی اور تذلیل کے خلاف ایک اجتماعی جدوجہد شروع کرنے کا اعلان ہوا۔ الزبتھ کیڈی سٹینٹن نے ایک کلیدی بیان جاری کیا ''بہت سے اہم سوالات میں، جو عوام کے سامنے اٹھائے گئے، ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں جو انسانی خاندان کو اس سے زیادہ متاثر کرتا ہو جتنا کہ اس سوال نے کیا ہے جسے ٹیکنیکل زبان میں ''ویمنز رائٹس'' کہا گیا ہے'' (۱۹)

اگرچہ اس بیان کا اصل زور اب ہمارے نظام کو ماضی سے کہیں زیادہ قوت اور زیادہ

یقین کے ساتھ چیلنج کرنے پر ہے، بہت سے لوگ تحریک آزادئ نسواں کو ''محض عورتوں کا مسئلہ'' قرار دیتے ہیں اور اس کے نتیجے میں دوسرے ترقی پسندانہ نظریات وسط سے لے کر بائیں جانب تک، سب کے سب بری طرح داخلی تضادات کے شکار چلے آ رہے ہیں۔

اس کے برعکس جدید نظریات کے ایک چوتھے گروپ میں، ایسی کوئی مشکل نہیں، ان کے آگے سے یا پیچھے سے کوئی مناقشتی دباؤ نہیں ہے۔ یہ وہ نظریات ہیں جو اٹھارہویں اور انیسویں میں ایڈمنڈ برک، آرتھر شوپنہار اور فریڈرک نیٹشے جیسے لوگوں کے افکار سے متشکل ہونا شروع ہوئے، یہ برملا اور ڈنکے کی چوٹ اور اینڈروکریٹیک رجحانات کے علمبردار تھے۔ (۲۰)

نیٹشے، جس کا فلسفہ قدیم نظریات یا پروٹو اینڈروکریسی کو ازسرنو مثالی بنا کر پیش کرتا ہے اس کے اقوال کا اب بھی بطور حوالہ ذکر آتا ہے اس نے کسی ریاکاری یا منافقت کے بغیر اعلان کیا کہ جس طرح مردوں کو عورتوں پر حکمرانی کا لازمی حق حاصل ہے چند ''فطری طور پر منتخب'' اور ''سماجی طور پر پاکباز'' مردوں کو باقی ماندہ انسانیت پر حکمرانی کا حق حاصل ہے۔ اس کے نزدیک مذہب ایک قابل نفرت چیز ہے اور یہ توہمات ہی کی ایک شکل ہے۔ اس نے ایسے روبہ تنزل اور ''زنانہ'' تصورات مثلاً مساوات، جمہوریت، سوشلزم، عورتوں کی نجات اور انسان دوستی کے اپنے مخالفانہ موقف کی بنیاد سختی سے ''معقولیت'' اور غیرمذہبی اساس پر رکھی۔ (۲۱)

نیٹشے کا فلسفہ، جس کے تحت ''شریف اور طاقتور'' انسان کو حق حاصل ہے کہ ''وہ کم رتبے و حیثیت لوگوں سے جیسا چاہے سلوک کرسکتا ہے'' آگے چل کر جدید فاشزم کا ہراول بنا۔ انڈویورپین داستانوں کا ذکر کرتے ہوئے نیٹشے نے جوڈوکرسچین روایت کو اتنی andrcratic نہ ہونے کی وجہ سے قابل نفرت ٹھہرایا اور کہا کہ اس میں کچھ ''زنانہ'' کچھ ''غلامانہ اخلاقیات'' عناصر اور کچھ ''بے لوثی'' ''نرم دلی''، ''فیض رسانی'' اور ''ہمسایوں کی طرح محبت'' جیسی چیزیں پائی جاتی ہیں۔ جس طرح نیٹشے نے آریاؤں یا انڈویورپین جنگجوؤں کے ''شرافت'' بھرے زمانوں کا ذکر کیا ہے، اس کا مثالی اخلاقی روّیہ ایک ایسی دنیا تھی جس میں اس بات کا فیصلہ صرف حکمران کرسکتا تھا کہ ''نیکی'' کیا ہے اور ''سپرمین'' شاندار لڑائیاں لڑتے تھے۔ یہ وہ دنیا تھی جس کے حکمران ایسے لوگ تھے جو یہ کہہ سکتے تھے ''میں اس کو پسند کرتا ہوں اور

اسے اپنے لئے لے رہا ہوں'' کون جانتا ہے کہ عورت کو کیسے قابو میں لایا جائے، اور اسے سزا دی جائے اور گستاخ کو دھکا دے کر گرادو'' اور جس کے لئے ''کمزور ارادتاً مطیع ہونے نے سے اور خود کو پیش کر دینے کو تیار رہتا ہے''۔ مختصر یہ کہ یہ دنیا ویسی ہی تھی جس کا تصور بیسویں صدی کی ''نان اینڈ روکریٹک'' عظیم الشان کتاب ہٹلر کی تصنیف ''میری جدوجہد'' میں کیا گیا تھا۔ (۲۲)

انسانی تعلقات کا تسلّط ماڈل

جدید فاشزم اور دیگر دائیں بازو کے نظریات کے ظہور پر وہ لوگ بے حد نالاں ہیں، جواب تک یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ شاید ہمارا ثقافتی ارتقا اپنا سفر جاری رکھ سکے۔ وہ یہ خطرہ محسوس کرر ہے ہیں کہ دائیں بازو کے نظریات دوبارہ استبدادیت نافذ کر کے ہمیں اس زمانے میں واپس بھیج دیں گے جہاں اس سے بھی زیادہ ناانصافی اور عدم مساوات کا دور دورہ تھا۔ وہ خاص طور پر دائیں بازو کی عسکریت، ان کے پسندیدہ حربوں تشدد، خون ریزی اور جنگی جنون سے خوفزدہ ہیں۔ کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کا طرزفکر ہماری بقا وسلامتی کو کسی وقت بھی خطرے سے دوچار کرسکتا ہے۔ لیکن دائیں بازو کے نظریات کا ایک تیسرا پہلو بھی ہے جس پر بہت کم غور کیا جاتا ہے، وہ یہ ہے کہ دائیں بازو والے لوگ مرد کے غلبے، جنگی طور طریقوں اور استبدادیت کے مابین تعلق کو نہ صرف قبول کرتے ہیں بلکہ اس کی قدرافزائی بھی کرتے ہیں۔ (۲۳)

اگر ہم جدید سیاسی مملکتوں کا دوبارہ معروضی مطالعہ کریں تو پتہ چلے گا کہ سخت گیر مردانہ غلبے اور مردانہ اقدار کا بعض جدید متشدد اور ظالم حکومتوں کے ساتھ تعلق محض ایک حادثہ نہیں بلکہ ان کی سوچوں کا آپس میں گہرا تعلق چلا آ رہا ہے۔ جرمنی میں ہٹلر، سپین میں فرانکو اور اٹلی میں مسولینی پران اقدار کی گہری چھاپ تھی۔ ایسی ہی ظالم حکومتیں افریقہ میں عدّی امین، پاکستان میں ضیاء الحق، ویسٹ انڈیز میں ٹروجیلو اور رومانیہ میں چاؤشسکو کی تھیں۔ ان کا جائزہ لیا جائے تو یہ نقطہ مزید واضح ہو جائے گا۔ (۲۴)

سب سے زیادہ سبق آموز (قابل غوروفکر) بات یہ ہے کہ ''جدید جمہوریت کے گہوارے'' میں وہی امریکی انتظامیہ جو خود کو قانون سے بالاتر سمجھتی ہے، خفیہ جنگیں جاری

رکھے ہوئے ہے اور عوامی بہبود کے فنڈ زگھٹا کر یہ رقم اس بھاری ملٹری فنڈ میں شامل کررہی ہے جوامریکی تاریخ کا سب سے بڑادفاعی فنڈ کہلاتا ہے۔ وہ اس آئینی ترمیم کی بھی سخت مخالفت کررہی ہے جوعورتوں کو قانونی مساوات عطا کرتی ہے اور اس کی بجائے ایک ایسی ترمیم کی حمایت کررہی ہے جوعورتوں کو بازتخلیق کی آزادی سے محروم کرتی ہے۔ مزید برآں اگر ہم دونہایت واضح مذہبی نیواینڈروکریٹک نظریات کاقریب سے جائزہ لیں تو اداراتی تشدّد، عورتوں کو دبا کر رکھنے اور آزادی کوسلب کرنے کے درمیان رابطہ واضح تر ہوجائے گا۔ (یہ دونظریات، امریکی بنیاد پرست مبلغ جیری فال ویل، اور ایران کے لیڈر آیت اللہ خمینی کے پیش کردہ ہیں۔ اوّل الذکر، امریکہ کے سابق صدر رونلڈ ریگن کاایک اچھا دوست اور روحانی مشیر ہے)

امریکہ میں جیری فال ویل نے ٹیلی ویژن کے لاکھوں ناظرین سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ خدا ''مساوی حقوق کی ترمیم'' کوسخت ناپسند کرتا ہے۔ تقریر کی آزادی، باز آفرینی کی آزادی (reproductive freedom of choice) اور اپنے ضمیر کے مطابق عبادت کرنے یا نہ کرنے کی آزادی کے خلاف اس کا موقف آزادی کے لئے سخت خطرے کی حیثیت رکھتا ہے۔اس کی جانب سے امریکہ کی عسکری طاقت میں اضافے اور ''مضبوط''امریکہ کی حمایت بھی ناپسندیدہ بات تھی کیونکہ اس طرح وہ ساؤتھ افریقہ کی حکومت کو کچلنا چاہتا تھا امریکہ دوسرے ملکوں کو اس بنا پر تباہ کرنا چاہتا تھا کہ بقول اس کے ان کی حکومتیں اپنے باشندوں کے قتل کی مرتکب ہورہی تھیں اور ''خوفِ خدا رکھنے والے امریکن لیڈر'' ان حکومتوں کو اسلحہ فراہم کررہے تھے اور تشدّد پر ''خدا کی مرضی'' کی مُہر ثبت کرنا چاہتے تھے۔ اس طریقے سے اینڈروکریٹک عیسائیت کےعلمبردار امریکی یہ ظاہر کررہے تھے کہ مرد کے غلبے، استبدادیت اور مردانہ تشدد کا آپس میں گہراتعلق ہے۔

اسی طرح اس تعلق کی توثیق ایران کے مذہبی رہنما آیت اللہ خمینی نے اس وقت کی جب وہ عورت کو ''چادر'' اوڑھنے کی تلقین کررہے تھے۔ عورت کا یہ روایتی پہناواایران کی مذہبی اینڈروکریسی کی طرف واپسی کا اعلان تھا جوخمینی کی زیرِقیادت ملاؤں نے کیا۔ (۲۵)

اس صورتِ حال کو نظریۂ ثقافتی تقلیب کے تناظر میں دیکھاجائے تو یہ درحقیقت ''اینڈروکریٹک'' نظام کی حیاتِ نوتھی جو جدید دور کے شدید نسوانی دھکے (gylanic thrust) کا

مقابلہ کرتے ہوئے اہل ایران نے حاصل کی۔

آیت اللہ خمینی کو دراصل ایران سے اس وقت نکالا گیا تھا جب انہوں نے عورتوں کو مساوی حقوق دیئے جانے کے خلاف دوروزہ احتجاجی جلوسوں کی قیادت کی تھی۔ پھر جب وہ ایران واپس آئے تو انہوں نے اوّلین سرکاری کام کے طور پر فیملی پروٹیکشن ایکٹ مجریہ ۱۹٦۷ معطل کردیا۔ جس میں عورتوں کو طلاق، شادی اور وراثت میں ''زیادہ'' مساوات دے دی گئی تھی۔ اس قانون کو معطل کرتے ہوئے انہوں نے اپنے پیروکاروں کو نقاب بحال کرنے کا حکم دے دیا۔ (۲٦) اس کے ساتھ ہی نئے بے لچک قوانین کے تحت سکولوں اور ساحلوں پر دونوں صنفوں کو ایک دوسری سے دُور رکھنے کی ہدایت کی گئی اور لڑکیوں کے لئے شادی کی کم سے کم عمر بھی بعجلت ۱۳ سال مقرر کردی گئی۔ (۲۷)

خمینی نے نئے ''اخلاقی'' حکم کے تحت جو عام معافی کا اعلان تھا، اور دراصل یہ حکم تھا کہ امریکی سفارت کاروں کو یرغمال بنالیا جائے اور عراق کے خلاف ''مقدس جنگ'' شروع کردی جائے۔ اب نئے صاحبانِ اقتدار کے احکامات کی خلاف ورزی کو اسلام کے خلاف ایک جرم قرار دے دیا گیا جس کی سزا، اذیت ناک قیدوبند اور موت تھی۔ نہ آزادئ تقریر تھی اور نہ حکم عدولی کو برداشت کیا جاتا تھا۔ نئی مخالف پارٹی کے قیام کو کفر قرار دے دیا گیا۔ (۲۸) اور ایسے مذہب پر ایمان لانا بھی جرم قرار دیا گیا جس میں عورت اور مرد برابر ہوں۔ ۱۹۸۳ء میں عورتوں کو منظّم کرنے پر دس ''بہائی'' عورتوں بشمول ایران کی اولین ماہر فزکس، ایک کسرٹ پیانسٹ، ایک نرس اور تین کالج سٹوڈنٹس کو سرِ عام پھانسی دے دی گئی۔ (۲۹)

مختصراً یہ کہ جو لوگ عورت اور مرد دونوں پر ''مردِ آہن'' کے بنائے ہوئے قوانین دوبارہ مسلّط کریں گے وہ عورتوں کے باز آفرینی کے آزادانہ انتخاب اور مساوی حقوق جیسے معاملات کو بنیادی مسائل کے طور پر دیکھیں گے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اگر ہم دائیں بازو والوں کے اقدامات کو دیکھیں تو یہ نظر آتا ہے کہ ان کے نزدیک عورتوں کی روایتی ماتحتی کا کردار بحال کرنا ایک اوّلین ترجیحی کام ہوتا ہے۔ امریکہ کے ''نیورائیٹ'' سے لے کر مغرب اور مشرق تک یہی صورتحال پائی جاتی ہے۔ (۳۰)

تاہم مقامِ حیرت ہے کہ ترقی، مساوات اور امن کے اعلیٰ تصورات کے علمبرداروں کے لئے عورتوں کے ''مسائل'' اور ترقی پسندانہ مقاصد کے درمیان تعلق بدستور غیراہم چلا آرہا

ہے۔ رواداروں (liberals) سوشلسٹوں، کمیونسٹوں اور وسط کے بائیں طرف کے خیالات رکھنے والوں کے لئے عورت کی آزادی ایک ثانوی چیز ہے۔ اس کی طرف وہ توجہ کیوں دیں جب کہ دنیا کو اور بھی کئی اہم مسائل درپیش ہیں۔

بہت سانظریاتی انتشار اور جدید دور کی کبھی ایک قدم آگے کبھی دوقدم پیچھے والی ثقافتی تحریک کا سراغ بھی ترقی کے لئے کام کرنے والوں کی ناکامی میں ملتا ہے جو اس امر کا ادراک نہیں کر سکے کہ جب تک انسانی تعلقات غالب اور مغلوب ماڈل کی صورت میں برقرار رہیں گے مساوات اور انصاف پرمبنی معاشرے کا قیام ہرگز ممکن نہیں ہے۔ ہم انصاف پسند معاشرے اور انسانیت کے دونصفوں کے مابین مساوات کو متناقض سمجھنے سے قاصر ہیں معلوم ہوتا ہے کہ منطق واستدلال نے ہمیں شکست دے دی ہے۔ یہ صورت حال ہمیں Hans Christian Anderson کی لکھی ہوئی بے لباس بادشاہ کی کہانی یاد دلاتی ہے، اس کی عریانی صرف ایک چھوٹے اور ابھی غیر تعلیم یافتہ لڑکے کو نظر آتی ہے۔ حقائق سے متعلقہ نظریات کی تعلیم پانے کے لئے مروّجہ نظام برقرار رکھنا ضروری ہوتا ہے۔ یہاں تو ہمارے ذہنوں کی عظیم منطقی قوتیں بھی انسانی تعلقات کے تسلّط ماڈل اور متسلّط معاشرے کے مابین واضح تعلق کو بمشکل سمجھ پاتی ہیں۔

مرد اور عورتیں انسانوں کی دو بنیادی قسمیں ہیں، ان کے مابین تعلق کو جس طریقے طے کیا گیا ہے وہ انسانی تعلقات کا ایک بنیادی ماڈل ہے۔ نتیجتاً انسانوں کے درمیان تعلق ہر بچے کی پیدائش کے ساتھ ہی غالب ومغلوب کی شکل اختیار کرجاتا ہے پھر وہ ایک روایتی مردانہ تسلّط پرمبنی خاندان میں پرورش پانے لگتا ہے۔ (۳۱)نسلی امتیاز کی صورت ہو تو انسانی تعلقات کے اس ماڈل کی مختلف صنف کے ارکان سے مختلف نسل کے ارکان تک تعمیم ہوتی ہے، اسی سے متعلقہ معاملہ نوآبادیات کا ہے۔ اس کی ایک قدم آگے جا کر ایک مختلف قوم کے ارکان سے تعمیم کی جاتی ہے (نیز یہ عام طور پر نسل میں بھی ہوتی ہے)۔ یہ وہ ماڈل ہے جس نے ساری تاریخ میں خود کو ادہار پر دیئے رکھا تھا تا کہ ہر قسم کی ممکنہ سماجی اور اقتصادی استحصال کی شکار ہو سکے۔

آگے یا پیچھے؟

اگر ہم ایک مرتبہ پرانے نظریاتی لیبلوں ''آزاد خیال اور قدامت پسند، مذہبی شخص اور لامذہب شخص یا دائیں اور بائیں بازو کے رجحانات والے لوگ'' کے دائروں سے بالاتر ہوکر سوچنا شروع کردیں تو جدید تاریخ بہت سے اہم پہلوؤں سے واضح ہو جائے گی۔ جدید ترقی پسند نظریات کو اینڈروکریسی کے خلاف ایک تیزی سے بڑھتے ہوئے انقلاب کے ایک حصے کے طور پر دیکھا جاسکتا ہے۔

یورپی شہروں میں اولین بغاوت آزاد کردہ غلاموں نے کی، پھر صنعتی کارکنوں اور کسانوں (مارکس کی اصطلاحوں میں بورژوا اور پرولتاریہ) نے کی، بعدازاں سیاہ فام غلاموں اور نوآبادیاتی باشندوں نے غلامی کا جوا اتار پھینکا۔ عورتوں کی تحریک بھی مردانہ جبر سے جان چھڑوانے کی جدوجہد کی ایک لہر کے طور پر چلی آرہی ہے۔ یہ ''اینڈروکریسی'' کی جگہ ''گائیلنی'' کولانا چاہتی ہے۔ یہ سب بغاوتیں اور شورشیں بنیادی طور پر ایک ایسے نظام کے خلاف ہیں جس میں درجہ بندی ایک بنیادی اصول کے طور پر کارفرما ہے۔

لیکن اب تک اینڈروکریسی کے خلاف نظریاتی چیلنج ٹکڑوں میں بٹا رہا ہے۔ دائیں بازو کا نقطۂ نظر یا ''نیواینڈروکریٹک'' نظریہ انفرادی اور اجتماعی دونوں زندگیوں کا داخلی طور پر ہم آہنگ اور جامع منظر پیش کرتا ہے۔ لیکن جہاں تک ترقی پسند نظریات کا تعلق ہے، ان میں سے صرف نظریۂ حقوقِ نسواں (feminisim) ہے جو ساری انسانیت (نہ کہ صرف نصف انسانیت) کے لئے مساوات اور آزادی کا علمبردار ہونے کی وجہ سے داخلی تناقض سے بچا ہوا چلا آرہا ہے۔ بنیادی سماجی ادارے ''خاندان'' کی تنظیمِ نو کا تصور صرف تحریکِ آزادیٔ نسواں پیش کرتی ہے اور یہی تحریک ہے جو مردوں کے ''متشددانہ زنا اور بیوی سے بدسلوکی'' اور ''مردوں کے تشددِ جنگجوئی'' کے نظاموں کے درمیان واضح نقطۂ اتصال پیش کرتی ہے۔ (۳۲)

ہمارے جدید نظریاتی نظام کی اصطلاحوں میں تحریکِ آزادیٔ نسواں کو ایک طاقتور مقناطیس (powerful attractor) سمجھا جانا چاہیے۔ اگرچہ اس وقت یہ نظام میں ایک ادنیٰ مقام پر ہے، انیسویں اور بیسویں صدی کے دوران یہ گردشی مقناطیس کے طور پر کام کرتی رہی ہے اور ذہنی و عقلی تحریکوں کو ایسے عالمی نظریئے کی قائل کرتی رہی ہے جس میں عورتوں اور نسوانیت کو بے قدری کی نگاہ سے نہ دیکھا جاتا ہو۔ لیکن ہمارے دور میں نظاموں کے

بگڑتے ہوئے توازن کی وجہ سے تحریک نسواں ایک نئے اور پوری طرح مربوط نسوانی (gylanic) نظریئے کا نیوکلیئس بن سکتی ہے۔ یہ جدید عالمی نظریہ مذہبی اور دنیاوی زندگیوں کے انسان دوست اجزاوعناصر کو یکجا کر کے ایک داخلی طور پر ہم آہنگ اور جامع نقطہ نظر سامنے لاسکتا ہے جو تسلّط پر مبنی معاشرے کی جگہ شراکت پر مبنی نظام قائم کردے گا۔

ایسی آئیڈیالوجی کو وجود میں لانے کے لئے ایک تحریک پہلے سے موجود ہے۔ مثال کے طور پر ۱۹۸۵ میں ''نیوپیراڈیم سمپوزیم'' میں (جوفرٹجوف کیپرا ازایلم وُڈ انسٹی ٹیوٹ نے سپانسر کیا تھا) ایک نئی سوچ سامنے آئی جسے خاص طور پر "postpatriarchal" قرار دیا گیا اور نئے نظریۂ انسانی کو ''تسلط ماڈل سے ہٹ کر تعاون اور عدم تشدد ماڈل کی طرف منتقلی'' سے تعبیر کیا گیا۔ (۳۳) ماہرین ارتقائے انسانی مثلاً ''رابرٹ جنک'' ''ڈیوڈ لائے'' (David loye) اور ''جان پلاٹ'' بھی عورتوں کے لئے مساوات اور امن کے درمیان تعلق کو تسلیم کرتے ہیں۔ (۳۴) بہائنز یونیورسل ہاؤس آف جسٹس کے بیان مجریہ ۱۹۸۵ میں جو دنیا بھر کے سربراہانِ مملکت کے نام بھیجا گیا تھا اس میں واضح طور پر کہا گیا تھا کہ ''دونوں صنفوں کے درمیان پوری مساوات عالمی امن کے لئے شرطِ اوّل ہے''۔(۳۵)

دنیا بھر کی حامیانِ نسواں فلاسفرز اور ایکٹوسٹس نے عورتوں اور مردوں کے لئے ایسی اخلاقیات وضع کرنے کی سفارش کی ہے جو ''نسوانی'' اقدار ازقسم عدم تشدد اور احساسِ ذمہ داری پر مبنی ہو۔ ان خواتین فلاسفروں میں Betty ،Helen Caldicott Wilma Scot Heide ،Hilkka Pietiela ،Faran Hosken ،Elise Boulding ،Alva Myradal Frieden ،Dame Nita Barrow ،Gloria Steinem ،Celina Garcia ،Charlene Spretnak Bella ،Mara Keller ،Barbara Deming Patricia Mische ،Patricia Ellsberg Elizabeth Dodson اور Allie Hixson ،Pam McAlister Abzug شامل ہیں۔ (۳۶) اور بے شمار حامیانِ نسواں آرٹسٹوں مصنفین، ماہرین دینیات اور سائنسدان نئے نظریئے بھی فراہم کررہی ہیں اور شراکت پر مبنی معاشرے کے لئے موزوں نئی شبیہات بھی مہیا کر رہی ہیں ان میں سے درج ذیل خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں ،Carol Christ ،Jessie Bernard ،June Brindel Judith Plaskow Karen Sacks Susan Griffin Abida Khanum ،Nawal El Saadawi Dale Spender Rosemary Radford Ruether Gita Sen

MashalBooks.org

،Carol Gilligan ،Paula Gunn Allen، Starhawk Betty Reardon، Jean O'Barr
Margaret ،Alice Walker،Mayumi Oda،Judy Chicago، Charlotte Bunche
E.M. ،Ursula Le Guin، Holly Near، Peggy Sanday، Geogia O'Keeffe، Atwood
[۳۷] Alix Kates Shulman، Ellen Marie Chen، Marge Piercy، Broner

چند اور تنظیموں کی بنیاد ڈالنے کی بھی کوشش ہو رہی ہے جو بنیادی طور پر حامیٔ نسواں سیاسی تحریکیں ہیں، یہ مراتب پر نہیں بلکہ رابطوں پر مبنی ہیں۔ مثال کے طور پر پیٹرا کیلی ماحول، نسوانیت اور امن کے باہمی تعلق کا ایک واضح تصور رکھتی ہے، اس کے مقاصد کی تکمیل کے لئے وہ ایک پارٹی تشکیل دے رہی ہے جو ''ویسٹ جرمن گرینز'' کو بہت تقویت پہنچائے گی۔ [۳۸] اور سونیا جانسن کی ''سٹیزنز پارٹی پلیٹ فارم نے ۱۹۸۵ میں امریکہ میں صدارتی انتخابات کے دوران سماجی، اقتصادی اور سیاسی تبدیلیوں میں عورتوں کے موثر کردار کی وکالت کی تھی۔

یہ سارے اقدامات ایک شراکت پر مبنی معاشرے کو عملی شکل دینے کے لئے ہمہ جہت اور مربوط مساعی ہیں۔ اگرچہ ہم عموماً اس طرح نہیں سوچتے مگر بہت سے سماجی حقائق، یعنی سکول، ہسپتال، سٹاک ایکسچینجز، سیاسی پارٹیاں، کلیسا ان تصورات کو ٹھوس حقیقت میں بدلنے میں ایک واضح کردار رکھتے ہیں جو کبھی صرف چند ایک عورتوں اور مردوں کے ذہنوں میں ہوا کرتے تھے۔ تنسیخ غلامی، بادشاہتوں کی جگہ جمہوری ریاستوں کا قیام اور وہ تمام ترقیاتی اقدامات جو ہم نے پچھلی چند صدیوں میں کئے، [۳۹] یہ بات ان پر بھی صادق آتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض مادی حقائق میزیں، کتابیں، برتن، طیارے اور وائلنز بھی انسانی تصورات کی عملی شکل ہیں۔ مگر نئے تصورات کو نئی حقیقتوں کی شکل دینے کے لئے نہ صرف تصور کے واضح ہونے کی ضرورت ہے بلکہ قدیم حقائق کو بدلنے کا موقع ملنا بھی ضروری ہے۔

ہمارے جدید دور کا خمیر فقید المثال فنیاتی تبدیلی میسر آ جانے کی وجہ سے ایک سماجی تبدیلی اور امکانی طور پر ایک بنیادی سماجی تقلیب کا موقع دے رہا ہے جیسا کہ ہم اپنے گرد و پیش میں دیکھ سکتے ہیں کہ تیز رفتار فنیاتی تبدیلی سماجی عدم استحکام لا رہی ہے اور جیسا کہ نظریۂ تقلیب بتاتا ہے جب مملکتیں عدم استحکام سے دوچار ہو جائیں تو ایک نظام دوسرے نظام کی جگہ بہ آسانی لے سکتا ہے۔

MashalBooks.org

تسلّط پسند معاشرے کے خلاف عورتوں اور مردوں کی جدید بغاوتیں اپنے ہمراہ عظیم فنیاتی پیش قدمیاں لے کر آئی ہیں، مزید برآں بڑے پیمانے کی فنیاتی تبدیلیوں کی بدولت عورتوں کی آگے بڑھنے کی رفتار کو بھی مہمیز لگ گئی ہے جو ایک "gylanic thrust" ہے۔ اس سے عورتوں اور مردوں، دونوں کے ''رول'' تبدیل ہو رہے ہیں۔ اب تو ایسے لگتا ہے کہ جیسے فطرت خود ''اینڈروکریسی'' کے خلاف آمادۂ بغاوت ہو چکی ہے۔ سطحِ زمین کی فرسودگی، قدرتی وسائل کا تیز تیز خاتمہ، تیزابی بارش اور ماحول کی آلودگی، اس کی مثالیں ہیں لیکن فطرت کی یہ بغاوت، (جیسے کہ بعض اوقات دلیل دی جاتی ہے) ٹیکنالوجی کے خلاف نہیں ہے بلکہ ان استحصالی اور تخریبی کاموں کے خلاف ہے جو تسلط پسند معاشرہ اس ٹیکنالوجی سے لے رہا ہے۔ مرد اس کی مدد سے فتوحات کر رہے ہیں، خواہ وہ فطرت کی تسخیر ہو، عورتوں کی تسخیر ہو یا دوسرے مردوں کی ہو۔

کہا جاتا ہے کہ ماڈرن ٹیکنالوجی نہ صرف ہماری ثقافت کے لئے خطرہ ہے بلکہ ہمارے حیاتیاتی ارتقا کے لئے بھی خطرہ ہے۔ اس حد تک جہاں تک اینڈروکریسی اپنے مقام پر رہتی ہے ترقی یافتہ ٹیکنالوجی ہماری بقا کے لئے کوئی بڑا خطرہ پیش نہیں کرتی۔ تاہم یہ بنیادی تقلیبِ نظام کو مزید تقویت پہنچاتی ہے۔

اس انتہائی بنیادی سطح پر جدید ''گائیلینک'' پیش رفت کو بطور عملِ توافق دیکھا جا سکتا ہے جسے ہماری انواع کا جذبۂ بقا آگے بڑھا رہا ہے۔ جیسا کہ ہم اگلے باب میں دیکھیں گے، ہر سطح سے برآمد ہونے والی شہادت بتا رہی ہے کہ رائج الوقت نظام تیزی سے اپنے منطقی ارتقائی انجام کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس لائن کا خاتمہ پانچ ہزار سال کا اینڈروکریٹک چکر پورا ہونے تک ہے۔

جو کچھ سامنے دکھائی دے رہا ہے وہ اس دم توڑتے ہوئے نظام کے لئے آخری خونی تالاب سے جس میں وہ اپنے آپ کو بچانے کے لئے نہائے گا۔ لیکن Androcracy کی جانکنی کی تکلیف "gylany" کے عملِ پیدائش اور نئے مستقبل کا راستہ کھلنے کی تکلیف بھی ثابت ہو سکتی ہے۔

MashalBooks.org

باب12

ارتقا کا تعطل: تسلط کا مستقبل

جو بات کبھی ہمارے مستقبل کے لئے کبھی محض ایک سائنسی کہانی کا ایک منظر تھی، اب ایک سنجیدہ امکان بن گئی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ اگر ایک ایٹمی جنگ کی وجہ سے انسانیت نے اپنا صفایا کرلیا تو زمین پر بھی کاکروچ قابض ہوجائیں گے۔ کیونکہ وہ زندگی کی ان چند اقسام میں سے ہیں جو تابکاری کے اثرات سے محفوظ رہیں گی۔ اگر ایسا ہوگیا تو وہ اینڈروکریسی کا بجاانجام اور ایک سنگدلانہ مذاق ہوگا۔ جس نظام نے ہمارے ثقافتی ارتقا میں رکاوٹ ڈالی ہے وہ بالآخر اسی قسم کی مخلوق کو جنم دے گا جو اس کے لئے موزوں ترین ہوگی، اسے انسانوں سے نہیں بلکہ حشرات الارض سے ہی پالا پڑے گا۔

ناربرٹ وائینر نے اپنی کتاب "The Human Use of Human Beings" میں، جو اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے لکھا ہے کہ سماجی کیڑوں مکوڑوں مثلاً چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں کا نظامِ مراتب ان کم ترقی یافتہ اقسامِ زندگی کے لئے کاملاً مناسبِ حال ہے۔ [1] کیڑوں کے جسم ایک سخت بیرونی ڈھانچے یا خول کے اندر مقید ہوتے ہیں، ان کے دماغ ان کے چھوٹے سے سر کے اندر محصور ہوتے ہیں جہاں یادداشت کو ذخیرہ کرنے یا پیچیدہ معلومات کو ''پروسیس'' کرنے کی جگہ موجود نہیں ہوتی، یہی ذخیرۂ معلوماتِ آموزش(Learning) کی بنیاد بنتی ہے۔ لہٰذا ایک سماجی تنظیم جس کے اندر ہر رکن ایک تنگ احاطے میں ایک طے شدہ

کردار ادا کرتا ہے اور اصناف مکمل طور پر اپنے اپنے کاموں میں مہارت کا مظاہرہ کرتی ہیں، یہ چیونٹیوں اور شہد کی مکھیوں جیسے سماجی کیڑوں کی دنیا ہوتی ہے۔ یہاں ملکہ مکھی یا مادہ چیونٹی کا کام صرف انڈے دینا ہوتا ہے۔ نر مکھی کا واحد کام مادہ مکھی کو حاملہ کرنا ہوتا ہے۔ اور کارکن مکھیاں یا چیونٹیاں، جیسا کہ ان کے نام سے ظاہر ہے، سوائے غیر پیداواری کام کے، جوان کی کالونی کو غذا اور مکانیت مہیا کرنا ہوتا ہے اور کچھ نہیں کرتیں۔

اس کے برعکس انسان زندگی وہ قسم ہیں جو بے حد لچکدار اور کم سے کم مخصوص کردہ جسمانی ساخت کے حامل ہوتے ہیں۔ عورتیں اور مرد، دونوں اس طرح ایستادہ ہوتے ہیں کہ ان کے ہاتھ آزاد ہوتے ہیں جو آلات کو استعمال کر سکتے ہیں۔ دونوں اصناف کے ذہن بہت ترقی یافتہ ہوتے ہیں جن میں یادداشت کو ذخیرہ کرنے کی بے پناہ گنجائش، اور معلومات کو مفید تر طریقے سے استعمال کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے جو ہمیں لچک پذیر اور وسیع النظر بنا دیتی ہے۔ مختصراً یہ کہ ہمیں بنی نوعِ انسان کہلانے کا شرف حاصل ہے۔ (۲)

اس طرح اگرچہ اینڈ روکریسی کی مانند ایک غیر لچکدار بہ ترتیب مدارجِ معاشرتی ساخت جو انسانیت کے دونوں نصفوں کو ایک بے لچک کردار میں مقیّد کر دیتی ہے، محدود صلاحیت رکھنے والی انواع، از قسم سماجی کیڑا کے لئے واقعی مناسب ہے مگر انسانوں کے لئے نامناسب ہے۔ (۳) اور ہمارے فنیاتی ارتقا کے اس مرحلے پر یہ ہلاکت خیز بھی ہو سکتی ہے۔

ناقابلِ حل مسائل

ناربرٹ وائینر نے ''خودکاریات'(cybernetics) پر ایک کتاب لکھی ہے جو ہماری دنیا کے حرکیاتی طریقِ عمل کے بارے میں اوّلین تصنیف ہے۔ اس میں اس نے کہا ہے کہ ہماری انواع کو ارتقائی عمل کے باعث دیگر انواع پر یہ فوقیت حاصل ہے کہ ہم ردِّ عمل کے جواب میں اپنے رویّے میں بہتری لانے کی اعلیٰ ترین قابلیت کے حامل بن چکے ہیں۔ اگر ہمارا ماضی کا روّیہ موثر ہو یا کم مؤثر ہو تو اس کے بارے میں ہمیں متغیرہ معلومات حاصل ہو جاتی ہیں اور موجودہ حالات کے بارے میں بھی معلومات حاصل ہوتی رہتی ہیں۔ (۴)

وہ مزید لکھتا ہے کہ ہمارے پاس ایک زائد ارتقائی امتیاز بھی حاصل ہے اور وہ یہ کہ ہم اپنے طرزِ عمل کو تیزی سے تبدیل کر سکتے ہیں۔ دیگر انواع بھی طرزِ عمل کے نئے انداز

"patterns" وضع کرسکتی ہیں اور ان میں سے جو ایسا نہیں کرتیں، وہ ہلاک ہوجاتی ہیں۔ لیکن بیشتر انواع اپنے ارتقائی عمل کے ''دوران'' اپنا روّیہ تبدیل کرلیتی ہیں، یہ تبدیلیاں ان کے جسم اور دماغ کی ساخت میں واقع ہوتی ہیں۔ اس کے برعکس اگر ہم انسان اپنے رویّوں میں تبدیلی لانا چاہیں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں کے بل بوتے پر بہت تیزی سے بلکہ آناً فاناً لاسکتے ہیں۔

لیکن اس میں کامیاب ہونے کے لئے تین باتیں لازماً کرنا پڑتی ہیں: (۱) ہمیں ردّعمل (فیڈ بیک) کا احساس ہو (۲) ہم اس کی صحیح تعبیر کرسکیں (۳) اس تعبیر کو تبدیلی لانے کے لئے بروئے کار لائیں۔

ہمارے کرۂ ارض کے موجودہ حالات کے بارے میں ہم پر فیڈ بیک کی جو بمباری ہورہی ہے مستقبل بین لوگوں نے اسے دولفظوں میں سمویا ہے'' "The world problematique"(۵)''فرسٹ اینڈ سیکنڈ کلب آف روم'' رپورٹس، گورنمنٹ ''رپورٹس گلوبل ۲۰۰۰''، اقوام متحدہ کی تحقیق اور دیگر بین الاقوامی مطالعاتی رپورٹس کے کمپوٹرائزڈ ڈیٹا تجزیات کی بنیاد پر سائنسدانوں کا کہنا ہے کہ اگر موجودہ رجحان برقرار رہا تو ہم لامحالہ آج سے کہیں زیادہ بڑے پیمانے کے انتشار سے دوچار ہوجائیں گے اور شدید سیاسی اور اقتصادی بحران آئیں گے اور ماحول تہس نہس ہوجائے گا۔ (۶)

ہم پہلے ہی ایک سنگین ماحولیاتی عدم توازن اور فضائی آلودگی سے دوچار چلے آرہے ہیں۔ ہم تیزابی بارش کے اثرات، تابکاری کی بڑھتی ہوئی سطح، زہریلے مادوں کے ڈھیر اور صنعتی اور جنگی سامان کی آلودہ کاریاں پاتے ہیں۔ سائنسدان خوفزدہ ہیں کہ کہیں اوزون کو کم کرنے والے کیمیکلز کی بھرمار دنیا کے موسموں کو تبدیل نہ کردے۔ منطقۂ حارہ کے جنگلات کی تیزی سے ہونے والی تباہی بھی تشویشناک ہے۔ بہت سی انواع نابود ہورہی ہیں۔ اندازہ کیا گیا ہے کہ آئندہ چند سالوں میں تمام انواع کی کم وبیش ۲۰ فیصد تعداد ختم ہوجائے گی (۷)

قابل کاشت اراضی کا ضیاع ایک اور سنگین مسئلہ ہے۔ خاص طور پر قحط زدہ افریقہ میں صورتحال یہ ہے کہ ہرسال فصلوں اور چراگاہوں کا بہت بڑا خطہ بنجر علاقے میں تبدیل ہوجاتا ہے اور پیشگوئی یہ ہے کہ صحرا کی سی کیفیات مسلسل بڑھتی رہیں گی۔

قحط اور غربت نے پہلے ہی تباہی مچارکھی ہے۔ ۱۹۸۳ء میں ایک کروڑ دس لاکھ بچے اپنی

پہلی سالگرہ منانے سے پہلے ہی فوت ہوگئے تھے، دوارب افراد کی سالانہ آمدنی ۵۰۰ ڈالر سے بھی کم تھی۔ ۴۵ کروڑ افراد بھوک اور کم غذائیت سے دوچار تھے دوارب افراد کو پینے کے لئے قابل بھروسہ محفوظ پانی میسّر نہیں تھا۔ (۹) یونائیٹڈ سٹیٹس (US) جو دنیا کے امیر ترین ممالک میں سے ہے قومی شرحِ غربت سترہ برسوں میں بلند ترین سطح پر تھی ۳ کروڑ ۴۰ لاکھ افراد جو کل آبادی کا پانچواں حصہ تھے، سرکاری معیارِ غربت کے مطابق نادار تھے۔ (۱۰)

حالیہ رجحانات کی بنیاد پر اندازہ یہ ہے کہ آئندہ حالات بہتر نہیں بلکہ خراب تر ہوں گے۔ غریب اور امیر کے درمیان، اسی طرح نادار اقوام اور دولتمند اقوام کے درمیان خلیج وسیع سے وسیع تر ہوتی چلی جائے گی۔ صنعتی وزرعی پیداواروں میں اضافے کے باوجود شرح آبادی میں اضافے کی وجہ سے آئندہ برسوں میں غریبوں کے حالات، آج سے بھی زیادہ خراب ہوجائیں گے۔ (۱۱)

مختصر یہ کہ ہمیں اپنی چاروں اطراف سے خطرے کا سگنل موصول ہورہے ہیں۔ معلومات یہ ہیں کہ عالمی نظام میں ٹوٹ پھوٹ شروع ہوچکی ہے، ان سگنلز میں سے فوری طور پر قابل توجہ بات وہ ہے جسے مستقبل بین لوگ آبادی کا ''دھماکہ'' قرار دیتے ہیں۔ جوں جوں زیادہ سے زیادہ افراد جنم لیتے رہتے ہیں اور وہ پھر آگے مزید افراد کو پیدا کرتے رہتے ہیں، آبادی میں بے تحاشہ اضافہ ہوجاتا ہے۔ (۱۲) اگر یہی شرحِ پیدائش برقرار رہی تو اندازہ کیا گیا ہے کہ ۲۱ ویں صدی کے وسط میں ''ایک سال'' کے دوران کرۂ زمین پر پیدا ہونے والے افراد کی تعداد میں، وفاتِ مسیح کے بعد پورے پندرہ سو برسوں کے دوران جتنے لوگ پیدا ہوئے ان سے زیادہ اضافہ ہوچکا ہوگا۔ (۱۳)

آبادی میں اضافے کی رفتار نمایاں طور پر کم کرنے کی موجودہ پالیسیاں ناکام ہوچکی ہیں جس سے آبادی کا بحران مزید شدت اختیار کرچکا ہے۔ مستقبل بین لوگ اس بحران کو ناقابل حل پیچیدہ مسائل کا قلب قرار دیتے ہیں اور انہوں نے اس کا نام "World problematique" رکھا ہے۔ کیونکہ زمین بردگی، اس کے صحرا میں تبدیل ہونے، پانی اور ہوا کی آلودگی اور دیگر ماحولیاتی، معاشرتی اور سیاسی بحرانوں کے پیچھے محدود زمین اور دیگر

وسائل پر زیادہ سے زیادہ افراد کی موجودگی کا دباؤ ہے۔ زیادہ افراد کو سامان کی فراہمی کے لئے زیادہ فیکٹریوں زیادہ ٹرکوں، زیادہ بسوں اور کاروں کی ضرورت پڑے گی اور جتنی زیادہ فیکٹریاں ہوں گی اتنی ہی آلودگی زیادہ بڑھے گی۔ زیادہ بسیں اور ٹرک ہوں گے تو ایندھن کی کھپت بھی بڑھے گی، سڑکیں بھی تنگ پڑ جائیں گی اور فضا میں دھوآں بھی زیادہ ہوگا۔ (۱۴)
اور یہ آبادی کے دھماکے کا نتیجہ ہے جس کی بدولت ہم واضح طور پر دیکھ سکتے ہیں کہ اینڈروکریٹک سسٹم نے ہمارے مسائل کو کس طرح اور کیوں ناقابل حل بنایا ہے۔

انسانی مسائل اور عورتوں کے مسائل

ماضی پر نظر دوڑاتے ہوئے ہم نے دیکھا ہے کہ مروّجہ صورتِ حال نے ہمارے سکالرز کی آنکھوں کو کس طرح محرومِ بینائی رکھا کہ مادر دیوی کی زمانہ قبل از تاریخ شبیہات میں وہ صرف موٹی موٹی وینسوں (Venuses) کو ہی دیکھ پائے تھے جنہیں مردوں کی جنسی خواہش کے لئے مطلوب موٹی موٹی چیزوں کے طور پر پیش کیا گیا۔ اسی ذہنی رجحان کے تحت اگر ہم اپنے مستقبل کی طرف دیکھیں تو ہمارے کرۂ ارض کو لاحق پریشانیاں بھی مسخ شدہ دکھائی دیتی ہیں۔

مسئلے کا آغاز اس حقیقت سے ہوتا ہے کہ بیشتر ماہرین مدتِ دراز سے جو معلومات اخذ کرتے رہے ہیں ان میں عورتوں کو حذف کر دیا جاتا رہا ہے۔ اس طرح بہت سے پالیسی ساز صرف آدھی معلومات (half data base) کی بنیاد پر کام کرتے ہیں۔لیکن اگر ''ڈیٹا'' ان کے سامنے موجود ہو تب بھی وہ موجودہ نظام کے ہوتے ہوئے مناسب اقدام نہیں کر سکتے۔

مثال کے طور پر بہت سے بے پناہ آبادیوں والے کم ترقی یافتہ مسلم ممالک میں شرح پیدائش کے زیادہ ہونے کو کوئی مسئلہ نہیں سمجھا جاتا۔ ایران میں آیت اللہ خمینی جیسے اور پاکستان میں ضیاء الحق جیسے لیڈر عوام کی خوفناک غربت میں اور عورتوں کی اس حیثیت میں کوئی تعلق نہیں پاتے جس میں عورتوں کو مرد کے زیر کنٹرول صرف بچے پیدا کرنے والی ٹیکنالوجی سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح ۱۹۸۴ء میں میکسیکو سٹی میں منعقدہ ''پاپولیشن کانفرنس'' میں اس حقیقت سے چشم پوشی کی گئی تھی۔ یہ کانفرنس سب سے زیادہ آبادی والے شہر میں ہوئی تھی جس میں ہر سال لاکھوں غیر قانونی تارکین وطن اپنے ممالک میں بے پناہ آبادی کی

MashalBooks.org

بنا پر پیدا ہونے والی غربت سے فرار ہو کر پناہ لینے آجاتے ہیں۔ کانفرنس میں اس وقت کے امریکی صدر ریگن کی انتظامیہ کے نمائندوں صاف صاف کہہ دیا کہ آبادی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ (۱۵)

عالمی پریس اور حتیٰ کہ انتہائی اعلیٰ درجے کے سکالرز کی تحقیق کے مضمرات یہ ہیں کہ یہ مثالیں یہ ظاہر کرتی ہیں کہ متعلقہ حکومتیں ذہانت سے اس قدر محروم ہیں کہ انہیں اصل حقائق کا شعور ہی نہیں۔ لیکن یہ تاثر خطرناک طور پر گمراہ کن ہوسکتا ہے۔ کیونکہ درحقیقت یہ ان کی اس انتہا درجے کی بصیرت کا مظہر ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ دنیا میں اس مردانہ (اینڈروکریٹک) نظام کو برقرار رکھنے کے لئے کیا چیز درکار ہے۔

یہ بڑی حیرت انگیز بات ہے کہ اینڈروکریٹک نظام کی اس پسپائی کے دور میں ایسی پالیسیوں کی ایک ڈرامائی مثال اس قوم کی جانب سے سامنے آئی ہے جو انصاف، مساوات اور سماجی ترقی کے نسوانی (گائیلینک) تصورات کو عملی جامہ پہنانے کی مساعی میں کبھی ایک مثال ہوا کرتی تھی۔ امریکہ نے حال ہی میں ایسی رجعت پسندانہ پالیسیاں اختیار کی ہیں جو شرح پیدائش میں کمی کی بجائے اضافے کا باعث بننے والی ہیں۔ امریکہ کے زیر اثر زیادہ آبادیوں والی اقوام بھی لازماً اس کے نقش قدم پر چلیں گی۔ امریکی انتظامیہ نے ریگن دور میں تیسری دنیا کے فیملی پلاننگ پروگراموں کے لئے اپنے فنڈز میں کٹوتی کر دی، اسی دور میں امریکہ میں بھوک اور افلاس تیزی سے بڑھنا شروع ہوگئے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انتظامیہ نے اسقاط حمل کو غیر قانونی قرار دینے کے لئے آئین میں ترمیم کر دی، جبکہ دستور میں مساوی حقوق کے لئے ترمیم کی مخالفت کرتے ہوئے ان قوانین کو بھی نظر انداز یا منسوخ کر دیا گیا جو عورتوں کو ملازمت اور تعلیم کے مساوی مواقع کی ضمانت دیتے تھے۔ (۱۶)

دنیا کے دیگر ممالک میں ماسوائے چین، انڈونیشیا، تائیوان اور بعدازاں کینیا اور زمبابوے کے، فیملی پلاننگ شاذونادر ہی کہیں سرِ فہرست ترجیح ہے۔ اس کے برعکس کمیونسٹ رومانیہ نے جو مشرقی بلاک کے غریب ترین ممالک میں سے تھا اس کے آنجہانی صدر نکولائی چاؤشسکو نے اعلان کیا کہ حبِ وطن عورتوں سے مطالبہ کرتی ہے کہ وہ کم از کم چار بچوں کو جنم دیں، اس نے مقام تعیناتی پر ملازم عورتوں کے لئے ہر مہینے حمل ٹیسٹ ضروری قرار دیا اور ان سے طبی طور پر وضاحت کرنے کے لئے کہا کہ وہ قرار حمل سے کیوں پہلو تہی کئے

ہوئے ہیں۔ [۱۷] اور بہت سے زیادہ آبادی والے غریب ملکوں کی عورتوں کے لئے برتھ کنٹرول تک رسائی خاص طور پر ممنوع قرار دی جا چکی ہے۔ [۱۸]

۱۹۸۴ء کی تاریخی طور پر اوّلین انٹرنیشنل ''پاپولیشن کانفرنس'' میں دنیا بھر کی ''عورتوں کی حیثیت بہتر بنانے'' کو ایک اہم نصب العین بنانے کا اعلان کیا گیا تھا۔ یہ ان کی حیثیت بہتر بنانے اور اولاد پیدا کرنے کی صلاحیت(fertility) کم کرنے کے لحاظ سے بھی اہم تھا۔ [۱۹] لیکن عملاً یہ ہوا ہے کہ ایسی پالیسیاں وضع کرنے کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی جن میں عورتوں کے لئے اچھے مواقع پیدا ہوں اور انہیں اولاد کم پیدا کرنے کی ترغیب ملتی ہو۔ [۲۰] باوجود اس کے کہ دنیا بھر کے ماہرینِ پاپولیشن کی طرف سے یہ واضح پیغام دیا گیا ہے کہ اگر پاپولیشن پلاننگ کو کامیاب بنانا ہے تو انہیں ماؤں اور بیویوں کے علاوہ سماجی طور پر مسلمہ کردار (roles) دینا برتھ کنٹرول ایجوکیشن فراہم کرنے سے بھی زیادہ اہمیت رکھتا ہے۔ [۲۱]

منطقی طور پر، اس کے متبادل سادہ سے ہیں۔ آبادی میں اضافہ روکنے کے روایتی ذرائع، بیماریاں، بھوک اور جنگ ہوتے ہیں۔ عورتوں کے لئے باز آفرینی کی آزادی (reproductive freedom) اور مساوات وہ واحد طریقہ ہے جو آبادی میں بے تحاشہ اضافے کو روک سکتا ہے۔ لیکن ''عورتوں کے ان مسائل'' کو فہرستِ ترجیحات میں سب سے اوپر رکھنے کا مطلب موجودہ نظام کو ختم کرنا ہوگا۔ اس کا مطلب معاشرے کے تسلط ماڈل کو شراکت ماڈل میں تبدیل کرنا ہوگا۔ جبکہ ایک اینڈروکریٹک ذہن کے لئے یہ ایک ناممکن امر ہے۔

چنانچہ یہ لوگ ایسے ''تھنک ٹینکس'' تلاش کرتے اور انہیں فنڈز فراہم کرتے ہیں جو انہیں وہ کچھ بتاتے ہیں جو یہ سننا چاہتے ہیں۔ امریکہ میں انتہائی قدامت پسندانہ مفادات رکھنے والے عناصر سے فنڈ پانے والوں میں ایک ''ہیریٹیج فاؤنڈیشن'' ہے وہ آگے مشہور فیوچرسٹ ''ہرمن کاہن'' اور اکانومسٹ ''جولین سائمن'' اور دیگر شخصیات کو فنڈز فراہم کرکے ان سے تحقیق کراتے ہیں۔ جن کا کہنا ہے کہ عالمی اضافۂ آبادی کوئی مسئلہ نہیں ہے۔ [۲۲] ان کا مختصراً دعویٰ یہ ہے کہ محدود پیمانے پر اس کا حل وقتاً فوقتاً پڑنے والا قحط ہے جو زائد آبادی کو کم کرنے میں مدد دے گا۔ اور وسیع پیمانے پر اس کا حل یہ ہے کہ جو لوگ دنیا کی اقتصادی سلطنتیں چلاتے ہیں وہ بے لگام جارحانہ سابقت کے ذریعے بے تحاشہ دولت پیدا

کریں گے جس میں سے ''نیچے گرنے والے'' دانے دنیا میں آنے والے سب لوگوں کے پیٹ بھرنے کے لئے کافی ہوں گے۔ (۲۳)

یہ ہمارے زمانہ قبل از تاریخ کے ان لوگوں کے جدید جانشین ہیں جنہوں نے حقیقت کو سر کے بل کھڑی کر دیا تھا۔ انہوں نے بھوک اور غربت کے مسئلے کے ویسے ہی ''حل'' ڈھونڈے ہیں جیسی کہ ان کی شروع ہی سے روایت چلی آ رہی ہے۔ پہلے قدم کے طور پر وہ عالمی سطح پر بھوک اور غربت کی موجودگی کا یا تو انکار کرتے ہیں یا اسے کم سے کم کر کے پیش کر دیتے ہیں۔ (۲۴) اگر اسے ناقابل تردید شواہد کے ذریعے پیش کر دیا جائے مثلاً یہ کہا جائے کہ ہر منٹ میں ۳۰ بچے غذا اور سستی سی ویکسین بھی نہ ملنے کی وجہ سے ہلاک ہو جاتے ہیں (۲۵) تو وہ جھنجلا کر جواب دیتے ہیں یہ ''افسوسناک صورت حال ہے'' مگر یہ عارضی ہے۔ جوں جوں ''فری مارکیٹ'' قائم ہوتی جائے گی غربت اور بھوک رفتہ رفتہ ختم ہوتی جائیں گی۔ (۲۶)

حتیٰ کہ وہ لوگ جو انسانی مصائب کے حوالے سے کم سنگدل اور درحقیقت گہری تشویش میں مبتلا ہیں وہ ایسے روایتی پھندوں میں پھنس جاتے ہیں جو صورتِ حال کو اوجھل کر کے حقیقت کو مسخ کر دیتے ہیں اور بھوک وافلاس پر عمومی انداز میں گفتگو کرتے رہتے ہیں۔ جب شواہد واضح طور پر انہیں سب کچھ بتا دیتے ہیں تو وہ اینڈروکریٹک یعنی تسلط ماڈل کی روایت کے مطابق کہتے ہیں کہ غربت وافلاس درحقیقت بنیادی طور پر ''نسوانی مسائل ہیں''۔ (۲۷)

حکومت امریکہ (یو ایس اے) کے اعداد و شمار کے مطابق جن خاندانوں کی سربراہ عورتیں ہیں وہ امریکہ میں غریب ترین ہیں جن کی شرح ناداری دیگر خاندانوں کی بہ نسبت تین گنا ہے۔ اور امریکہ میں غربت میں گزارہ کرنے والے تین معمر افراد میں سے دو عورتیں ہوتی ہیں۔ (۲۸) ترقی پذیر ملکوں میں حقائق اس سے بھی زیادہ تلخ ہیں۔ (۲۹) افریقہ میں ریفیوجی کیمپوں کے اندر اور باہر غریبوں میں سے سب سے زیادہ غریب اور بھوکوں میں سے سب سے زیادہ بھوکے عورتیں اور ان کے بچے ہیں۔ (۳۰) اور اقوام متحدہ کی "State of world's women 1985" رپورٹ اور غیر سرکاری دستاویزات کے مطابق ایشیا اور لاطینی امریکہ میں بھی یہی صورت حال ہے۔ (۳۱)

اور پھر منطق یہ تقاضا کرتی ہے کہ قومی اور بین الاقوامی پالیسیوں میں عورتوں کی غربت

اور بھوک سے متعلقہ پروگراموں کو اوّلین ترجیح دی جانی چاہیے۔ لیکن ان حقائق کا جواب کیا ہے؟

امریکہ میں باوجود اس کے کہ عورتوں کی بے روزگاری انتہا کو پہنچی ہوئی ہے ۱۹۷۰ء اور ۱۹۸۰ کی دہائیوں میں منظور شدہ امدادی پروگراموں میں مردوں کے زیرِ تسلط تعمیرات اور سڑکوں کی مرمّت کے پیشوں میں عورتوں کے لئے چند حقیر سی تعداد میں جاب رکھے گئے۔ افریقہ میں قحط کے باوجود اور اس حقیقت کے باوجود کہ فصلیں اُگانے والوں میں عورتوں کا تناسب ۶۰ سے ۸۰ فیصد تک ہے ٹیکنیکل ایگریکلچری ایڈ، قرضے، زمینوں کی گرانٹ اور رقوم کی سبسیڈیز صرف مردوں کے لئے مخصوص ہیں۔ ایشیا اور لاطینی امریکہ میں باوجودیکہ عورتوں کو تعلیم اور تربیت کے کم مواقع ملتے ہیں اور انہیں کم معاوضوں والے پیشوں سے ہی منسلک ہونا پڑتا ہے، اقتصادی ترقی اور غیر ملکی امداد کے پروگرام تقریباً مردوں ہی کے لئے مخصوص ہیں۔ (۳۲)

اینڈروکریٹک نظام کا عقلی جواز یہ ہے کہ یہ مرد ہی ہیں جو بطور ''سربراہ خاندان عورتوں اور بچوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں''، لیکن یہ منطق حقیقت کے اس ماڈل پر مبنی ہے جو ڈیٹا کی بھرمار سے چشم پوشی کرتی ہے۔ ان حقائق کو کیسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے کہ دنیا میں کسمپرسی کی حالت میں رہنے والی عورتیں اور بچے جو ''آباد'' اور ''برباد'' گھرانوں سے تعلق رکھتے ہیں اس وجہ سے بے حال ہیں کہ ان کے مرد اپنی بیویوں اور بچوں کی ضروریات پوری نہیں کرتے۔

مسئلہ صرف یہ نہیں ہے کہ امریکہ جیسے صنعتی ترقی یافتہ ممالک میں طلاق یافتہ باپوں کی نصف سے زائد تعداد بیوی بچوں کو نان نفقہ ادا کرنے کے احکامات کی تعمیل نہیں کرتی، (۳۳) اور نہ صرف یہ کہ افریقہ اور ایشیا میں مرد اپنے بیوی بچوں کو پیچھے چھوڑ کر شہروں میں جا بستے ہیں انہیں ''بس گزارہ کرو'' کا حکم دے کر وہاں کی رونقوں میں گم رہتے ہیں لیکن کبھی کبھار ہی واپس آ کر ایک اور بچے کا بیج بو جاتے ہیں۔ (۳۴)

مسئلہ یہ ہے کہ مرد کے زیرِ غلبہ معاشروں میں عورتوں کی غربت اور بھوک کی جڑیں بہت زیادہ گہری ہیں۔ یہ صرف ان خاندانوں تک محدود نہیں جن کی سربراہ عورتیں ہیں، یہ اس خاندانی تشکیل کا جزولازم ہے جس میں گھرانے کے مرد ''سربراہ'' کو سماج نے یہ اختیار

دے رکھا ہے کہ وہ وسائل اور نقدی کو جس طرح چاہے تقسیم اور استعمال کرے۔

مثال کے طور پر ہماری مغربی تاریخ میں، خواہ یہ روسی جاگیردار تھے، آئرلینڈ کے کان کن تھے یا امریکہ کے چھجے دار ٹوپ پہننے والے تھے، اپنی کمائی کو خاندان کے لئے خوراک وغیرہ خریدنے کے لئے بیوی کے حوالے کرنا اپنی مردانگی کی توہین سمجھتے تھے۔ ادھر آج کے مرد اپنی کمائیوں کو شراب اور جوئے کی نذر کردیتے ہیں، بیویاں ایسی حرکتوں پر اعتراض کریں تو ان کی پٹائی کردیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بیوی نے اس کے مردانہ اختیار کو چیلنج کرنے کی گستاخی کی ہے۔ بہت سے لاطینی اور افریقی ممالک میں یہ مردوں کی ایک عام بیماری ہے۔

مزید برآں ترقی پذیر دنیا میں بہت سی عورتیں اپنے خاندانوں کے لئے غذائی پودے، سبزیاں وغیرہ اُگاتی ہیں اور پھر کھانا تیار کرکے سب کے سامنے رکھ دیتی ہیں اور جب تک مرد شکم سیر ہو کر کھانہ لیں وہ اس وقت تک خود نہیں کھاتیں۔ (۳۵) اس طرح کھانے کے طریق کار میں صنفی امتیاز کے لئے جواز یہ پیش کیا جاتا ہے کہ مردوں کو زیادہ مقدار میں کھانے کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ وہ باہر بہت محنت کرکے کمائی لاتے ہیں مگر انہیں یہ احساس نہیں ہوتا کہ عورتیں صبح سویرے اٹھ کر صفائی ستھرائی کرتی ہیں اور مرد کے جاگنے سے پہلے سب کچھ پکا کر تیار کر ڈالتی ہیں اور شام کو اس کے آنے سے قبل بہت سے گھریلو کام کرنے کے ساتھ ساتھ رات کا کھانا وغیرہ بھی تیار کرتی رہتی ہیں۔ یا مردوں کو محض اس لئے پہلے کھانا ملنا چاہیے کہ یہ ایک ''نسلی روایت'' ہے اس پر مغربی بیرونی لوگوں کو اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ بعض ملکوں میں عورتوں بالخصوص حاملہ عورتوں کے لئے بعض اقسام کے کھانے ''ممنوع'' ہوتے ہیں۔ حالانکہ وہی کھانے ان کی صحت برقرار رکھنے کے لئے بہت ضروری ہوتے ہیں۔ نتیجتاً عالمی تنظیم صحت (WHO) کی تحقیق سے پتہ چلتا ہے کہ تیسری دنیا کی بچے پیدا کرنے کی عمر کی عورتوں کی تقریباً نصف تعداد خون میں سرخ ذرات کی قلت کی بیماریوں میں مبتلا ہے اور حاملہ عورتوں کی ۶۰ فیصد تعداد ایسی بیماریوں سے دوچار ہے۔

لیکن وسائل کی تقسیم میں ایسے صنفی امتیازات نہ ''صرف'' عورتوں کو بُری طرح متاثر کرتے ہیں بلکہ مردوں کے لئے بھی خوفناک مضمرات رکھتے ہیں کیونکہ یہ انسانی ارتقا میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ یہ ایک معروف حقیقت ہے کہ ناقص یا ناکافی غذا کی شکار مائیں عموماً ایسے

بچوں کو جنم دیتی ہیں جو لاغر پن اور بیماری میں مبتلا ہوتے ہیں یا عنقریب مبتلا ہونے والے ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ قلتِ غذا نومولود بچے اور بچی، دونوں کو متاثر کرتی ہے۔ جسمانی طور پر کمزور بچے عموماً ذہنی لحاظ سے بھی دوسرے بچوں سے کمزور ہوتے ہیں۔ اگر ماں صحت مند ہو اور اسے معیاری غذا ملتی ہو تو وہ لامحالہ صحت مند اور ذہین بچوں کو جنم دیتی ہے۔

اس طرح چونکہ ہماری دنیا ایک خاص سسٹم کے تحت ان انسانی مسائل کو نظرانداز کرتی ہے جنہیں وہ اب تک ''عورتوں کے مسائل'' قرار دے رہی ہے۔ چنانچہ دونوں صنفوں سے تعلق رکھنے والے لاکھوں انسان اپنے پیدائشی حق، صحتمند، سیر حاصل (productive) اور بھرپور زندگی گزارنے کے حق سے محروم رہتے ہیں۔ اور چونکہ عورتوں کے حقوق انسانی حقوق نہیں سمجھے جاتے، اس لئے نہ صرف ہمارا ثقافتی ارتقا بلکہ حیاتیاتی ارتقا بھی غیر ضروری تعطل سے دوچار ہو جاتا ہے۔

اس لئے یہ عین منطقی تقاضا ہے کہ غذائی تقسیم میں صنفی امتیاز کو ختم کرنے کے لئے فوری اقدامات کئے جائیں اسی طرح آبادکاری کے طریق کار اور ترقیاتی پالیسیوں کو بھی منصفانہ بنانے کی ضرورت ہے۔ یہ سب اینڈروکریٹک نظام کی خامیاں اور ناہمواریاں ہیں۔

بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ مردانہ تسلّط پر مبنی معاشروں میں پالیسیاں وضع کرنے اور ان پر عمل درآمد کرنے میں دو اساسی رکاوٹیں ہیں۔ پہلی رکاوٹ یہ ہے کہ مرد کے غلبے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے یہ ضروری ہوتا ہے کہ کم از کم نصفِ انسانیت سے تعلق رکھنے والے تقاضوں کو نظرانداز کر دیا جائے یا انہیں بے اہمیت سمجھا جائے۔ ''ڈیٹا'' میں سے اتنی عظیم الشان حقیقت کا اخراج اتنے بڑے پیمانے کی فروگزاشت ہے جو اگر کسی اور سیاق وسباق میں ہوتی تو سائنسدان جھپٹ پڑتے اور اسے ضابطۂ کار میں تباہ کن دراڑ (fatal methodical flaw) قرار دے دیتے۔ لیکن اگر کسی طرح اس ابتدائی رکاوٹ پر قابو پا بھی لیا جائے اور پالیسی سازوں کو ایک مکمل اور غیر متعصّبانہ ڈیٹا فراہم کر دیا جائے تو ایک دوسری اور اس سے بھی زیادہ بنیادی رکاوٹ آ کھڑی ہوتی ہے اور وہ یہ ہے کہ مردانہ تسلّط کے نظام میں اولین پالیسی ترجیح مردانہ غلبے کو تحفظ دینا ہوتی ہے۔ اس کا اہتمام کیسے کیا جائے۔

لہٰذا ایسی پالیسیاں جو مرد کے غلبے کو کمزور کرتی ہوں، ان پر عمل درآمد نہیں ہو سکتا، اگر وہ

MashalBooks.org

وضع کر بھی لی جائیں، تو ان میں رخنے پڑتے رہتے ہیں، ان کو حسبِ ضرورت فنڈ نہیں دیئے جاتے اور ہر صورت میں انہیں ناکام بنادیا جاتا ہے۔

مطلق العنانیت پر مبنی حل

جب عوام کے منتخب کردہ لیڈر ان کے اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی مسائل حل کرنے میں ناکام ہوجاتے ہیں تو لوگ اپنے سوالوں کے جوابات کے لئے کسی اور کی طرف دیکھنے لگتے ہیں۔ اینڈروکریٹک ذہن، مراتب کو حق (right) کے طاقت (might) سے مساوی ہونے سے اوپر گردانتے ہوئے سوچتا ہے اور مردآہن کی حکمرانی کے انداز میں تشدد سے جواب دیتا ہے۔

اس طرح یہ بات حیرت انگیز نہیں ہے کہ ترقی پسند نظاموں کی ناکامی اور (یا) ایٹمی تباہ کاری کے علاوہ مستقبل کا نقشہ اکثر عالمی مطلق العنانیت کی صورت میں بنتا ہے۔Orwell کی سائنس فکشن"Prophetic 1984" سے لے کر"Rollerball" اور"Fahrenheit 451" فلموں تک سب کا عمومی موضوع یہی رہا ہے۔ مستقبل کے لئے اہل علم بھی ایسی پیشنگوئیاں کرتے ہیں جیسا کہJacques Ellul کی پیش گوئی ہے کہ ایک انسانیت کے خصائص سے محروم دنیا کا دور آنے والا ہے جس پر وحشی ٹیکنوکریٹوں کی حکمرانی ہوگی (۳۷) حتیٰ کہ ''امید پرستانہ'' منظر دکھانے والے ہڈسن انسٹی ٹیوٹ کے ہرمن کاہن نے ناقابلِ یقین خوشحالی کے اس انجام کی پیشنگوئی اس طرح کی ہے کہ اس ادارے کے بزنس قواعد کے تحت، اس کے گاہکوں میں فوجیں بھی شامل ہوجائیں گی اور بالآخر ایک عظیم الشان سلطنت وجود میں آجائے گی جو اپنے خصائص کی وجہ سے نئی ''آگسٹینین ایمپائر'' ہوگی۔ (۳۸)

اکثر کہا جاتا ہے کہ مطلق العنانیت پر مبنی مستقبل میں سب سے بڑی نفسیاتی اپیل یہ ہے کہ اس کے نتیجے میں ایک ''مضبوط لیڈر'' ابھرے گا جو (ہمارے بچپن کے زمانے کے) ''زبردست باپ'' کی طرح ''سب کچھ سنبھال لے گا''۔ مگر اس شرط کے ساتھ کہ اس کی دلی طور پر اطاعت کی جائے۔ یہ یقینی امر ہے کہ جو ذہن مرد کی اتھارٹی کے ماحول میں بنا ہو وہ بحران کے دور میں ''تحفظ'' ہی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ لیکن یہاں اس کے لئے مضبوط اپیل کی ایک اور وجہ جدید مطلق العنانیت کا قیام ہے جو بہت بڑا خطرہ ہوگی۔

مطلق العنانیت کا روایتی منظر ایک بالکل جدید آفت یا ہمارے سیکولر سائنٹیفک دور کا

ایک خصوصی خوفناک نظارہ ہوگا۔ (۳۹) یہ درست ہے کہ جرمنوں کے عقوبت خانے انسانوں کی بہت بڑی تعداد کو چند لمحوں میں نابود کر دینے کی ٹیکنالوجی کے فقید المثال مظاہر تھے لیکن جیسا کہ زمانہ قبل از تاریخ اور ریکارڈ شدہ تاریخ کی انمٹ گواہی ہے کہ پوری پوری آبادیوں کو ذبح کر دینا انوکھی سے بھی پرلے درجے کی حرکت ہیں۔ اور نہ ہی دہشت کی حکمرانی مطلق العنان سلطنتوں کے لئے کوئی نمایاں خصوصیت ہے۔

اگر ہم اپنے گمشدہ ماضی کو دوبارہ سامنے لائیں اور اس میں سے پیچھے جھانکیں اور اس کے کنٹرول کرنے کے طریقے اور اس کا بنیادی ڈھانچہ دیکھیں تو جدید مطلق العنانیت غلبہ ماڈل تنظیم کی بنیاد پر ہونے والے ثقافتی ارتقا کا ایک منطقی عروج ہو گی۔ دہشت کے ذریعے کنٹرول کرنے کی اس کی صلاحیت اس قسم کے معاشرے کی حتمی پیش رفت ہے۔ خلاصۂ مطلق العنانیت ہمارے زمانہ قبل تاریخ میں پہلے پہل قائم ہونے والی سخت گیر اینڈروکریٹک شہری ریاستوں کی جدید ترقی یافتہ شکل ہے۔

بیسویں صدی کی مطلق العنان ریاست اس قدیم مذہبی شہری ریاست کی جدید جانشین ہے جس میں بقول لیویز ممفورڈ، لوگوں کے گروہ دیوہیکل سماجی مشینوں میں حقیر پرزوں کی مانند جڑے ہوئے تھے۔ (۴۰) فاشسٹ اور کمیونسٹ کلیت پسند و مطلق العنان ریاست کے اشرافیہ دراصل قدیم جنگجو /پادری ذاتوں کے جانشین ہیں۔ دونوں کا دعویٰ ہے کہ وہ اوپر سے براہ راست لائن سے منسلک ہیں خواہ وہ کلامِ خود ہو، یا مارکس، ہٹلر، سٹالن یا ماؤ سے ملنے والی ہدایت ہو۔ دونوں کا دعویٰ ہے کہ انہیں اس کلام یا ہدایت کی تعبیر کا بلاشرکتِ غیرے حق حاصل ہے اور وہ اسے بذریعہ قانون یا بذریعہ طاقت یا طاقت استعمال کرنے کی دھمکی نافذ کرنے کا اختیار رکھتے ہیں۔

جیسا کہ اینڈروکریٹک تھیوکریسی میں تھا جہاں کلیسا اور ریاست، ایک دوسرے سے جُدا نہیں تھے فاشسٹ اور کمیونسٹ معاشروں کے حکمران روحانی اور دنیاوی دونوں قسم کے اختیارات استعمال کرتے تھے۔ اینڈروکریٹک مذاہب کی طرح کمیونزم اور فاشزم، اپنے ''سچے'' عقیدے سے ذرہ بھر انحراف بھی برداشت نہیں کرتے۔ اور جدید سیاسی نظریات کے برعکس لیکن اینڈروکریٹک کی مانند، دونوں ایک جامع نظریۂ دنیا پیش کرتے ہیں جس میں خاندانی، سماجی اور سیاسی زندگی کے تمام پہلو یکجا کر دیئے گئے ہیں۔ انتہا پسند دائیں بازو کے

لیڈر اب تک بائیبل کی تعلیمات کا مردانہ تسلط پر مبنی خاندانوں کے لئے بطور اتھارٹی حوالہ دیتے ہیں۔ نازی جرمنی میں فوہرر نے اعلان کیا تھا کہ نہ صرف عورتیں بلکہ ''کمزور'' اور ''زنانہ قسم کے'' مرد بھی یہودیوں کی طرح اس کی نئی ''سپر مین'' نسل سے فطری طور پر پست ہیں۔ اور سوویٹ یونین میں جو خاندانی تعلقات کا سرکاری ماڈل تھا اس میں عورتوں کو بے شمار کہانیوں اور تصاویر میں اپنے مردوں کو اس طرح کھانا پیش کرتے ہوئے دکھایا گیا جس طرح جرمن خاتونِ خانہ(hausfra) کو نازی پروپیگنڈے میں پیش کیا جاتا تھا۔[۴۱]

کمیونسٹ اور فاشسٹ کلیت پسند ریاستوں میں، جیسا کہ بائیبل، قرآن اور دیگر روایتی نسخوں میں آتا ہے اطاعت اور اتفاق اعلیٰ ترین انسانی اوصاف بتائے گئے ہیں۔ اور دونوں میں تشدد کی نہ صرف ''اجازت'' دی گئی ہے بلکہ اس کے اس صورت میں استعمال کا ''حکم'' دیا گیا ہے کہ اس کے ذریعے سرکاری طور پر منظور شدہ آئیڈیالوجی کے تقاضوں کی تکمیل ہونی چاہئے۔ خواہ یہ عہد متوسط کے پادریوں کے تشدد کی صورت میں ہو کتابوں یا لوگوں کو جلانے کی شکل میں ہو یا برین واشنگ کی مستعد ٹیکنالوجی اور جدید کلیت پسند ریاستوں کی وضع کردہ اذیتوں کے ذریعے ہو۔

جدید اور روایتی مطلق العنان ریاستوں کی ایک اور لازمی خصوصیت یہ ہے کہ ان کے کرشماتی اور مسحور کن لیڈر جب اپنے گرد ایک گروہ کثیر جمع کر لیتے ہیں تو وہ ''دشمن کو تباہ کر دو'' کا حکم دے دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر عہد متوسط کے یورپ میں پوپ اربن دوم اور برنارڈ آف کلیر واکس جیسے اینڈروکریٹک مذہبی جنونیوں نے بہت بڑے بڑے مجمع اکٹھے کر کے لوگوں کو پہلے یورپ اور پھر ایشیائے کوچک کو صدی بھر کی خونی صلیبی جنگوں میں جھونک دیا تھا۔[۴۲] اسی طرح نازی جرمنی میں ہٹلر نے مشعل بردار ریلیوں میں آتش بیانی کر کے جدید دنیا کو جنگ عظیم دوم میں دھکیل دیا تھا۔ زمانۂ حال میں ٹیلی ویژن جیسے ہر جگہ رسائی پانے والے میڈیم کے ذریعے کرشماتی نعرہ زنوں کی ایک نئی نسل نے امریکیوں کو ''لادین اور بداخلاق، انسانیت نوازوں، حقوق نسوانیت کے حامیوں اور کمیونسٹوں'' کے خلاف صف آرا ہونے پر اکسا دیا، جن پر وہ دنیا بھر کی خرابیوں کے ذمہ دار ہونے کا الزام لگاتے تھے۔

روایتی اور جدید کلیت پسند ریاستیں سرکاری طور پر منظور شدہ نسخے، خواہ یہ بائیبل ہو یا قرآن، یا ہٹلر کی ''میری جدوجہد'' یا اقوال ماؤ کا مسلسل مطالعہ کرنے کی تلقین کرتی رہتی ہیں

MashalBooks.org

کیونکہ ان میں ''حتمی سچ'' سے متعلقہ سوالوں کا جواب دیا گیا ہے۔ یہ کتابیں وہی مقصد پورا کرتی ہیں جوزمانہ قبل از تاریخ یا رکارڈ شدہ تاریخ میں اینڈروکریٹک نظام کی سخت گیر مذہبی سنسرشپ پورا کرتی تھی۔ آج کل تمام ذرائع ابلاغ جدید کلیت پسند ریاستوں کے زیرقبضہ ہیں۔

زمانہ قبل ازتاریخ کی اینڈروکریسی میں شخصیت پرستی چھوٹے پیمانے پر تھی مگر جدید دور میں شخصیت پرستی، مبالغہ آرائی اور افواہ سازی ایک بڑے پیمانے کی صنعتوں میں شمار ہونے لگی ہے (جیسا کہ "Orwerll's 1984" میں ذکر آیا ہے) نازی جرمنی میں سیاہ بالوں والے غیر دلکش شخص ہٹلر کو مبالغہ آرائیوں کے ذریعے ''فہرر'' کہاجانے لگا پھر اسے ''نسلی طور پر خالص'' سٹرانگ لیڈر اور بھورے بالوں اور سفید رنگت کا حامل نیلی آنکھ والا خوبصورت سپرمین قرار دے دیا گیا۔ روس میں خداوند اور اس کے نائب،لٹل فادر یا ''زار'' کی جگہ پہلے ''فادر آف ریوولیوشن'' لینن نے سنبھالی اور اس کا مجسمہ بنا کر اسے لائق پرستش قرار دے دیا گیا۔ پھر سٹالن اس عہدے پر متمکن ہوگیا اور اس نے ایک باقاعدہ منصوبے کے تحت اپنے لاکھوں لوگوں کو اذیتیں دے دے کر ہلاک کیا۔

ہم کمیونسٹ اور فاشسٹ مدح سرائیوں میں اسی طریق کار کو متحرک پاتے ہیں جس میں اوّلین اینڈروکریٹک قبضے کے دوران حقیقت کو سر کے بل کھڑی کردیا گیا تھا۔ نہ صرف نئی داستانیں گھڑی گئیں بلکہ نئی علامتیں بھی تخلیق کی گئیں۔ مثال کے طور پر سواستیکا اور ہتھوڑا اور درانتی بیسویں صدی میں تقریباً اتنی ہی طاقتور علامتیں تھیں جتنی صلیبی جنگوں کے دوران ''صلیب پر مسیح'' کی علامت لوگوں کو جوش دلاتی تھی اور قدیم مذہبی تقریبات اور مذہب جلوسوں کی جگہ اب ریلیوں اور مشعل برداروں کی پریڈوں نے لے لی ہے جن میں حق پرستوں کے ''روشن خیال'' ملفوظات شدّ ومد سے ''حق'' پھیلاتے ہیں۔

نئے حقائق اور پرانی داستانیں

اگر ہم نظریۂ ثقافتی تقلیب کے تناظر میں نازی داستانوں کا دوبارہ جائزہ لیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ یہ محض اتفاق نہیں کہ وہ انڈویورپین مائتھالوجی یا آریائی حملوں کا ایک اعادہ تھیں کیونکہ نازی جرمنی ''کرگن'' زمانوں کی طرف واپسی کا وجود تھا نہ صرف داستانوں میں

بلکہ حقیقی طور پر تھا۔

بڑے پیمانے پر یہودیوں کے قتل عام میں نازی محض ان طریقوں کو دوہرا رہے تھے جن کے ذریعے کرگنوں نے دولت چھینی تھی، انہیں قتل بھی کیا اور جی بھر کر لوٹا، نازیوں نے یہودیوں کے گھربار، کاروبار، ان کے زیر قبضہ اشیاء اور حتیٰ کہ ان کے دانتوں میں پڑا ہوا سونا بھی نکال کر سرکاری صندوقوں میں ڈال لیا تا کہ اسے وفاداروں میں تقسیم کیا جا سکے۔

اسی طرح نازیوں کا عورتوں کو مرد کے زیر کنٹرول جائداد سمجھنے کا نظریہ کرگنوں کے طور طریقوں کا اعادہ تھا۔ نیٹشے کے الفاظ میں ''نئے آریائی جرمن سپرمینوں کے لئے عورتوں کو مردوں کے لئے خوشگوار پالتو مویشی بننا چاہیے'' تا کہ وہ انہیں جنسی تلذذ، ذاتی خدمت، تفریح اور نسل میں اضافے کے لئے استعمال کر سکیں۔ (۴۳) اس کے علاوہ بھی جیسا کہ ہٹلر اعزاز یافتہ سپاہیوں کو بطور انعام ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کا حق دینے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔ بنیادی طور پر نازیوں کے لئے عورتیں ویسی ہی چیزیں تھیں جیسے کرگن مردوں کے لئے وہ جنگجو کا مالِ غنیمت تھیں۔ (۴۴)

ہمہ مقتدر ''فہرر'' یا لیڈر کی حکمرانی کرگنوں کے مطلق العنان سربراہ کے راج کی مانند تھی۔ اسی طرح کی نازی ایلیٹ کورز، خوفناک SS اور S.A تھیں۔ کرگنوں کی جنگجو ذات کے لوگ ''مردانہ'' صفات کی زندہ مثال تھے، وہ مظہرِ عظمت وعزت اور قوت تھے جنہیں کہیں بھی تباہی وبربادی مچا دینے کے اختیارات حاصل تھے۔

نازی جرمنی، سخت گیر مردانہ غلبے، مطلق العنانی اور اعلیٰ درجے کے اداراتی تشدد کا مظہر تھا۔ یہ دراصل عورتوں کے اقتدار کے عروج (gylanic thrust) کا ردّعمل تھا اور یہ قدیم ترین اور ''پروٹو اینڈروکریسی'' کی وحشی ترین شکل کی اوّلین جدید ترقی یافتہ صورت بھی تھی جس نے ''نیو اینڈروکریٹک''، مستقبل کی راہ ہموار کر دی تھی۔

خواہ یہ رائیٹسٹ تھا یا لیفٹسٹ، عیسائی یا مسلمان کلیّت پسندانہ حل، اینڈروکریٹک حل کی تازہ صورت سے نہ زیادہ تھا نہ کم۔ اس کے بنیادی قضیے ''نسوانی'' یا پُرامن طریق کار کے لئے نفرت تھے۔ یہ ایک عزم کا نام تھا کہ احکامات کی تعمیل کی جائے گی خواہ وہ خدائی ہوں یا دنیاوی۔ یہ ایک قطعی نیکی اور ایک عقیدہ تھا جو (مرد اور عورت سے شروع ہوتا ہوا) انسانیت کو "in-groups" اور "out groups" میں تقسیم کرتا تھا جنہیں ہمیشہ برسرِ جنگ رہنا تھا۔

اس حل کو بہت سے لوگ اس وقت بھی قبول کرتے تھے اور اب بھی قبول کرتے ہیں مگر اس لئے نہیں کہ یہ ہماری دنیا کے بڑھتے ہوئے مسائل کا کوئی نموپذیر (viable) جواب فراہم کرتے ہیں بلکہ اس لئے قبول کرتے ہیں کہ اس کی کشش مورچہ بند ''اینڈروکریٹک'' اور ''نیواینڈروکرٹیک'' علامات اور داستانوں میں سے موصول ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ شبیہات اور داستانیں ہمارے غافل ذہنوں میں مسلسل یہ خوف پیدا کررہی ہیں کہ اینڈروکرٹیک قضیوں اور حلوں(solutions) سے انحراف کی سوچ پیدا ہوتے ہی ہم شدید عذاب کے مستحق بن جائیں گے۔ نہ صرف اس دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی سزا پائیں گے۔

جدید کلیت پسندی یا مطلق العنانیت کے عروج سے جو اہم سبق سیکھا جانا چاہیے وہ یہ ہے کہ داستان کی قوت کو کم اہمیت دینا ایک مہلک غلطی ہوتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ انسانی نفسیات کے اندر داستانوں اور علامات کے ایک نظام کے لئے ایک بنی بنائی جگہ موجود ہے۔ یہ داستانیں اور علامتیں ہم پر کائنات کے نظام کا ''انکشاف'' کرتی ہیں اور بتاتی ہیں کہ اس میں ہمارا کیا مقام ہے۔ یہ معنوں اور مقاصد کے لئے ایک بھوک ہے جو بظاہر کسی نظامِ منطق کے تابع نہیں کہ وہ ہمیں ان سے مطلع کرسکے۔

جدید تاریخ بتاتی ہے کہ اینڈروکرٹیک داستانوں کی رہنمائی میں جو خوف وہراس انسانیت کا مقدر بن چکا ہے اس پر قابو پانے کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ ہر اس چیز کو بہ جبر روک دیا جائے جسے ''مردانہ'' منشاومقصد کے لئے قابلِ قبول نہ بنایا جاسکتا ہو۔ ہمارے ذہنوں کے ان وجدانی، غیر معقول اور غیر ہموار افعال کو کچلنے کی کوشش نہیں کی جانی چاہیے جنھیں نیواینڈروکریٹک عقیدہ اکثر ''نسوانی'' قرار دیتا رہتا ہے۔ [۴۵] کیونکہ مسئلہ یہ نہیں ہے کہ علامات اور داستانیں گھٹیا چیزیں ہیں لہٰذا منطق یا معقولیت کے اعتبار سے کم پسندیدہ ہیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ وہ کس ''قسم'' کی علامات اور داستانیں ہوں جو ہمارے ذہنوں میں جگہ پائیں اور ہماری رہنمائی کریں۔

جس طرح کرگنوں کے پے درپے حملوں نے ہمارے قدیم ثقافتی ارتقا کو کاٹ کر رکھ دیا تھا، اسی طرح آج بھی مطلق العنانی اور کلیت پسندی ہمارے موجودہ ارتقائی سفر کے ہر موڑ پر رکاوٹ بنی ہوئی ہے جسے نئی اور پرانی اینڈروکرٹیک داستانوں سے مدد مل رہی ہے۔

پچھلی چند صدیوں میں تسلّط پر مبنی معاشرت سے شراکتی معاشرے کی طرف جزوی پیشرفت ہوئی ہے جس نے انسانیت کو جزوی طور پر آزادی عطا کردی ہے اور مساوات وانصاف پرور معاشرت کی طرف کچھ کچھ پیش قدمی ہوئی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ دائیں اور بائیں دونوں اطراف سے تندوتیز مخالفانہ تحریکیں بھی چلی ہیں جو متسلط معاشرے کو مزید سخت شکل دینے کے لئے کلیّت پسندی کی طرف لے جارہی ہیں۔

اینڈروکرٹیک سماجی اور نظریاتی تنظیم کا شدید جمودی دباؤ(inertial pull) بطور ایک حقیقت موجود ہے جسے جسم اور ذہن کو کنٹرول کرنے والی نئی ٹیکنالوجیز (جدید پروپیگنڈہ، منشیات، اعصاب شکن گیس وغیرہ) کی پوری مدد حاصل ہے۔ اس طرح ایک کلیّت پسندانہ مستقبل ایک حقیقی امکان کی حیثیت رکھتا ہے تاہم ایسا عالمی نظام غالباً زیادہ نہیں چل سکے گا۔

خواہ یہ لیڈر مذہبی ہوں یا سیکولر، جدید ہوں یا قدیم، مشرقی ہوں یا مغربی، ان کا بنیادی اشتراک مہلک خنجر کی قوت پران کا ایمان لانا ہے جسے وہ ہمارے لئے آلۂ نجات کے طور پر پیش کررہے ہیں۔ لہٰذا ایک متسلط مستقبل، جلد یا بہ دیر، تقریباً یقینی طور پر وہ عالمی ایٹمی جنگ کا مستقبل بھی ہے،......اور پھرانسانیت کے تمام مسائل اور آرزوؤں کا خاتمہ ہوجائے گا۔

MashalBooks.org

باب13

ارتقا میں پیشرفت: شراکت دارانہ مستقبل

سائنس فکشن رائیٹرز کے تصورِ مستقبل میں محیرّ العقول ایجاد کی بھرمار ہوتی ہے لیکن ان کی دنیا حیرت انگیز طور پرنئی سماجی ایجادات سے محروم ہوتی ہے لیکن درحقیقت وہ جو کچھ تصور کرتے ہیں وہ ہمیں پیچھے کی طرف لے جاتا ہے جبکہ وہ خود وقت سے آگے جارہے ہوتے ہیں۔ خواہ فرینک ہربرٹ کی "Dune" [۱] ہو یا جارج لُوقا کی "Star Wars" ہو، دونوں میں ہمیں جو کچھ ملتا ہے وہ دراصل فیوڈل شہنشاہوں اور عہدِ متوسط کے جاگیرداروں کی سماجی تنظیم ہے جسے سماوی کہکشاؤں میں لڑی جانے والی ہائی ٹیک جنگوں میں منتقل کردیا گیا ہوتا ہے۔

پانچ ہزار برس سے متسلّط معاشرے (dominator society) میں زندگی گزارنے کے بعد ایک مختلف دنیا کا تصور کرنا بہت مشکل کام ہوتا ہے۔ شارلٹ پرکنز گلمین نے "Herland" [۲] میں اس کا تصور باندھنے کی کوشش کی تھی۔ یہ کتاب ۱۹۱۵ میں لکھی گئی تھی۔ یہ ایک طربیہ ''جنت ارضی'' (Utopia) قسم کی کتاب ہے اس میں ایک اعلیٰ تخلیقی معاشرے کا نقشہ کھینچا گیا ہے جس میں واحد ثمر آور مصروفیت اور اوّلین ترجیح کا کام بچوں کی جسمانی، ذہنی اور روحانی نشوونما میں لگے رہنا تھا۔ اچھی بات یہ تھی کہ یہ ایک ایسی دنیا تھی کہ جہاں کے سب لوگوں نے خود کو جنگ اور اس کی تباہ کاریوں کے مشغلے میں پڑ کر اپنا صفایا کر دیا تھا اور بچ جانے والی چند عورتوں نے ایک حیرت انگیز عملِ تغیر سے اپنے آپ میں سے دوبارہ جنم لینا سیکھ کر

MashalBooks.org

اپنی نصف انسانیت کو بچالیا تھا۔

لیکن جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے، مردوں کا اصل مسئلہ بطور جنس زندہ رہنا نہیں بلکہ یہ ہے کہ انہیں ایک متسلّط نظام میں بطور مرد اور عورت لازماً رہنا پڑتا ہے۔ جدید حجری دور میں اور کریٹ میں مرد اور عورتیں ہوتی تھیں۔ پُرامن Kung اور BaMbuti میں مرد اور عورتیں پائی جاتی ہیں اور حتیٰ کہ ہمارے مردانہ تسلّط کی دنیا میں تمام کی تمام عورتیں پُرامن اور شریف نہیں اور بہت سے مرد پُرامن اور شریف ہیں۔

یہ بالکل واضح بات ہے مرد اور عورتیں اپنی حیاتیاتی قوت کے باعث بہت سے مختلف رویے اختیار کرنے کی صلاحیت رکھتی ہیں لیکن جس طرح کیڑوں اور دیگر حشرات کو ان کی بیرونی زرہ بکتر یا خول تحفظ دیتے ہیں اسی طرح اینڈروکریٹک سماجی تنظیمیں انسانیت کے دونوں نصفوں کو بے لچک اور درجہ وار کردار کے غلاف (encasements) تحفظ دیتے ہیں۔ لیکن اس غلاف کی لپیٹ میں رہنے کیوجہ سے ان کی ترقی رک جاتی ہے۔ اگر ہم اپنے ارتقا کو اینڈروکریسی اور گائیلینی تناظر میں انسانی تنظیم کے دوامکانات کے طور پر دیکھیں تو ہمیں معلوم ہوجائے گا کہ یہ محض اتفاق نہیں ہے کہ سماجیات اور حیاتیات کے ماہرین جو اینڈروکریٹک نظریئے کو انیسویں صدی کے ایک اور سوشل ڈارون ازم کے ساتھ ملا کر پڑھتے ہیں وہ اپنے نظریات کی تقویت کے لئے اکثر کیڑوں مکوڑوں کی سوسائیٹیوں کا حوالہ دیتے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی محض اتفاق نہیں کہ ان کی تحریریں اس نظریئے کو تقویت دیتی ہیں کہ سخت گیر نظامِ مراتب کی سماجی درجہ بندی کے ماڈل پہلے ہی ہمارے "genes" (نسلی توریث کی اکائی) کے اندر رکھ دیئے گئے تھے۔ یعنی ہم فطری طور پر ''مرد کے غلبے اور عورت کی مغلوبیت'' کے جکڑ بند نظام میں ڈھلے ہوئے ہیں۔ (۳)

جیسا کہ بہت سے سائنسدانوں کا خیال ہے کہ ارتقا پہلے سے مقدر شدہ (predetermined) نہیں (۴) ہے۔ اس کے برعکس اپنی ابتدا ہی سے اپنے ارتقا کے ''شریک پیدا کار'' (co-creators) چلے آرہے ہیں۔ مثال کے طور پر ''شیر ووڈ واشن برن'' نے لکھا ہے کہ ہمارا اوزار ایجاد کرنا ہمارے دوٹانگوں پر چلنے اور ہاتھوں کے آزاد ہونے کا نتیجہ بھی ہے اور اس کا سبب بھی ہے۔ (۵) (اگر ہم کھڑے ہو کر نہ چل سکتے اور ہمارے ہاتھ کام کرنے کے لئے آزادانہ ہوتے تو ہم زیادہ پیچیدہ ٹیکنالوجیز وضع کرنے کے اہل نہ ہوتے)۔ اور

چونکہ ہماری انواع اور معاشرہ زیادہ پیچیدہ ہوگئے ہیں ہماری انواع کی بقا کا سمت (direction) پر انحصار بہت بڑھ گیا ہے۔ اس پر ہمارے ''حیاتیاتی ارتقا'' کا نہیں بلکہ ہمارے ''ثقافتی ارتقا'' کا انحصار بڑھا ہے۔

انسانی ارتقا اب ایک چوراہے پر پہنچ چکا ہے۔ معاشرتی زوائد کو ہٹا کر اس کے بنیادی لوازم کو دیکھا جائے تو انسان کا مرکزی کام یہ ہے کہ وہ یہ دیکھے کہ معاشرے کو کیسے منظّم کیا جائے کہ اس سے ہماری انواع کی بقا اور ہماری بے مثل صلاحیتوں کو زیادہ سے زیادہ فروغ مل سکتا ہو۔ اس کتاب کے مطالعے کے دوران ہم نے دیکھا ہے کہ اینڈروکریسی اس تقاضے کو پورا نہیں کرسکتی کیونکہ یہ بات اس کی سرشت میں شامل ہے کہ یہ تباہی مچانے والی ٹیکنالوجیز کو زیادہ اہمیت دیتی ہے۔ سماجی کنٹرول کے لئے تشدد پر انحصار کرتی ہے اور اس دباؤ اور فشار کو بھی بہت اہمیت دیتی ہے جو ''غالب ومغلوب انسانی تعلقات'' ماڈل پر مبنی ہے۔ ہم نے یہ بھی دیکھا ہے کہ شراکتی معاشرہ جس کی خصوصیت زندگی عطا کرنا اور جام (chalice) کو فروغ دینا، نہ کہ مہلک خنجر (blade) کو آگے بڑھانا ہے ہمیں ایک قابل عمل متبادل کی پیشکش کرتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ ہم یہاں سے وہاں کیسے پہنچیں گے؟

حقیقت کا ایک نیا منظر

الیا پریگوگین اور نائیلز ایلڈرج جیسی سائنسدان ہمیں بتاتی ہیں کہ کیمیائی اور حیاتیاتی نظاموں میں دو یا زیادہ ارتقائی شاخوں کا ظہور بڑی حد تک محض اتفاقی ہوتا ہے۔ (۶) لیکن جیسا کہ اروین لزلو بتاتا ہے کہ انسانی سماجی نظاموں کے بھی دو حصوں میں تقسیم ہونے میں کافی حد تک انتخاب کا عنصر کارفرما ہوتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ انسانوں میں شعوری اور اجتماعی طور پر کام کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے۔ وہ اپنے ارتقائی راستے کے انتخاب میں اپنی بصیرت استعمال کرتے ہیں۔ اور اپنے ''فیصلہ کن عہد'' میں ہم انسانی معاشرے اور ثقافت کے ارتقا کے اگلے قدم کا انتخاب اتفاق پر نہیں چھوڑ سکتے، اس کے لئے ہمیں شعوری اور مقصدی طور پر منصوبہ بندی کرنی چاہیے۔ (۷) یا جیسا کہ ماہر حیاتیات جونس سالک لکھتا ہے کہ ہماری اہم ترین ضرورت یہ ہے کہ ہم اپنے حیرت انگیز صلاحیتوں والے انسانی ذہن کو شبیہہ سازی کے لئے ضروری وسائل مہیا کریں تا کہ ہم بہتر دنیا پیدا کرسکیں۔ (۸)

شروع میں یہ ایک مشکل اور ناممکن کام دکھائی دے سکتا ہے لیکن جیسا کہ ہم پاتے ہیں ہمارے تصوراتِ حقیقت، تاریخ کی پیداوار ہوتے ہیں۔ اور غالباً ہمارے تصورات، علامات اور رویّوں میں تبدیلیوں کی صلاحیت کی شہادت یہ ہے کہ ایسی تبدیلیاں درحقیقت ہمارے زمانہ قبل از تاریخ میں برپا ہوئی تھیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ قدیم دور کے بیشتر حصے میں عورت کتنے بلند مقام و مرتبے پر فائز تھی اور اس کا کتنا احترام کیاجاتا تھا اور اینڈروکریٹک فتوحات کے بعد اس کی شبیہہ کس طرح محض ایک ذریعۂ جنسی بن کر رہ گئی جسے مکمل طور پر مرد کی ملکیت میں دے دیا گیا۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ ہمارے ثقافتی ارتقا کی نازک دوشاخہ تقسیم کے بعد شجرِ علم اور بار بار کینچلی اتارنے والی سپنی جیسی علامات کے معنی کس طرح الٹا دیئے گئے۔ اب مردوں کے غلبے اور مطلق العنان حکمرانوں کو چیلنج کرنے کی خوفناک سزاؤں کی علامات کچھ عرصہ پہلے کے ارتقائی زمانے میں انسان کی آزادی اور اعلیٰ صوفیانہ علم کی پیاس کے مظاہر بن گئیں۔

ہم دیکھ چکے ہیں کہ اینڈروکریٹک حکمرانی کے تسلط کے بعد بھی ہماری اہم ترین علامات کے معنی نسوانی (gylanic) اقدار کے ابھرتے ہوئے رجحان یا مردانہ رجعت کے باعث انقلابی انداز میں بدل چکے ہیں۔ اس کی نمایاں مثال صلیب (cross) ہے۔ صلیبوں کا اصل مفہوم جو زمانہ قبل از تاریخ کی دیوی کی مورتیوں یا دیگر مذہبی اشیا پر منقش ہے اس کی جنم دینے کی صلاحیت اور پودوں، جانوروں اور انسانوں کی زندگی کی افزائش کی شناخت کو ظاہر کرتا ہے، یہ وہ مفہوم ہے جس نے مصری خطِ تصویر میں جگہ پائی، اس میں صلیب زندگی کو ظاہر کرتی ہے اور ''صحت'' اور ''مسرّت'' جیسے لفظوں کا حصہ ہے۔ (۹) بعد کے ادوار میں یہ لوگوں کو میخوں میں پروکر دردناک موت کی گھاٹ اتارنے والی چیز بن گئی (جیسے شامی رومی اور دیگر اینڈروکریٹک آرٹ میں یہ موت کی علامت ہے)، مزید بعد میں یسوع کے گائیلینک پیروکاروں نے اس صلیب کو جس پر یسوع کو چڑھایا گیا تھا نئے جنم کی علامت میں بدلنے کی کوشش کی۔ یہ علامت اس سماجی تحریک سے متلازم ہوگئی جس نے انسانی مساوات اور ایسے نسوانی تصورات کی تبلیغ شروع کی جو شرافت، رحم اور امن کا مفہوم رکھتے تھے۔ (۱۰)

صدیوں بعد جب ہمارا زمانہ آیا تو یہ تحریک اینڈروکریٹک نظام (مردانہ تسلّط کے

نظام) کے ساتھ صلح کر چکی تھی۔ ہم جس طرح قدیم علامتوں اور داستانوں کی تعبیر کرتے ہیں وہ اب بھی ہمارے حال و مستقبل کی شکل وصورت میں اہم کردار ادا کرتی ہے۔ ایسے وقت میں جب مذہبی اور سیاسی لیڈر ہمیں یقین دلاتے رہتے ہیں کہ قیامت سے پہلے ہونے والا آخری ایٹمی معرکہ شاید منشائے ایزدی ہوگا (۱۱) (امریکی صدر ارنلڈ ریگن نے کم ازکم گیارہ مواقع پر کہا تھا کہ دنیا کا آخری وقت آپہنچا ہے۔ یہ اس ٹھنڈے مزاج کے شخص کا جملہ تھا جو اس ''آخری وقت'' کو لانے پر قادر تھا) ہم ایک فقید المثال تحریک دیکھ رہے ہیں جو ان قدیم داستانوں اور علامتوں کا احیا چاہتی ہے جن میں گائیلینک معنی پائے جاتے ہیں، ان علامات کے مطابق لوگوں میں زندہ رہنے کی خواہش مرنے سے کہیں زیادہ پائی جاتی ہے۔ (۱۲)

مثال کے طور پر ریکارڈ شدہ تاریخ میں ایموجین کننگھم اور جوڈی شکاگو جیسی آرٹسٹوں نے پہلی بار عورت کے جنسی استعارے کو ایسے طریقوں سے استعمال کیا جو حیرت انگیز طور پر حجری، جدید حجری اور کریٹن ادوار میں پیدائش، ظہور ثانی اور تقلیب کی علامتیت کی یاد دلاتے ہیں۔ (۱۳) اسی انداز میں تاریخ میں پہلی بار دریائی گھوڑے، پرندوں، ڈانفنز اور سبز جنگلات جیسی اشیائے فطرت کی شبیہات کو ماحولیاتی تحریک عوام میں ماحول کے ساتھ ہمارے تعلق کا شعور بیدار کرنے کے لئے استعمال کررہی ہے۔ (۱۴)

داستانوں کے تانے بانے کو ادھیڑنا اور اسے نسبتاً زیادہ گائیلنک نقوش کے مطابق دوبارہ بُننا ایک عام غیر شعوری عمل ہے جو پہلے سے جاری ہے (۱۵) (اس میں مردانہ فتوحاتِ فطرت کو آئیڈیل بنا کر پیش کرنا، اب مطلوب نہیں رہا)، دراصل جس چیز کی کمی ہے وہ نئی شبیہات اور داستانیں مرتب کرنے کے لئے مطلوبہ مواد کی کمی ہے مختلف جگہوں سے اکٹھا کرنے اور نئی حقیقت میں بدلنے کے لئے کافی انسانوں کی ضرورت ہے۔

شاید سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ عورتیں اور مرد زیادہ تر اینڈروکریٹک معاشرے سے متعلق اس اساسی مفروضے کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ مرد کا غلبہ اور مردانہ تشددِ جنگ، دونوں ناگزیر ہیں۔ اس مفروضے پر جتنے تحقیقی مطالعات ماہرین بشریات نے کئے ہیں ان میں مختلف ثقافتوں پر کی گئی ''شرلے اور جان میکونا ہے'' (Shirley and John Mcconghay) کی تحقیق بہت اہم ہے جس میں انہوں نے مردوں کے جابرانہ طور طریقوں کا جنگجو یانہ طرز عمل کے ساتھ تعلق جوڑا ہے اور بیویوں کو زدوکوب کرنے، بچوں پر تشدد

کرنے اور زنا بالجبر کو بھی نظام تسلط کا خاصہ قرار دیا ہے۔ جس کا مفصل ذکر ہم اپنی دوسری کتاب میں کریں گے وہ بھی ہماری ایسی ہی رپورٹوں پر مشتمل ہوگی۔

نظام تسلّط اور بیویوں پر مظالم، جنسی تشدد اور جنگ وجدل(warfare) کے باہمی تعلق کی تصدیق اور بھی کئی سائنسدانوں کی تحقیق سے ہوئی ہے کیونکہ انہوں نے ''حقیقت'' کے مروّجہ نمونوں کے بارے میں سوال اٹھانا شروع کردیئے ہیں۔ (۱۷) مزید برآں انسانیت کے دونوں نصفوں کی تحقیق ومطالعہ سے سائنسدان انسانی معاشرے کی امکان پذیری کے بارے میں ہماری معلومات میں گونا گوں اضافے کررہے ہیں اور انسانی شعور کے ارتقا کے بھی نئے نئے پہلوؤں کی نشاندہی کررہے ہیں۔ (۱۸)

درحقیقت نظریۂ ثقافتی تقلیب کی رُو سے جدید ''شعور کے اندر انقلاب''(revolution in consciousness) پر جو کچھ لکھا جاچکا ہے یا لکھا جارہا ہے اسے اینڈروکریٹک سے گائیلینک شعور کی طرف منقلب ہونے کے عمل سے تعبیر کیا جاسکتا ہے (۱۹) اس تقلیب کا ایک اہم اشاریہ یا علامت یہ ہے کہ ریکارڈ شدہ تاریخ میں پہلی بار بہت سی عورتیں اور مرد ''ہیرو بطور قاتل'' جیسی داستانوں کو سامنے آکر چیلنج کررہے ہیں۔ (۲۰) ان میں اس بات کا شعور بڑھ رہا ہے کہ ''تھیسیس''(Theseus) سے لے کر ''ریمبو''(Rambo) اور جیمز بانڈ (James Bond) تک جتنی بھی تباہ کن ''حکایاتِ شجاعت'' ہیں وہ ہمیں ایک ہی بات پڑھاتی ہیں اور اسی کا مطالبہ کرتی ہیں کہ ہم دونوں صنفوں کے بچوں کو فتوحات اور غلبہ حاصل کرنے کی بجائے دوسروں کے جذبات، دیکھ بھال اور شراکت کی اقدار کا احترام کرنا سکھائیں (۲۱) سویڈن میں ایسے قوانین بنائے جاچکے ہیں جن کے تحت جنگی کھلونوں کی تیاری کو مرحلہ وار طریقے سے کم کرکے بالآخر ختم کردیا جائے کیونکہ یہ کھلونے بچوں کو ان لوگوں سے نفرت سکھاتے تھے جنہیں وہ دکھ دیتے تھے۔ انہیں ایسے طرزِ عمل کی تربیت بھی دیتے تھے کہ وہ اپنی نوع کے دیگر انسانوں کو قتل کرنے پر بہ آسانی تیار ہوسکیں۔ (۲۲) دنیا بھر میں آئے دن لاکھوں لوگوں کے امن مظاہرے بھی اس امر کی ڈرامائی شہادت دیتے ہیں کہ ہمارے اندر ساری انسانیت کے ساتھ ہمدردی کرنے اور ان سے مربوط رہنے کا ازسرِنو شعور پیدا ہورہا ہے۔

دنیا بھر کی عورتیں اور مرد پہلی بار اتنی زیادہ تعداد میں ''ظالم مرد مظلوم عورت'' قسم کے

انسانی تعلقات کو سامنے آ کر چیلنج کر رہے ہیں (۲۳) ساتھ ہی ''اصناف کی جنگ'' کو بے نقاب کر کے اس کو اسی قسم (ماڈل) کے تعلقات کا شاخسانہ قرار دیا جا رہا ہے، اور کہا جا رہا ہے اصناف کی جنگ تسلط پر مبنی معاشرے کے قیام کی بنیاد بنتی ہے۔ اس کے نتیجے میں جنم لینے والی ذہنیت ہر ''غیر''(the other) کو دشمن سمجھتی ہے۔ اسے بھی برملا چیلنج کیا جا رہا ہے۔ (۲۴) یہ شعور بھی بڑھتا جا رہا ہے کہ عالمی پارٹنر شپ عورتوں اور مردوں کے کرداروں (roles) پر نئے سرے سے غور و فکر اور ان کی تقلیب کے ساتھ گہرے طور پر مربوط ہے۔ (۲۵)

جیسا کہ سائیکاٹرسٹ جین بیکر ملر لکھتی ہے کہ معاشرے کی جیسی تشکیل موجودہ زمانے میں پائی جاتی ہے اس میں صرف عورتیں انسانی تعلقات کو فروغ دینے کی بنیاد فراہم کرتی ہیں، اور ''میل جول کو اپنی ذات سے بھی بڑھ کر اہمیت دیتی ہیں''۔ (۲۶) اس کے برعکس مرد عموماً ذاتی مقاصد کی وجہ سے دوسروں سے ملتے جلتے ہیں، حتیٰ کہ اپنے مقاصد کی خاطر دوسروں کو نقصان پہنچانے سے بھی دریغ نہیں کرتے۔ عورتیں مزاجاً اپنے آپ کو دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا ذمہ دار بنا لیتی ہیں، حتیٰ کہ اس کے لئے اپنی خیر و عافیت کو بھی داؤ پر لگا لیتی ہیں۔ (۲۷)

جین بیکر ملر شواہد کے حوالے سے مزید لکھتی ہے کہ انسان کے رویّوں کی یہی دو حصوں میں تقسیم عورت اور مرد، دونوں میں نفسیاتی بگاڑ پیدا کرتی ہے۔ عورتیں اپنے اندر یہ رجحان رکھتی ہیں کہ خود کو دوسروں سے زائد از ضرورت مماثل سمجھنے لگتی ہیں۔ اور اس حد تک آگے چلی جاتی ہیں کہ خطرے یا نقصان سے دوچار ہو جاتی ہیں بلکہ اپنی ذات کو مکمل طور پر قربان کر ڈالتی ہیں۔ دوسری جانب مرد عموماً انسانی ضرورت کے تحت بھی دوسروں کے ساتھ میل جول کی ضرورت کو نقصان کا سودا یا خطرہ سمجھتے ہیں۔ اس طرح وہ دوسروں سے بھلائی کرنے کو ثانوی قسم کی چیز گردانتے ہیں۔ ایسے بھلائی کے کاموں میں اس وقت حصہ لیتے ہیں جب وہ ''اپنی مردانگی کی ضرورتیں یا خواہشیں پہلے پوری کر چکے ہوں''۔ (۲۸)

صنفی کرداروں اور حقیقت حال کے یہ تصورات، جیسا کہ ہم پہلے دیکھ چکے ہیں، اینڈروکریٹک معاشرے کی بنیادی خصوصیت ہیں لیکن جیسے ملر لکھتی ہے ''اس امر کا اعتراف انتہائی اہم ہے کہ دوسروں کے ساتھ میل جول بڑھانے کی رغبت جسے وہ اپنے اندر شدت سے محسوس کرتی ہیں، غلط نہیں ہے اور نہ ہی باعثِ شرم ہے..... اور جس چیز کا اعتراف نہیں

کیا گیا وہ یہ ہے کہ یہ نفسیاتی نقطۂ آغاز اپنے اندر زندگی گزارنے اور فرائض منصبی ادا کرنے کے بالکل مختلف انداز ہیں۔ یہ مختلف اور غالب ثقافت کی عکاسی کرتے ہیں یہ انداز اس سچائی کو سامنے آنے کا موقع دیتے ہیں کہ ہر فرد کی شخصیت کے ارتقا کا آغاز صرف اور صرف معاشرتی میل جول کے ذرائع یا طریقوں سے ہوتا ہے''(۲۹)

مرد اور عورت کے حقائق کو جاننے کے یہ دو نئے طریقے انسانی سائیکی کے دو نئے ماڈلوں کو جنم دے رہے ہیں۔ فرائڈ کا نسبتاً پرانا ماڈل انسانوں کو ان کے بنیادی محرکات غذا، جنس اور تحفظ جیسی ضرورتوں کی روشنی میں دیکھتا ہے، اور کسی قدر نیا ماڈل جو ابراہام ماسلو اور دیگر ماہرین نفسیات نے تجویز کیا ہے ان بنیادی ضروریاتِ ''تحفظ'' کو اہمیت دیتا ہے بلکہ یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ انسانوں کے اندر ''فروغ'' پانے یا ''تشکیل'' پانے کی ضرورتیں بھی موجود ہوتی ہیں، جو ہمیں دیگر جانداروں سے ممیّز کرتی ہیں۔ (۳۰)

''تحفظ'' کی ضرورتوں سے ''فروغ'' پانے کی ان ضرورتوں کی طرف منتقلی تسلط معاشرے سے ایک شراکتی معاشرے میں منتقلی کے لئے ایک اہم کلید ہے۔ قوت یا قوت کے استعمال کے خوف نے جو نظامِ مراتب قائم کر رکھا ہے اس کے برقرار رہنے کے لئے ذہن کی تحفظاتی یا دفاعی عادتوں کی ضرورت ہوتی ہے۔ ہماری قسم کے معاشرے میں مرد کے اپنا دشمن خود تخلیق کرنے کا آغاز اس کے انسانی ہمزاد یعنی عورت سے ہوتا ہے جسے مروّجہ داستان میں ہمارے جنت سے نکالے جانے کے سبب کے طور پر جانا جاتا ہے۔ اور ایک نصفِ انسانیت کا دوسرے نصفِ انسانیت کے مقابلے میں رتبہ بقول الفریڈ ایڈلر کے، تمام انسانی رشتوں میں زہر گھولتا رہتا ہے۔ (۳۱)

فرائڈ کے مشاہدات اس امر کی تائید کرتے ہیں کہ اینڈروکریٹک سائیکی درحقیقت داخلی چپقلشوں، کشیدگیوں اور خدشات کا مجموعہ ہوتی ہے۔ (۳۲) لیکن جوں جوں ہم اینڈروکریسی سے گائیلینی کی طرف بڑھتے ہیں تو ہمارے وجود کا زیادہ سے زیادہ حصہ ''دفاع'' یا ''تحفظ'' سے ''فروغ'' کی طرف سفر کرسکتا ہے اور جیسا کہ ابراہام ماسلو نے ''فروغِ ذات'' اور تخلیقی انسانوں کے مشاہدے کے حوالے سے کہا ہے جوں جوں ایسا ہوتا ہے ہم خود غرضی اور اپنی ذات کو مرکز بنانے کی بجائے زیادہ سے زیادہ ایک نئی حقیقت کی طرف بڑھیں گے جسے اس نے جملہ انسانیت کے ساتھ ضروری ارتباط کا ''اعلیٰ ترین تجربہ'' قرار دیا ہے۔ (۳۳)

ایک نئی سائنس اور روحانیت

باہمی ارتباط کا یہ نظریہ جسے جین بیکر ملر ''عملِ الحاق'' (affiliation) کہتی ہے اور جیسی برنارڈ ''نسوانی خصلتِ محبت وفرض شناسی'' قرار دیتی ہے، یسوع، گاندھی اور دیگر روحانی لیڈروں نے اس محض ''محبت'' کہا ہے، آج وہ ایک سائنسی موضوع بھی ہے۔ یہ نئی ترقی پذیر سائنس تاریخ میں پہلی بار نظام ''مراتب'' کی بجائے ''روابط'' پر توجہ مرکوز کر رہی ہے۔ جیسا کہ ماہر فزکس فرٹجوف کوپرا لکھتا ہے، یہ نسبتاً زیادہ کلیت پسندانہ نقطۂ نظر مغربی سائنس سے کافی آگے ایک انقلابی روانگی ہے جو نظامِ مراتب میں الگ الگ حصوں میں بٹی ہوئی اور اکثر میکانی سوچ ہوا کرتی تھی۔ (۳۴) یہ بہت سے پہلوؤں سے نسبتاً زیادہ نسوانی سوچ ہے، جیسا کہ عورتوں کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ زیادہ وجدانی طریقے سے سوچتی ہیں اور قدم بہ قدم ''منطقی'' سوچ کی بجائے بیک وقت وقوع پذیر تاثرات کی کلیت سے نتائج اخذ کرتی ہیں۔ (۳۵)

جونس سالک ایک نئی ''ہم احساسی'' سائنس (یعنی وہ سائنس جو دلیل اور وجدان، دونوں سے کام لے گی) کے بارے میں لکھتا ہے کہ یہ سائنسی طریق فکر انسانی مستقبل پر تعمیری اثرات مرتب کرے گا۔ (۳۶) (اس کو ''جینیٹکس'' کی ماہر باربرا میکلنٹک نے، جس نے ۱۹۸۳ء میں نوبیل پرائز جیتا تھا، بڑی کامیابی سے استعمال کیا) اور انسانی معاشرے پر ایک زندہ نظام کے طور پر فوکس ہوگا، جس کا ہم خود بھی ایک حصہ ہیں۔ (۳۷) جیسا کہ ایشلے مانٹیگو نے کہا یہ سائنس تعلیم کے حقیقی معنی صداقت پر منطبق ہوگی اور بنی نوع انسان کی داخلی توانائیوں کو آگے بڑھانے میں مدد دے گی۔ (۳۸) سب سے بڑھ کر یہ کہ جیسا کہ ہیلری روز اپنی کتاب "Hand, Brain, and Heart:A Feminist Epistemology for the Natural Sciences" میں لکھتی ہے کہ یہ وہ سائنس نہیں ہوگی جو فطرت کی تسخیر پر مرتکز رہے گی یا انسانیت کو فطرت کا جزو مان کر غور وفکر کرے گی۔ (۳۹)

ایولین فاکس کیلر، کیرول کرائسٹ، ریٹاارڈیٹی اور دیگر سکالرز نے مثالیں دیتے ہوئے کہا ہے کہ سائنس نے ''معروضیت'' اور ''شعبہ جاتی خودمختاری'' کے حفاظتی غلاف تلے ''غیرسائنسی'' اور ''جانبدارانہ'' رویہ اختیار کر کے شفقت وہمدردی کے جذبات کی نسوانی

خصوصیت کو اکثر نظرانداز کیئے رکھا ہے۔ (۴۰) اس طرح سائنس نے اب تک عورتوں کو بطور سائنسدان عموماً اپنے دائرے سے خارج کر کے اپنی توجہ اکثر مردوں پر مرکوز کیئے رکھی۔ اس نے ''شفقت وموانست'' کو بطور علم پس پشت ڈالا جیسا کہ جونس سالک لکھتا ہے کہ یہ وہ علم ہے جس کی ہمیں اب ان انسانی شکلوں کے انتخاب کے لئے ضرورت ہے جو کہ ''معاونِ ارتقا ہیں، نہ کہ ان کی ضرورت ہے جو دشمنِ بقایا، دشمن ارتقا ہیں'' (۴۱)

یہ نئی سائنس اس لحاظ سے بھی ایک اہم قدم ہے کہ یہ سائنس اور روحانیت کے درمیان جدید خلیج کو پاٹ دے گی۔ یہ زیادہ تر اس عالمی نظریئے کی پیداوار ہے جو عورتوں اور ''مخنثوں'' کے ساتھ ہمدردی کو گھٹیا کام قرار دیتا ہے۔ سائنسدان اس امر کو بھی تسلیم کرنے لگے ہیں کہ جس طریقے سے ہم کشمکش یا تصادم کو دیکھتے ہیں، اس پر نظرثانی ہونی چاہیے (جیسے ہم روح اور فطرت کے مابین، عورت اور مرد کے درمیان، مختلف نسلوں، مذاہب اور نسلی گروہوں کے مابین تصادم پاتے ہیں یہ سب تسلّط پسند ذہنیت کی پیداوار ہیں)

جیسے کہ ملر اپنی تحقیق کو دفاع (تحفظ) پر مرتکز کرتے ہوئے لکھتی ہے، سوال یہ نہیں ہے کہ تصادم (کشمکش) کو کیسے ختم کیا جائے، جو کہ ناممکن ہے چونکہ مختلف ضروریات اور خواہشات اور مفادات آمنے سامنے آتے ہیں تو چپقلش ناگزیر ہو جاتی ہے۔ سوال کا تعلق اس امر سے ہے کہ کیا ہم اپنی دنیا کو کشمکش سے پُرامن بقائے باہمی کی طرف اس طریقے سے لاسکتے ہیں کہ یہ کشمکش تباہ کن ہونے کی بجائے ثمر آور ہوجائے۔ (۴۲)

ملر جس چیز کو ثمر آور یا پیداواری کشمکش کہتی ہے اس سے اس کی مراد یہ ہے کہ افراد، تنظیمیں اور قومیں کس طرح فروغ پاسکتی ہیں اور اپنے اندر کیسے تبدیلیاں لاسکتی ہیں۔ وہ کہتی ہے کہ ہر پارٹی مختلف مفادات اور مقاصد رکھنے والی دوسری پارٹی سے اس طرح معاملہ کرے کہ وہ اپنے مفادات ومقاصد پر نظرثانی کرنے پر مجبور ہوجائے اور یہ خود بھی اپنے مفادات پر نظرثانی کرے۔ اس کا دونوں کے لئے نتیجہ ثمر آور تبدیلی کی صورت میں نکلے گا نہ کہ غیر ثمر آور سختی پر منتج ہوگا۔ اس کے برعکس تباہ کن کشمکش یہ ہوگی، کہ اس موقف پر بذریعہ تشدّد قائم رہا جائے جو کہ جبر پر مبنی نظامِ مراتب کا خاصہ ہوتا ہے۔

ملر کہتی ہے کہ مروّجہ نظام کے تحت ''تصادم کو ایسے ظاہر کیا جاتا ہے جیسے کہ انتہائی مشکل صورتحال سامنے آگئی ہو جبکہ فی الحقیقت یہ تصادم کی ضرورت کے صحیح اعتراف کی کمی ہے اور

اس کے لئے موزوں شکلوں کی فراہمی خطرے سے دوچار کردیتی ہے۔ یہ آخری تباہ کن شکل خوفناک ہے لیکن یہ بھی تصادم 'نہیں' ہے۔ یہ تقریباً الٹی صورت حال ہے۔ یہ تصادم سے بچنے اور اسے دبانے کی کوشش کا انجام کار ہے۔'' (۴۳)

اگرچہ تصادم سے دھاک بٹھا کر نمٹنے کا طریق کار اب بھی ایک بہت عام روّیہ ہے، اس سے کم درجے کا متشددانہ اور نسبتاً زیادہ ''نسوانی'' یا ''مفعولی'' طریق کار تبدیلی لانے کی ٹھوس شکل پیش کرتا ہے ایسے اسالیب یا طریق ہائے کار زمانۂ قدیم میں اختیار کئے جاتے رہے ہیں۔ ریکارڈ شدہ تاریخ میں سقراط اور بعدازاں یسوع، دونوں نے یہ طریقے اختیار کئے۔ نئے زمانے میں یہ معروف طریقے تھے جنہیں گاندھی اور مارٹن لوتھر کنگ جونیئر نے آزمایا۔ گوکہ اینڈروکریسی نے انہیں قتل کرکے اور قانون کے ذریعے ان سے نمٹا۔ لیکن ان طریقوں کو عورتوں نے وسیع پیمانے پر استعمال کیا۔ ایک نمایاں مثال انیسویں اور بیسویں صدیوں میں غیر منصفانہ قوانین کے خلاف عورتوں کی غیر متشددانہ جنگ کی صورت میں پیش آئی ہے۔ انہوں نے فیملی پلاننگ کی انفارمیشن تک رسائی، برتھ کنٹرول ٹیکنالوجیز اور ووٹ دینے کے حق کے لئے جدوجہد کرتے ہوئے طاقت استعمال کرنے کی بجائے گرفتاریاں پیش کیں اور بھوک ہڑتالوں کے طریقے استعمال کئے۔ (۴۴)

غیر متشددانہ ٹکراؤ کو ذریعہ بنا کر سماجی تبدیلی لانا محض انفعالی یا پُرامن مزاحمت نہیں ہے۔ تشدد اور ناانصافی کے ساتھ تعاون سے انکار کے ذریعے متشددانہ اور مخالفانہ ذرائع اختیار کرنا ایک مثبت انقلابی قوت ہے جسے کہ گاندھی نے ستیہ گرہ یا ''سچائی کی قوت'' کا نام دیا تھا جیسا کہ گاندھی نے کہا کہ اس کا مقصد تصادم کو دبانے یا اس میں سے تشدد برآمد کرنے کی بجائے، تصادم کا راستہ بدل دیا جانا چاہیے۔ (۴۵)

جس طرح ثقافتی ارتقا کے لئے نیا راستہ وضع کرنا ایک نازک مسئلہ ہے اسی طرح اقتدار کی نئی تعریف پر غور کرنا بھی ایک اہم مسئلہ ہے۔ ملر نے اب تک مروّج نظریۂ اقتدار پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا ہے کہ عرفِ عام میں جسے دوسروں کو زیر کنٹرول لانے اور مغلوب کرنے کی ضرورت محسوس کرنا احساسِ اقتدار کا مظہر ''نہیں'' بلکہ احساسِ ناتوانی (feeling of powerlessness) کا مظہر ہے۔ اس نے ''اپنے لئے اقتدار اور دوسروں پر اقتدار'' میں فرق واضح کرتے ہوئے لکھا کہ ''دوسرے شخص یا گروہِ اشخاص کا اقتدار عموماً ایک

خطرناک کام سمجھا جاتا ہے۔ تمہیں ان پر کنٹرول کرنا ہے ورنہ وہ تم پر کنٹرول کرلیں گے۔ لیکن انسان کی ترقی کی قلمرو میں یہ کوئی جائز فارمولانہیں ہے۔ بلکہ اس کے برعکس بات ہے۔ ایک بنیادی مفہوم کے مطابق جس قدر ہر فرد زیادہ ترقی یافتہ ہوگا، اسی قدر وہ زیادہ اہل، زیادہ موٴثر اور کم محتاج ہوگا اس بات کا کہ وہ دوسروں کو محدود کرنے کی ضرورت محسوس کرے۔ خواہ وہ مرد ہو یا عورت۔ (۴۶)

بیسویں صدی کے نسوانی ادب کا ایک مرکزی خیال نہ صرف مروّجہ تعلقاتِ اقتدار کی جانچ پڑتال رہی ہے بلکہ اقتدار کے تصور اور اس کے استعمال کے متبادل راستوں کی جانچ پڑتال بھی رہی ہے۔ یعنی اقتدار بطور ایک اشتراک عمل کی جانچ پرکھ۔ اس نظریئے کی تحقیق و تفتیش رابن مورگن، کیٹ ملٹ، الزبتھ جینوے، بریٹ آس، پیگی ایٹروبس، میریلاؤس جینسن جوریٹ، ٹیٹیانا میمونووا، کیتھلین بیری، دیوکی جین، کیرولین برڈ، برجیٹ براک اٹنی، ڈیانا رسل، پرڈیٹا ہسٹن، اینڈریا ڈورکن، ایڈرینا رچ اور دیگر ماہرینِ علوم وفنون نے کی ہے۔ (۴۷) اس کے نتیجے کے طور پر سامنے والے مضامین کا جائزہ لیاجائے تو ایک فقرہ ان کا ماحاصل لگتا ہے "Sisterhood is powerful" (خواہرانہ رشتہ بہت بڑی قوت ہے)۔ اقتدار کا یہ نقطۂ نظر وہ ہے جسے لئے ہوئے عورتیں اپنے ''عورتوں کے'' مقام سے اٹھ کر تیزی سے مردوں کی دنیا میں داخل ہورہی ہیں۔ یہ اقتدار کا ''جیت ہی جیت'' (win - win) نہ کہ ''ہار جیت'' (win-lose) نظریہ ہے۔ نفسیات کی اصطلاح میں یہ ''اپنی ترقی کی طرف یوں گامزن ہونے کو کہتے ہیں کہ دوسروں کی ترقی کو محدود کرنے کی ضرورت نہ پڑتی ہو''۔

نظری یا علاماتی اصطلاحات میں یہ اقتدار کا وہ مظہر ہے جس میں ''ربط باہم'' کو اوّلیت دی جاتی ہے۔ اسے زمانۂ قدیم سے دائرے یا بیضوی احاطے (دیوی کے کائناتی بیضے یا دائرہ عظیم) کی بجائے ایک اہرام کے ناہموار دندانوں کی علامت کے طور پر ظاہر کیا جاتا رہا ہے۔ جہاں دیوتا، قوموں یا خاندانوں کے سربراہ چوٹی پر بیٹھ کر حکمرانی کررہے ہیں۔ مدتِ دراز سے مردانہ تسلط کے نظریہ (اینڈروکریٹک آئیڈیالوجی) کے جبر تلے دبا رہنے کی وجہ سے جام (Chalice) کا پیش کردہ رازِ تقلیب ہمارا شعورِ وحدت تھا جس نے ہمیں آپس میں اور وجودِ کائنات کے ساتھ مربوط رکھا۔ عظیم صوفیا اور اصحاب دانش وبصیرت اس روشن فکر کا مسلسل اظہار کرتے رہے۔ انہوں نے اس کو قدیم عیسائیت کی "agape" کی رسم (عشائے

ربانی کی تقریب کے دوران برادری کی ضیافت) کی قوتِ تقلیب کا نام دیا۔ یہ انسانوں کے مابین وہ عنصری ارتباط یا جوڑ ہے جسے اینڈروکریسی کی خصوصیتِ تحریف (distortion characterist) ''برادرانہ'' محبت کہتی ہے۔ خلاصۃً یہ اس قسم کی بے غرض محبت ہے جو ایک ماں کے دل میں اپنے بچوں کے لئے موجزن رہتی ہے۔ اسے ایک زمانے میں تصوف کی زبان میں ''عظیم ماں'' کی اپنے انسانی بچوں کے لئے الوہی محبت کہا جاتا تھا۔

اس مفہوم میں ہمارا قدیم دیوی پوجا کی روحانی روایت کے ساتھ ازسرِنو تعلق شراکت پرمبنی معاشرتی ماڈل کے ساتھ مربوط ہے۔ جو نصفِ انسانیت کے وقار اور عظمت کی ازسرِنو توثیق کرنے سے زیادہ اہم ہے۔ نہ ہی یہ ان قوتوں کا محض تصور کرنے سے زیادہ پُرلطف واطمینان بخش طریقہ ہے جو کائنات پرحکمرانی کرتی ہیں۔ یہ ہمیں داستانوں اور شبیہوں کے ایک مثبت بدل کی بھی پیشکش کرتی ہے جو اتنے طویل عرصے سے انتہائی بنیادی اصول ہائے تعلقاتِ انسانی کی وحشیانہ طور پر تکذیب کرتی رہی ہیں۔ یہ داستانیں اور شبیہیں زندگی دینے اور اس کی پرورش کرنے سے زیادہ اسے قتل کرتی اور اس کا استحصال کرتی رہی ہیں۔

اس کتاب کے ابتدائی ابواب میں ہم نے دیکھا ہے کہ کس طرح ہمارے ثقافتی ارتقا کی شروعات میں دیوی کی ذات میں نقشِ نسوانی اصول نہ صرف قبر میں سے کھود نکالنے یا موت کو زندگی میں بدل دینے کی شبیہہ تھا بلکہ انسانی شعور کو وحیِ خداوندی کے ذریعے روشن کردینے کی شبیہہ بھی تھا۔ جیسا کہ ''یُون'' کا پیروکار نفسیات داں ایرک نیومین لکھتا ہے کہ قدیم رمزی رسوم میں دیوی بطور عطا کنندۂ زندگی، مادی تقلیب کی طاقتوں کی مظہر ہوتی تھی اور روحانی تقلیب کی علامت بھی تھی جو ''مرکز کی قوت کو زمانۂ قدیم سے انسانیت کے اعلیٰ مقاصد کی طرف منتقل کرتی آرہی ہے۔'' (۴۸)

ایک نئی سیاست ومعیشت

ہمارے زمانے میں ''تقلیب''(transformation) کے حوالے سے بہت کچھ لکھا ہے اور کہا جارہا ہے۔ ایلوین ٹافلر کی طرح کے مستقبل بین لوگ ''اولین لہر'' یا زراعت سے لے کر ''دوسری لہر'' یا صنعتکاری اور اب ''تیسری لہر'' یا بعداز صنعتی معاشرہ کی عظیم فنیّاتی تقالیب کا ذکر کرتے ہیں۔ (۴۹) بلاشبہ ہم نے ریکارڈ شدہ تاریخ کے دوران بڑی بڑی تبدیلیاں

دیکھی ہیں۔ لیکن نظریۂ ثقافتی تقلیب کے تناظر میں ہم راہِ ترقی پرگامزن ہیں۔ اس کو اکثر ثقافتی تبدیلیوں سے تعبیر کیا جاتا ہے، مثال کے طور پر کلاسیکل زمانے سے مسیحیت کے زمانے میں داخل ہونا اور نسبتاً جدید سیکولر یا سائنسی عہد تک آتے ہوئے صرف مردانہ نظام (اینڈروکریٹک سسٹم) کے اندر کا سفر ہے۔ ایک قسم کے جابرانہ معاشرے میں سے دوسرے قسم کا جابرانہ معاشرہ برآمد ہوجاتا رہا ہے۔ ''ترقی'' تو ہوئی ہے مگر کیسی؟

آگے بڑھتے بڑھتے راستہ دو شاخہ ہوجاتا رہا ہے، اس دوشاخی تقسیم کے مقامات یا نقاط، سماجی عدم توازن کے نقاط تھے۔ جب عدم توازن بڑھتا تھا تو نئی تبدیلیاں گائیلینک دباؤ کے تحت ظاہر ہوتی تھیں۔ یہ بنیادی نظام میں بھی آسکتی تھی۔ مگر یہ ''تشکیلِ مرکزہ کی چوکھٹ''(Nucleation thresholds) سے باہر نہیں آئیں لیکن یہ ''اینڈروکریسی'' سے ''گائیلنی'' میں تبدیلی کی طرف سگنل دیتی رہیں۔ ایک مانوس تمثیل استعمال کرتے ہوئے ہم کہیں گے کہ اب تک اینڈوکریٹک سسٹم ایک ربڑ بینڈ کی طرح رہا ہے۔ مثال کے طور پر گائیلینک دباؤ بڑھنے کے زمانے میں یہ بینڈ کھنچ کر بہت دور تک پھیل گیا۔ لیکن ماضی میں ہمیشہ جب اینڈروکریسی کی باؤنڈریز یا حدیں آپہنچیں تو بینڈ جھپٹا مار کر واپس اپنی اصل جگہ پر سمٹ گیا۔ اب ریکارڈ شدہ تاریخ میں پہلی بار ربڑ بینڈ پیچھے کھنچنے کی بجائے ٹوٹنے کے قریب پہنچا ہوا ہے اور ہمارا ثقافتی ارتقا بالآخر ان حدود سے آگے بڑھنے والا ہے جہاں اس نے ہمیں ہزاروں برس سے روکے رکھا تھا۔

ہماری فنی ترقی کی اس سطح پر متسلط معاشرے سے مکمل شراکتی معاشرے میں تبدیلی کے سیاسی اور اقتصادی مضمرات کیا ہوں گے؟ ہمارے پاس ایسی ٹیکنالوجیز ہیں کہ وہ ایسی دنیا میں، جس پر خنجر کی حکمرانی باقی نہیں رہی، وہاں ہمارے ثقافتی ارتقا کو بے حد تیز رفتار کرسکتی ہیں۔ جیسا کہ رُوتھ سیوارڈ اپنی سالانہ رپورٹ بعنوان World Military and Social Expenditures میں لکھتی ہے کہ ایک بین البراعظمی بیلسٹک مزائل کی تیاری پر اتنا خراچ آتا ہے کہ اس سے ایک کروڑ بچوں کی غذائی ضرورت پوری ہوسکتی ہے۔ ۱۶۰،۰۰۰ سکول تعمیر ہوسکتے ہیں اور ۳۴۰،۰۰۰ ہیلتھ کیئر سنٹرز کھل سکتے ہیں۔ ایک نئی ایٹمی آبدوز بنانے کے اخراجات، ۲۳ ترقی پذیر ممالک کے تعلیمی بجٹ کے برابر ہیں۔ ان ممالک میں ۱۲ کروڑ بچے سکولوں سے محروم ہیں اور ایک کروڑ ۱۰ لاکھ بچے اپنی پہلی سالگرہ منانے سے پہلے ہی مرجاتے

ہیں۔ ایک ایٹمی آبدوز کی تیاری کی لاگت سے ان لاکھوں افراد کے لئے روزگار اور تعلیم کے نئے مواقع پیدا ہوسکتے ہیں جو اس وقت غربت اور جہالت میں مبتلا ہیں۔(۵۰)

مستقبل بین اہل علم اپنی تحریروں میں بار بار اصرار کرتے ہیں کہ ہم سماجی رہنمائی کے نظام اور اقدارِ حکمرانی سے محرومی کے باعث وسائل کو صحیح کاموں پر خرچ نہیں کررہے ہیں اور نہ اپنی ترقی یافتہ صلاحیت کار کو اعلیٰ مقاصد کی طرف موڑ رہے ہیں۔

سٹینفورڈ ریسرچ انسٹی ٹیوٹ میں مطالعۂ مستقبلیات کے سابق سربراہ ویلیز ہرمن لکھتا ہے کہ جس چیز کی اشد ضرورت ہے وہ یہ ہے کہ ہم اپنے بنیادی ثقافتی قضیوں، سماجی کرداروں اور اداروں کی بنیادوں کو مکمل طور پر تبدیل کردیں۔ وہ اپنے خیالات کو بطور اپنے نئے شعور کے بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ مسابقت کو تعاون کے متوازن بنایا جائے گا اور انفرادیت کو محبت کے ساتھ متوازن کیا جائے گا۔ یہ ایک ''کائناتی شعور'' یا ''اعلیٰ درجے کا شعور'' ہوگا، جو اپنے ذاتی مفاد کو اپنے ساتھیوں اور مستقبل کی نسلوں کے مفادات کے ساتھ ہم آہنگ کرے گا۔ اور اس میں ''صحیح معنوں میں پُرجلال حجم'' کی بنیادی تقلیب میں کوئی کمی قابل قبول نہ ہوگی'' (۵۱)

اسی طرح ہم سیکنڈ ''کلب آف روم'' کی رپورٹ میں پڑھتے ہیں کہ ''بڑے پیمانے کی علاقائی اور بالآخر عالمی تباہ کاری سے بچنے کے لئے ہمیں لازماً ایک نیا عالمی نظام وضع کرلینا چاہیے جو ایک معقول ماسٹر پلان کے تحت طویل المیعاد نشوونما کا ضامن ہو اور اسے صحیح جذبۂ عالمی تعاون کے ساتھ آزادانہ شراکت کے تحت مرتب کیا جائے''(۵۲)

یہ عالمی نظام ایک نئی عالمی اخلاقیات کے تحت کام کرے گا اور موجودہ اور آئندہ نسلوں کے مستقبل کے زیادہ شعور اور ضرورتوں کی شناخت پر مبنی ہوگا۔ اسے تصادم کی نہیں بلکہ تعاون اور ہم آہنگی کی ضرورت ہوگی نہ کہ ہم تسخیرِ فطرت کو اپنا نصب العین بنائے رکھیں۔ (۵۳)

ان نقشوں کا ایک نمایاں پہلو یہ ہے کہ یہ مستقبل بین ٹیکنالوجی یا اقتصادیات کو ہمارے مستقبل کے اصل عاملین (main determinants) قرار نہیں دیتے، اس کے برعکس وہ کہتے ہیں کہ ہمارے مستقبل کی راہوں کا تعین انسانی اقدار اور سماجی نظم وضبط کرے گا۔ بہ الفاظ دیگر ہمارے مستقبل کا فیصلہ وہ طریقے کریں گے جن کا ہم بطور انسان مستقبل کے امکانات، قوتوں اور مضمرات کا جائزہ لیتے ہیں۔ ایک اور مستقبل بین ''جان میک ہیل'' (John

(Mchale کے الفاظ میں ''ہمارے ذہنی نقشے مستقبل کا بنیادی لائحہ عمل ہوتے ہیں''۔ (۵۴)

لیکن جو کچھ بہت ہی زیادہ قابل توجہ ہے وہ یہ ہے کہ بیشتر مستقبل بین دراصل یہ کہہ رہے ہیں کہ ہمیں ان سخت گیر اقدارِ تسخیر کو پیچھے چھوڑ دینا چاہیے جو ''مردانگی'' کے ساتھ روایتی طور پر وابستہ چلی آرہی ہیں کیونکہ یہ ''آزادانہ شراکت کے ذریعے وجود میں آنے والے صحیح معنوں میں عالمی تعاون'' کے لئے ضروری نہیں، نہ ہی ''انفرادیت کو محبت کے ساتھ متوازن بنانے'' اور ہم آہنگی کو تسخیر فطرت کے ساتھ مربوط کرنے کے لئے ضروری ہے۔

غلبے پر مبنی معاشرے کو شراکتی معاشرے میں تبدیل کرنے سے ظاہر ہے کہ ہمیں اپنی فنیاتی سمت میں تبدیلی لانے کی ضرورت ہوگی۔ ترقی یافتہ ٹیکنالوجی کو تباہی مچانے اور غلبہ پانے کے لئے استعمال کرنے کی بجائے انسانی زندگی کو برقرار رکھنے اور اسے ترقی دینے کے لئے استعمال کرنا ہوگا۔ اس سے ضیاع کاری اور ضرورت سے زائد کھپت جو اس وقت ضرورت مندوں کو لوٹتی ہے، اس میں کمی آنا شروع ہوجائے گی کیونکہ بہت سے سماجی مبصرین کا کہنا ہے کہ ہمارے مغرب میں ضرورت سے زائد کھپت اور ضیاع کی تہہ میں یہ حقیقت پائی جاتی ہے کہ ہم ثقافتی طور پر خود پر اس خیال کو مسلط پاتے ہیں کہ ہم مسلسل کماتے رہیں، دھڑا دھڑ خریداری کرتے رہیں اور فضولیات تعمیر کرتے رہیں۔ ان چیزوں کو ہم نے اطمینان بخش جذباتی تعلقات کا بدل بنایا ہوا ہے۔ (۵۶)

مزید برآں اینڈروکریسی سے گائیلنی میں منتقل ہونے سے غلبے کی سیاست اور استحصال کی اقتصادیات کا خاتمہ ہونا شروع ہوجائے گا، جو آج بھی ہماری دنیا میں ایک دوسرے سے ہاتھ ملائے چل رہی ہیں۔ کیونکہ جیسے جان سٹوارٹ مل نے ایک صدی پہلے اپنی تہلکہ خیز کتاب Principles of Polictical Evonomy میں کہا تھا کہ جس طریقے سے اقتصادی وسائل تقسیم کئے جارہے ہیں اس میں بے رحم اقتصادی قوانین کا دخل نہیں بلکہ یہ سیاسی یعنی انسانی انتخاب کا شاخسانہ ہیں۔ (۵۶)

آج بہت سے لوگ اس امر سے آگاہ ہیں کہ موجودہ حالات میں نہ کیپٹل ازم ہمارے بڑھتے ہوئے اقتصادی اور سیاسی الجھنوں کا حل پیش کرسکتا ہے اور نہ کمیونزم کوئی حل بتاتا ہے۔ جس حد تک اینڈروکریسی اپنی جگہ پر قائم ہے ایک منصفانہ سیاسی اور اقتصادی نظام کا

قیام ناممکن ہے۔ جس طرح امریکہ جیسی مغربی اقوام میں نامزد امیدواروں کو طاقتور مفادات کے حامل لوگوں سے مالی مدد ملتی ہے، اس سے صاف واضح ہوجاتا ہے کہ یہ اقوام ابھی تک سیاسی جمہوریت تک نہیں پہنچ سکیں۔ روس جیسی اقوام جن پر ایک طاقتور، مراعات یافتہ اور زیادہ تر مردانہ انتظامیہ کا طبقہ حکمرانی کررہا ہے، وہ بھی اقتصادی جمہوریت سے بہت دور ہیں۔

بالخصوص غلبے کی سیاست اور استحصال کی اقتصادیات تمام اینڈروکریسیوں کا خاصہ ہے، جس نے ''دوہری معیشت'' کا رویہ اختیار کررکھا ہے۔ اس کے تحت عورتوں کو یا تو تنخواہ نہیں دی جاتی، یا مردوں کی بہ نسبت کم دی جاتی ہے اور پیداواری سرگرمیوں کا منصوبے کے تحت استحصال کیاجاتا ہے۔ جیسا کہ اقوام متحدہ نے "State of the World's Women" 1985 میں کہا ہے: عالمی طور پر عورتیں کل آبادی کا نصف ہیں۔ گھنٹوں کے حساب سے دیکھا جائے تو وہ دنیا کے کاموں کا دوتہائی کام وہ انجام دیتی ہیں۔ آمدنی کے طور پر دیکھا جائے تو جتنا مرد کماتے ہیں تو وہ دسواں حصہ کماتی ہیں۔ مردوں کی جتنی املاک ہیں وہ اس کے ۱۰۰ ویں حصے کی ملکیت رکھتی ہیں۔ (۵۷) علاوہ ازیں عورتوں سے جو بلامعاوضہ کام لیاجاتا ہے، اسے قومی صلاحیتِ کار کے حساب کتاب سے باہر رکھا جاتا ہے۔ (۵۸) (افریقہ میں غذائیں اگانے کا بیشتر کام عورتیں کرتی ہیں اور عالمی سطح پر وہ صحت سے متعلقہ اتنا کام بلامعاوضہ انجام دیتی ہیں جتنا کہ صحت کا کل باقاعدہ کام ہوتا ہے) اس بنا پر مستقبل میں ہیزل ہینڈرسن کا کہنا ہے کہ، عالمی اقتصادی کارگزاریاں ''شماریاتی مغالطوں'' پر مبنی ہیں۔ (۵۹)

ہینڈرسن، "The Politics of the Solar Age" میں ایک ''مثبت اقتصادی مستقبل'' کی بات کرتا ہے جس میں مردوں اور عورتوں کے کرداروں کو ازسرنو متوازن کیا گیا ہو۔ ایسا کرنے میں اس حقیقت کا سامنا کرنا پڑے گا کہ ''مردانہ'' عسکریت انسانی توانائیوں کے ضیاع کا ایک مشغلہ ہے۔ کیونکہ یہ جمع کردہ توانائی کو تباہ وبرباد کرکے رکھ دیتی ہے۔ اسے بنیادی انسانی ضرورتوں کی تکمیل میں نہیں لایا جاسکتا۔ ہینڈرسن پدرسرانہ نظاموں کے انحطاط کا جائزہ لیتے ہوئے پیشنگوئی کرتا ہے کہ ''مردانہ اقدار نہ اقتصادی حقائق سے عہدہ برآ ہوسکتی ہیں اور نہ ماحولیاتی مسائل حل کرسکتی ہیں، اس وقت تمام حقائق وسائل مردانہ شناخت کے حوالے سے چل رہے ہیں۔'' (۶۰)

MashalBooks.org

اسی طرح برطانوی مصنف جیمز رابرٹس "The Sane Alternative" میں ''توسیع پسند مرد'' کے مستقبل اور ''معقول ماحولیاتی دانش کی علمبردار'' عورت کے مستقبل کا موازنہ کرتے ہوئے ان کے تضاد کو نمایاں کرتا ہے۔ اور جرمنی میں پروفیسر جوزف ہوبر ''پدرسریت'' کے مستقبل کا منفی اقتصادی منظر پیش کرتا ہے۔ اس کے برعکس وہ اپنے مثبت منظر میں کہتا ہے کہ ''دونوں اصناف اقتصادی لحاظ سے مساوی حیثیت رکھتی ہیں۔ مرد اور عورتیں کمانے میں بھی شراکت دار ہیں اور گھریلو کام کاج، بچوں کی پرورش اور دیگر سماجی سرگرمیوں میں بھی بھرپور حصہ دار ہوتے ہیں۔''(۶۲)

مرکزی موضوع جو مندرجہ بالا آرا اور دیگر اقتصادی تجزیوں میں یکسانی پیدا کرتا ہے، اگرچہ ہمارے مستقبل کے لئے بہت اہمیت رکھتا ہے، تاہم اب بھی بڑی حد تک تشنۂ اظہار ہے وہ یہ ہے کہ روایتی اقتصادی نظام خواہ وہ سرمایہ داری ہو یا اشتراکیت، انہیں مارکسی تجزیوں کی زبان میں "alienation of caring labor" پر استوار قرار دیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ اس کی یہ "caring labor" (بچوں کی پرورش، ہاتھ بٹانے اور دوسروں سے محبت وشفقت وغیرہ) پوری طرح اقتصادی سرگرمیوں میں ضم ہوجاتی ہے۔ ہم ایک اساسی اقتصادی اور سیاسی تقلیب پائیں گے۔ (۶۴) جوں جوں انسانیت کا نصف نسوانی حصہ، (جسے اینڈروکریسی میں زنانہ کردار کے عنوان سے پہچانا جاتا ہے) معاشرے کے رہبرانہ مکینزم میں ڈھلتے ہوئے اس میں پوری طرح ضم ہوجائے گا اور سیاسی اور اقتصادی طور پر ایک صحت مند اور متوازن نظام وجود میں آجائے گا۔ پھر آزادیٔ نسواں کی تحریک کے تصوراتِ امن، ماحول دوستی اور انسانی صلاحیت اور دیگر نسوانی (gylanic) تحریکوں کے تصورات کے مطابق ہماری انواع اپنے ارتقا کی مکمل سطح پر پہنچنے کے تجربات کو محسوس کرنے لگیں گی۔

تقلیب

نفسیاتی اور سماجی حیاتِ نو سے لازماً ایسی تبدیلیاں آئیں گی کہ اس وقت ہم ان کی پیشنگوئی نہیں کرسکتے حتیٰ کہ تصوّر بھی نہیں کرسکتے۔ اس کا سبب یہ ہے کہ اس سے پہلے ہم نے سماجی بہتری کے لئے جتنی توقعات باندھی تھیں وہ ناکام ہوچکی ہیں، ایک مثبت مستقبل کی نقش گری شکوک وشبہات کو جنم دیتی ہے۔ اس کے باوجود ہم جانتے ہیں کسی ساخت میں

MashalBooks.org

آنے والی تبدیلیاں اس کی کارکردگی میں بھی تبدیلیاں لاتی ہیں۔ جس طرح کوئی شخص ایک گول کمرے کے کونے میں بیٹھا نہیں رہ سکتا اسی طرح جب ہم جبر پر مبنی معاشرے سے شراکتی معاشرے میں منتقل ہونے لگیں گے ہماری سوچ، احساسات اور عمل کے پرانے طریقے بھی بتدریج تبدیل ہوجائیں گے۔

ریکارڈ شدہ تاریخ کے ہزاروں برس انسانی سپرٹ اینڈروکریسی کی زنجیروں میں جکڑی رہی ہے۔ ہمارے ذہنوں کی نشوونما معطل رہی ہے اور ہمارے دل احساسات سے محروم رہے ہیں۔ تاہم حق کی تلاش، خوبصورتی کی تمنا اور انصاف کے حصول کے لئے ہمارا جذبہ کبھی ٹھنڈا نہیں پڑا۔ جونہی ہم ان زنجیروں کو توڑیں گے ہمارے ذہن دل اور ہاتھ آزاد ہوجائیں گے، اسی طرح ہمارا تخلیقی تصوّر بھی آزاد ہوجائے گا۔

میرے لئے اینڈروکریسی سے گائیلینی کی طرف سفر (تقلیب) کی ایک انتہائی خیال انگیز تشبیہہ تتلی کی ابتدائی شکل(caterpillar) کے، بھرپور خوشنما تتلی میں تبدیل ہوجانے کی ہے۔ مجھے انسانیت کے انتہائی بلندیوں تک پہنچنے کے لئے یہ مثال انتہائی مناسب لگتی ہے. کیونکہ تتلی حیاتِ نو کی ایک قدیم علامت ہے جو دیوی کی طرف منسوب تبدیلیٔ ہیئت کی قوتوں میں سے ایک ہے۔

دو مزید کتابیں"Breaking Free" اور"Emergence" اس تقلیب کا زیادہ گہرائی میں جا کر اس کا مفصل جائزہ لیں گی۔ یہ سماجی تشکیل پذیری کے لئے (نہ کہ یوٹوپیائی تصور کے لئے) ایک نیا مفصل خاکہ پیش کریں گی، جوکہ شراکت پر مبنی معاشرے کا قابل عمل منظر ہوگا۔ اگرچہ ان کے چند صفحات پڑھنے سے ان میں مکمل طور پر پیش کردہ تصور واضح نہیں ہوسکتا۔ میں اس باب کو ختم کرنے سے پہلے مختصراً ان تبدیلیوں کا نقشہ پیش کروں گی جو ہمارے تعطّل کے شکار ثقافتی ارتقا کے آگے بڑھنے کے نتیجے میں ظاہر ہونے والی ہیں۔ (۶۵)

جب ہم متسلّط دنیا سے شراکت پر مبنی دنیا کی طرف بڑھے تو انتہائی ڈرامائی تبدیلی جو سامنے آئے گی وہ یہ ہوگی کہ ہمارے بچوں اور پوتے پوتیوں کو پتہ چل جائے گا کہ جنگ کے خوف سے آزاد دنیا میں زندگی گزارنا کیا چیز ہوتی ہے۔ ایسی دنیا میں جس میں یہ مینڈیٹ نہیں ہوگا کہ ''مرد'' کہلانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ دوسروں کو مغلوب کرکے رکھیں اور عورتوں کی بہتر ہوتی ہوئی حیثیت کے ساتھ ساتھ ''نسوانی'' سماجی ترجیحات بڑھنے سے

ایٹمی تباہ کاری کا خطرہ بھی بتدریج کم ہوتا چلا جائے گا۔ جوں جوں انہیں سماجی اور اقتصادی مساوات ملتی رہے گی مالتھس کے ''نظریۂ آبادی اور وسائل'' کے تقاضے قحط و بیماری اور جنگ گھٹتے رہیں گے۔ اس کے نتیجے میں شرح پیدائش کا وسائل کے ساتھ بہتر توازن قائم ہوجائے گا۔ (۶۶)

چونکہ ہمارے بہت سے مسائل کا زیادہ تر تعلق ''مرد کی تسخیر کائنات'' اور اس حقیقت کے ساتھ ہے کہ ''ماحولیاتی خانہ داری'' کو اینڈروکریسی کی پالیسیوں میں کبھی ترجیح حاصل نہیں رہی۔ لہٰذا زمانہ تقلیب کے برسوں میں ماحول کی آلودگی، عورتوں کی تحقیر اور وسائل کا ضیاع بھی کم ہونے لگے گا۔ چنانچہ ایندھن اور دیگر قدرتی وسائل کی قلت کے نتائج بھی کم ہونے لگیں گے۔ کیمیاوی آلودگی سے پیدا ہونے والے صحت کے مسائل میں بھی کمی آجائے گی۔ (۶۷)

چونکہ عورتوں کو مالیاتی مدد، عطیاتِ اراضی اور جدید ٹریننگ دینے کی پالیسیوں سے ایک خاص حکمت عملی کے تحت خارج کرنے کا سلسلہ بند ہوجائے گا، اس لئے ''تیسری دنیا'' میں اقتصادی ترقیاتی پروگرام برائے فروغِ تعلیم وٹیکنالوجی اور معیار زندگی زیادہ موثر ہوجائیں گے۔ اقتصادی نااہلیاں کم ہوجانے کے باعث بھی ترقی کی رفتار بڑھ جائے گی۔ آج کی ترقی یافتہ اور ترقی پذیر دنیاؤں میں لاکھوں لوگ جن عذابوں میں سے گزر رہے ہیں، ان میں بھی کمی آجائے گی۔ چونکہ عورتوں سے بچے جننے والے مویشیوں اور بوجھ اٹھانے والے جانوروں جیسا سلوک کرنا بند کردیا جائے گا اس لئے انہیں صحت، تعلیم اور سیاسی امور میں شرکت کی پالیسیوں میں زیادہ نمائندگی حاصل ہوجائے گی، اس سے نہ صرف نصف انسانیت پر مشتمل خواتین بلکہ جُملہ انسانیت فائدہ اٹھائے گی۔ (۶۸)

دنیا میں غربت اور بھوک کم کرنے کے معقول اقدامات کی وجہ سے ہمارا اپنی دیگر انواع کے ساتھ رابطے کا بڑھتا ہوا شعور دولت مند اور نادار اقوام کے درمیان خلیج کو رفتہ رفتہ کم کرتا رہے گا۔ اربوں ڈالر کے "work hours" جو اس وقت تباہی مچانے والی ٹیکنالوجیز پر خرچ کئے جارہے ہیں وہ ان ٹیکنالوجیز پر صرف کئے جائیں گے جو زندگی عطا کرتی ہیں، اور اسے برقرار رکھنے میں مدد دیتی ہیں۔ انسانی غربت اور بھوک رفتہ رفتہ وحشیانہ اینڈروکریٹک ماضی کی یادیں بن کر رہ جائیں گی۔ (۶۹)

مرد اور عورت کے تعلقات جو اس وقت باہمی شبہات اور الزامات کی بلند ترین سطح پر ہیں ان کی جگہ صاف گوئی اور اعتماد کی عادات بڑھیں گی جو ہمارے خاندانوں اور معاشروں میں نمایاں طور پر منعکس ہوں گی۔ اس سے ہماری قومی اور بین الاقوامی پالیسیوں پر بھی مثبت اثرات مرتب ہوں گے۔ رفتہ رفتہ ہم ذہنی امراض، طلاقوں، خودکشیوں، بچوں سے بدسلوکی، قتل و غارت، بین الاقوامی دہشت گردی جیسے مسائل پر بھی قابو پالیں گے۔ جیسا کہ ہماری تحقیق پر مبنی دوسری کتاب میں مفصل ذکر آئے گا اس قسم کے مسائل زیادہ تر مردانہ غلبے کی معاشرتی تنظیم اور جابرانہ طور پر بچوں کی پرورش کے طور طریقوں کی پیداوار ہوتے ہیں۔ کیونکہ ان کی بنیاد ہی جبر پر رکھی گئی ہے۔ اس طرح ہم مردوں اور عورتوں کے درمیان متوازن تعلقات قائم کر کے دونوں صنفوں کے بچوں کی پر ورش کے زیادہ منصفانہ اور مساویانہ رویے اختیار کر کے حقیقت پسندانہ طور پر بنیادی نفسیاتی تبدیلیوں کی توقع کر سکتے ہیں۔ یہ اقدامات نسبتاً مختصر وقت میں تقلیب کی رفتار تیز کر سکتے ہیں۔

ایسی دنیا میں جس میں عورتیں اور مرد بھرپور شراکت کے ساتھ زندگی بسر کر رہے ہوں گے، خاندان اس وقت بھی ہوں گے سکول، حکومتیں اور دیگر سماجی ادارے بھی کام کریں گے۔ لیکن اس وقت ظہور پذیر ہونے والے مبنی برانصاف خاندانوں اور سوشل ایکشن نیٹ ورک کی طرح مستقبل کے سماجی ڈھانچے زیادہ سے زیادہ ''ربط'' (linking) پر استوار ہوں گے نہ کہ درجہ بندی پر۔ فرد سے یہ تقاضا کرنے کی بجائے، کہ وہ اہرامی نظامِ مراتب کے اندر خود کو فٹ کر لے، یہ ادارے غیر مراتبی ہوں گے، جن کے اندر فیصلہ سازی اور عمل درآمد میں تنوع اور لچک، دونوں کے لئے گنجائش ہوگی۔ نتیجتاً عورتوں اور مردوں کے لئے کردار کافی لچک کے حامل ہوں گے۔ اور سب انسانی انواع کو زیادہ سے زیادہ ترقیاتی لچک فراہم کریں گے۔ (۷۰)

موجودہ رجحانات کے تحت ہمارے بہت سے نئے ادارے بھی اپنے اپنے دوائر میں وسیع سے وسیع تر ہوتے رہیں گے اور قومی حدود سے ماورا ہوں گے۔ جیسے جیسے ہمارا باہمی رابطوں کا شعور بڑھے گا اور ہمارا ماحول مضبوطی اختیار کرے گا قدیم شہری ریاست بطور ایک ''محو ذات سیاسی وجود'' (self-absorbed political entity) دم توڑ دے گی تاہم زیادہ یگانگت اور زیادہ تطابق پذیری کی بجائے (جو کہ جابرانہ نظام کی منطقی مظہر ہے)، زیادہ انفرادیت اور

زیادہ تنوّع پیدا ہوگا۔ چھوٹے سماجی یونٹ مشترکہ مقاصد کے تنوّع کے نیٹ ورک میں مربوط ہوجائیں گے جیسے مشترکہ کاشت، تیار فصل سنبھالنے سے لے کر سمندروں اور فضاؤں کی کھوج، علم میں شرکت اور فنون وغیرہ۔ (۷۱) ان کے علاوہ اور بھی کئی ناقابل پیشنگوئی عالمی منصوبے ہوں گے جو کہ قدرتی اور انسانی وسائل کے استعمال اور ایسی نئی مادی اور سماجی ایجادات سے متعلق ہوں گے جن کی فی الحال پیشنگوئی تک نہیں کی جاسکتی۔

دنیا کے شراکتی معاشرے میں منتقل ہونے پر بہت سی دریافتیں اور فنیاتی ایجادات سامنے آئیں گی۔ اس وقت موجود مشینی اور تیکنیکی آلات کو بھی نئی سماجی ضرورتوں کے لئے استعمال کیا جائے گا جیسا کہ Schumacher اور دیگر سائنسدانوں نے پیشنگوئی کی ہے کہ ممکن ہے کہ بعض ٹیکنالوجیز کو ایسے کاموں میں استعمال کیا جائے جن میں کارکنوں کی زیادہ تعداد کو کام پر لگایا جاسکتا ہو۔ مثلاً اعلیٰ تخلیقی کاموں پارچہ بافی، ظروف سازی اور بڑھئی کے پیشے کو آگے بڑھانے میں مددمل سکے گی۔ لیکن ساتھ ہی یہ امر ملحوظ رکھا جائے گا کہ چونکہ مقصد انسانوں کو حشرات الارض کی مانند مصروفیتوں سے آزادی دلانا ہے، ایسا ہرگز نہیں ہوگا کہ ٹیکنالوجیز کو انسانی محنت کے تمام کے تمام شعبوں میں داخل کردیا جائے۔ اس کے برعکس ہم زیادہ دستیاب وقت اور قوت کو اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو مفید ترین طریقوں سے بروئے کار لائیں گے۔ ہم توقع کرتے ہیں کہ میکانکی اور خودکاری (automation)، زندگی کو آسان تر بنانے میں معاون بنے گی۔ چھوٹے پیمانے اور بڑے پیمانے، ہر سطح کے پیداواری شعبوں کو ایسے طریقوں سے منظّم کیا جائے گا کہ ورکرز کی زیادہ تعداد کو کام ملے جسے وہ آبرومندانہ طور پر انجام دیں۔ ایسا نہیں ہوگا جیسے تسلط کے نظام میں کارکنوں کو مشینوں کا حصہ بن جانا پڑتا ہے۔

امتناعِ حمل (برتھ کنٹرول) کے طریقوں کو محفوظ و بے ضرر اور قابل بھروسہ بنانے کی ٹیکنالوجی اولین ترجیح ہوگی۔ ہم اس امر کی بھی بہت ریسرچ کریں گے کہ بڑھاپا آنے کی رفتار (aging process) میں کمی آجائے۔ اس وقت کمزور یا بیکار اعضائے انسانی بدلنے کے جو طریقے مروّج ہیں ان کو ترک کرکے ایسی تیکنیکیں اختیار کی جائیں گی کہ باڈی سیلز ازسر نو پیدا ہونے لگیں گے۔ لیبارٹریوں کے اندر پیدا کردہ زندگی کا معیار بھی بلند کیا جائے گا۔ اس وقت مصنوعی طور پر خلیئے تیار کرنے کے لئے عورتوں کا بدل ''انکوبیٹروں'' کو بنایا جارہا ہے

یا خود عورتوں ہی کو ''انکوبیٹرز'' بنادیا جاتا ہے۔ اس کی بجائے باز آفرینی (reproduction) کی نئی ٹیکنالوجی وضع کی جائے گی، اس کا مرد اور عورت، دونوں بڑی احتیاط سے جائزہ لیں گے تا کہ دونوں صنفوں کی تخلیقی صلاحیتوں کو بہتر سے بہتر طریقے سے بروئے کار لایا جاسکے۔ (۷۲)

چونکہ تباہی مچانے والی ٹیکنالوجیز ہمارے وسیع قدرتی اور انسانی وسائل کو ہڑپ نہیں کررہی ہوں گی، اس لئے موجودہ (اور آئندہ بننے والے) فلاحی منصوبے زیادہ تیزی سے فروغ پانے لگیں گے۔ اس کا نتیجہ خوشحال معیشت کی صورت میں نکلے گا جس کی جھلک زمانہ قبل از تاریخ میں ملتی ہے۔ نہ صرف ماڈی دولت منصفانہ طور پر تقسیم ہوگی بلکہ ایسا اقتصادی نظام بھی قائم ہوجائے گا جس میں زیادہ سے زیادہ املاک جمع کر کے خود کو تحفظ دینا اور دوسروں کو کنٹرول کرنے کا ذریعہ بنانا ایک قسم کی بیماری یا گمراہی سمجھا جائے گا۔

مجموعی طور پر اس میں متعدد معاشی درجے ہوں گے، ان میں سے پہلا درجہ، جو ابھی سے نمودار ہورہا ہے، اسے ملی جلی معیشت کہا جاتا ہے۔ یہ سرمایہ داری اور اشتراکیت کے بعض بہترین اجزا مجمع کرنے سے وجود میں آئی ہے، اس میں کسی حد تک نراجی (انارکزم) بھی شامل ہے۔ (۷۳)

یہ سوشلسٹ تصور کہ انسانوں کے نہ صرف بنیادی سیاسی حقوق ہوتے ہیں بلکہ بنیادی اقتصادی حقوق بھی ہوتے ہیں، گائیلینک معیشت کا بنیادی تصور بنے گا، یہ معیشت کسی کو مغلوب رکھنے کا ذریعہ نہیں بلکہ ضرورتیں پوری کرنے اور آسانیاں بہم پہنچانے کا ذریعہ ہوگی۔ مگر چونکہ شراکت داری پر مبنی معاشرہ ایک متسلط معاشرے کی جگہ لے گا، ہم اس سے نئی اقتصادی ایجادات کی بھی توقع کرتے ہیں۔

اس نئے اقتصادی نظام کی تہہ میں موجودہ ناکام ہوتی ہوئی ''دوہری معیشت'' کی جگہ لینے (replacement) کا عزم موجزن ہوگا۔ اس لئے اس میں نہ مردانہ غلبہ ہوگا اور نہ دولت، جیسا کہ ہینڈرسن نے شواہد کے حوالے سے کہا ہے کہ ''اس دوہری معیشت کا خاصہ ہے کہ یہ سماجی اور ماحولیاتی، نظاموں کو ہڑپ کر جاتی ہے''۔ چنانچہ ہم توقع کر سکتے ہیں کہ غیر زری (Non-monetized) اور غیر رسمی معیشت جو گھرانوں کی ضرورتیں پوری کرنے، بچوں کی نگہداشت کرنے، رضا کارانہ کمیونٹی سروس جیسے انسانی رویّوں کی حامل ہوگی، مناسب

قدر و قیمت پائے گی۔(۷۴) ماضی کی فروگزاشتیں جن میں دوسروں کی بھلائی کو کبھی خاطر میں نہیں لایا جاتا تھا نئی معیشت میں کوئی جگہ نہیں پا سکیں گی۔

عورتوں کو جنسی طور پر مفلوج بنا دینے، انہیں زدوکوب کرنے اور دیگر وحشیانہ طور طریقوں (جن کے ذریعے اینڈروکریسی نے ''انہیں ان کے مقام پر رکھا'') ''مقدس روایتیں'' نہیں سمجھا جائے گا بلکہ مجرمانہ افعال قرار دیا جائے گا۔ یہ وہ مکارانہ حربے تھے جنہیں مرد عورت سے غیرانسانی سلوک روا رکھنے کے لئے استعمال کرتے رہے۔(۷۵) مرد مردوں سے بھی اسی قسم کا غیرانسانی سلوک کرتے رہے۔ ماضی میں ''شجاعت'' پر مبنی رزمیوں اور داستانوں میں جن مردانہ صفات کو غلبے اور فتوحات کا ذریعہ بنایا جاتا رہا ان سے بھی اسی طرح نمٹا جائے گا جس کے وہ مستحق ہیں۔ انہیں بربریت اور وحشتِ انسانی سمجھا جائے گا، جس نے خود اپنوں کو شکار کرنا شروع کر دیا ہے۔

جام (chalice) قلبِ ماہیت کے جن رازوں کا امین ہے ان کی توثیقِ نو اور مدح وستائش کرتے ہوئے نئی داستانیں مرتب کی جائیں گی جو ہمارے اندر وہ گمشدہ احساسِ تشکر جگائیں گی جس کی گواہی جدید حجری دور اور منوآن کریٹ کی فنکارانہ باقیات سے ملتی ہے۔ یہ اساطیریات (mythology) ہمیں ہماری نسبتاً زیادہ معصوم نفسیاتی جڑوں کے ساتھ نئے سرے سے مربوط کر کے ہمیں نفسیاتی لحاظ سے اس دنیا میں واپس نہیں لے جائیں گی جو ہماری انواع کے فنیاتی بچپن میں ہوا کرتی تھی۔ اس کے برعکس یہ ہمارے قدیم ورثے کی گائیلینک داستانوں اور علامتوں کو جدید تصورات کے ساتھ مربوط کر کے ہمیں آگے کی دنیا میں لے جائیں گی جو بہت زیادہ معقول ہوگی اور وہ اس شعور سے رہنمائی حاصل کرے گی کہ ہم ماحولیاتی اور سماجی طور پر آپس میں اور اپنے ماحول کے ساتھ نہایت گہرے طور پر جُڑے ہوئے ہیں۔

نئی دنیا میں زندگی کا جشن منانے کے ساتھ ساتھ محبت کا جشن بھی منایا جائے گا، اس میں عورتوں اور مردوں کے درمیان جنسی محبت بھی شامل ہے۔ جنسی کشش اور رابطے کا نظام، جسے اس وقت ہم شادی کا نام دیتے ہیں وہ یقیناً برقرار رہے گا، مگر اس رابطے کا بنیادی مقصد باہمی رفاقت، جنسی تلذذ اور محبت ہوگا۔ بچے پیدا کرنے کا تعلق مرد کے نام اور اس کی جائداد

کی منتقلی کے ساتھ نہیں ہوگا۔ ایک دوسرے کی دیکھ بھال نہ صرف جنسی جوڑوں کی محض یکجائی تک محدود ہوگی بلکہ اس تعلق کو پوری طرح تسلیم کیا جائے گا۔ (۷۶)

بچوں کو سماجیات کے آداب سے روشناس کرانے والے تمام ادارے ہماری انسانی صلاحیتوں کو نکھارنے اور انہیں عملاً بروئے کار لانے کا کام بھرپور طریقے سے جاری رکھیں گے۔ یہ کام صرف اسی دنیا میں صحیح طور پر انجام پاسکتا ہے جس میں اصل مقصود انسانی زندگی کی کمیت نہیں بلکہ معیار مقصود ہو۔ اسی لئے مارگریٹ میڈ نے پیشنگوئی کی ہے بچے کمیاب (scarce) ہوں گے اور اعلیٰ صلاحیتوں کے مالک ہوں گے۔ (۷۷)

بچپن کے تشکیلِ حیات کے برس مرد اور عورت دونوں کی اوّلین توجہات کے مرکز ہوں گے۔ صرف ان کے حیاتیاتی والدین ہی نہیں بلکہ دوسرے بالغ لوگ بھی اس بیش قیمت سماجی ماحصل یعنی بچے سے متعلقہ مختلف قسم کی ذمہ داریاں نبھائیں گے۔ ان کی شعوری غذائیت (rational nutrition) کے ساتھ ساتھ ان کی ذہنی ورزشوں مثلاً یوگا کی اعلیٰ اقسام اور غور و فکر کی عادت سازی پر بھی توجہ دی جائے گی۔ یہ ان کے صحتمند اجسام اور ذہنوں کے لئے ابتدائی لوازمات ہوں گے۔ بچے کو معاشرے سے ہم آہنگی اختیار کر کے دنیائے مراتب میں اپنی جگہ بنانے کی تربیت دینے کی بجائے تعلیم کو اس کے لئے زندگی کا ایک عمل (پراسس) بنادیا جائے گا جس میں اس کے اندر تمام مراحلِ حیات کے لئے زیادہ سے زیادہ لچک اور تخلیق کاری اجاگر ہو۔

اس دنیا میں جہاں ہماری اعلیٰ ارتقائی صلاحیتوں کی تشکیل پذیری ہماری معاشرتی پالیسی کی رہنما بنے گی، ریسرچ کا بنیادی مقصد جسم اور جان کے لئے انفرادی اور معاشرتی برائیوں کی پیش بندی ہوگا۔ بعدازاں ہماری پوشیدہ صلاحیتوں کا بھرپور اعتراف کیا جائے گا اور ذہنی قوتوں کی وسیع پیمانے پر تحقیق اور نشوونما ہوگی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ دماغ اور جسم کی وہ امکانی صلاحیتیں جن کا پہلے تصور تک نہ کیا گیا ہوگا ان کو دریافت کر کے انہیں فروغ دیا جائے گا۔ (۷۸)

مزید برآں یہ نسوانی (گائیلینک) دنیا، ایسی دنیا بن جائے گی جس میں بچوں (لڑکیاں لڑکے دونوں) کے ذہن بندشوں سے دوچار نہیں رہیں گے۔ یہ وہ دنیا ہوگی جس میں روک ٹوک اور خوف وہراس کی فضا نہیں ہوگی اور نہ ہی کہانیوں اور داستانوں کے ذریعے یہ نہیں

پڑھایا جائے گا کہ برائی کتنی ناگزیر ہوتی ہے اور ہم بطور انسان کتنے گمراہ ہیں۔ اس دنیا میں بچوں کو خوفناک مردوں کے معرکوں اور جنگل میں پائی جانے والی جادوگرنیوں کے مکروہ کاموں کی داستانیں نہیں پڑھائی جائیں گی۔ انہیں نئی داستانیں، رزمئے اور کہانیاں پڑھائی جائیں گی کہ بنی نوع انسان اچھائیوں کا مرقع ہے، مرد امن کے شیدائی ہیں اور تخلیق اور محبت کی قوت (جس کی علامت مقدس جام ہے جو ساغرِ زندگی ہے) حکمران اصول ہے کیونکہ اس نسوانی (گائیلنک) دنیا میں ہماری جستجوئے انصاف، مساوات اور آزادی، ہماری تشنگیٔ علم اور روحانی روشنی اور آرزوئے محبت وحُسن بالآخر آزادی سے ہمکنار ہوجائے گی۔ اور مردانہ (اینڈروکریٹک) تاریخ کے خوفناک چکر کے بعد عورتیں اور مرد، دونوں پر بالآخر یہ انکشاف ہوجائے گا کہ انسان ہونے کا کیا مطلب ہوسکتا ہے۔

تازہ ترین صورت حال

25ویں طباعت کے لئے خصوصی ضمیمہ

''جام اور خنجر''(The Chalice and the Blade) کی اس خصوصی اشاعت کے لئے، جوکہ اس کی پچیسویں پرنٹنگ ہے، ایڈیٹرز نے مصنفہRiane Eisler سے کہا کہ وہ دنیا بھر میں جابرانہ ماڈل اور شراکتی ماڈل کے مابین برپا کشیدگی کو آج جیسے بھی پاتی ہے اس پر ایک مختصر تبصرہ کردے۔ چنانچہ ذیل کی سطور حاضر ہیں۔

۱۹۸۷ء میں اس کتاب کی اوّلین اشاعت کے بعد بہت سے واقعات رونما ہوئے، دنیا بھر میں بھی اور میرے گردوپیش کی دنیا میں بھی۔ عالمی سطح پر ہر شکل کے غلبے کے خلاف تحریک مسلسل آگے بڑھتی رہی۔ اس کے ساتھ ساتھ اس مزاحمت میں بھی اضافہ ہوتا رہا ہے، جو غلبے اور تشدد کی مختلف شکلوں میں قائم نظام میں تبدیلی کو روکنے کے لئے کی جا رہی ہے۔ بعض اوقات یہ مزاحمت انتہائی رجعت پسندانہ اور وحشیانہ شکلیں اختیار کرتی رہی ہے۔

جو انتہائی ڈرامائی واقعات رونما ہوئے ان میں سابق سوویٹ یونین کے واقعات سرفہرست ہیں۔ میخائل گورباچوف کی"glasnost" (کھلے پن) اور"perestroika" (اصلاحِ سیاسی نظام) کی پالیسیوں نے سخت گیر اوپر سے نیچے کی طرف نظامہائے مراتب اور ارتکازِ اختیارات پر مبنی طریق حکمرانی کے خلاف کھلی بغاوت کی راہ کھول دی۔ اس کی اپنی بیوی رئیسہ کے ساتھ ذاتی شراکت(partnership)، اس کا یہ تصوّر کہ اقدار میں ایک بنیادی تبدیلی

کی ضرورت ہے، اس کی سوویٹ فوجی نظاموں میں یک طرفہ تخفیف اور زیادہ مصنفانہ، خوشحال اور پُرامن دنیا کے لئے اس کی مخلصانہ آرزو نے بے پناہ امیدوں کے چراغ روشن کر دیئے۔ اس سے نہ صرف روس اور امریکہ کی اسلحہ کی دوڑ ختم ہوتی نظر آنے لگی بلکہ چین سے لے کر امریکہ تک ہر جگہ کے لوگ بہتر مستقبل کے خواب دیکھنے لگے۔

لیکن جو لوگ سوویٹ یونین کی حقیقتوں سے آگاہ تھے وہ کم پُرامید تھے۔ عام نظروں سے دُور معاشی سبوتاژ، جان بوجھ کر اشیائے ضرورت کی قلت کر دی جانے، سوویٹ اشرافیہ کے ارکان کی پُراسرار سرگرمیوں، صوبوں میں بے چینی، سنگین رکاوٹوں کے باوجود حالات کو زیر کنٹرول لانے اور عدم استحکام لانے کی کوششوں کی رپورٹیں مسلسل مل رہی تھیں۔ جب اس خرابیٔ حال میں نااہلی اور بدعنوانی بھی شامل ہوگئی جو کہ پہلے ہی نظام کی اندرونی ساخت میں موجود تھی۔ ریاستی کنٹرول سے نام نہاد مارکیٹ اکانومی میں منتقلی کی کوششوں سے نظم وترتیب میں خلل پیدا ہونا ناگزیر تھا، اس سے مکمل اقتصادی انہدام کا خطرہ پیدا ہوگیا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جب وحشیانہ انتقام کا خوف کم ہوگیا تو جو ملک کبھی سوویٹ ''ایمپائر'' ہوتا تھا، چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں میں بٹنے لگا اور آخر کار گورباچوف خود بھی محرومِ اقتدار ہوگیا۔

اس دوران جگورباچوف اور یالٹسن قیادت کے لئے آپس میں لڑ رہے تھے، وہاں ہونے والے ایک اجلاس میں شرکت کے لئے مجھے بھی بلایا گیا اس میں چند سوویٹ دانشور اور سیاستدان شامل تھے۔ ان سیاست دانوں میں یالٹسن کا ایک بہت بارسوخ رفیق کار بھی تھا۔ نیز ایک ماہر معیشت، ایک ٹیلی ویژن پروڈیوسر اور سوویٹ اکیڈمی آف سائنسز کے متعدد ارکان بھی تھے۔ یہ ایک دلچسپ اجلاس تھا۔ میں یہ دیکھ کر ورطۂ حیرت میں ڈوب گئی کہ بہت سے شرکائے اجلاس اس عجیب وغریب خیال میں مبتلا تھے کہ اگر وہ اشتراکیت کی جگہ نظام سرمایہ داری (کیپٹل ازم) لے آئیں تو سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔

بعد کے حالات نے واقعی اس کج فہمی کو واضح کر دیا۔ بجائے اس کے کہ شرکائے اجلاس اشتراکت اور سرمایہ داری کے نظاموں کے بہترین اجزا کو یکجا کر کے اس کا گہرا جائزہ لیتے اور پھر مکمل طور پر ایک اقتصادی راستہ اختیار کرتے، روسی منصوبہ سازوں نے اقتصادی تشکیل نو کے لئے وہی سرمایہ دارانہ نسخہ تجویز کر دیا جس نے پہلے ہی ترقی پذیر دنیا کے بہت سے حصوں کو مصیبت سے دوچار کر رکھا ہے۔ معاشرے کے کمزور عناصر عورتیں بچے اور بوڑھے

ناقابل بیان مشکلات میں مبتلا پائے جاتے ہیں۔ بجائے اس کے کہ وہ خاندانوں کے اندر حقیقی جمہوریت لانے کی طرف قدم بڑھاتے، وہ ادھر اُدھر گھومنے لگے ہیں۔ خاندانوں میں عورتوں کی مار پٹائی اور ظلم وزیادتی کے واقعات تیزی سے بڑھ رہے ہیں بلکہ ان کے خلاف کھلے جرائم ہورہے ہیں۔ ان کی طرف کوئی دھیان ہی نہیں دیتا۔ ۱۹۹۳ء میں کے انتخابات میں روسیوں نے سب سے زیادہ ووٹ ایک یہود دشمن، کٹر قوم پرست فسطائی کے حق میں ڈالے جس نے بعد میں شیخی بگھاری کہ اگر وہ روس کا صدر منتخب ہوگیا تو وہ ایک نیا ہیروشیما اور ناگاسا کی پیدا کردے گا کیونکہ وہ ایٹمی ہتھیار استعمال کرنے سے گریز کرنے والا نہیں ہے۔

یہ کتاب لکھنے کے دوران میں کہہ چکی ہوں کہ مستقبل کے لئے ہماری جدوجہد سرمایہ داری اور اشتراکیت کے مابین نہیں بلکہ ایک معاشرتی اور نظریاتی تنظیم (خواہ وہ مشرقی یا مغربی ہو، یا شمالی یا جنوبی ہو) کے مابین ہے کہ کیا ہم متسلط معاشرہ قائم کرنا چاہتے ہیں یا شراکت پر مبنی نظام زندگی لانے کے خواہاں ہیں۔ اگر ہم روس کے حالیہ واقعات پر اس تناظر میں نگاہ ڈالیں تو ان کی تہہ میں وہی حرکیات کارفرما ہیں۔ روس میں جمہوریت کو درپیش مسائل کی جڑیں اشتراکیت میں دکھائی نہیں دیتیں بلکہ اس خصوصیت کے اندر پیوست ہیں جو سب متسلط ماڈل کے معاشروں میں مشترک ہے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ روس میں سوویٹ آمریت کے قیام سے پیشتر زاروں اور جاگیرداروں کے زمانے میں بھی روسی صرف استبدادی نظامِ مراتب ہی سے آشنا تھے۔ اسی طرح کمیونسٹ اقتدار کے شرکائے کار کو گورباچوف کی زیادہ پارٹنرشپ کی طرف پیش رفت کو سبوتاژ کرنے میں جو کامیابی حاصل ہوئی اسے نظام تسلّط کے ان حربوں کی روشنی میں دیکھا جاسکتا ہے جن کی مدد سے انہوں نے اشیا کی مصنوعی قلت پیدا کر کے اُسے چلتا کردیا۔ اشرافیہ کے خود کو برقرار رکھنے کے طریقوں میں سے ایک طریقہ یہ بھی ہے جس کا مظاہرہ امریکہ (یوایس اے) میں متسلط نظام کے تنزل کے ابتدائی عہد میں اس وقت ہوا جب صدر ریگن کے اقتصادی منصوبہ سازوں نے سماجی بھلائی کے پروگراموں کے لئے مخصوص فنڈز کا رُخ اسلحہ سازی کی طرف موڑ دیا اور دولتمندوں پر ٹیکسوں میں کمی کر کے بالائی طبقے اور نچلے طبقے کے درمیان خلیج مزید وسیع کردی (جیسا کہ سابق سوویٹ یونین میں ہوا تھا) اس طرح وہ مختلف علاقائی نسلی اور مذہبی گروہوں

MashalBooks.org

کے مابین بڑھنے والی دشمنیوں کو آگے لے آئے۔

مزید برآں روس میں عورتوں کے بڑے پیمانے پر لیبر مارکیٹ میں داخل ہونے اور نچلے اور متوسط درجے کی سرکاری ملازمتوں میں شامل ہوجانے کے باوجود گھروں میں بدامنی کم نہ ہوسکی۔ میں نے یہ مناظر ۱۹۸۴ میں دورۂ روس کے دوران براہ راست دیکھے۔ روس انتہا درجے کے مردانہ تسلط کا ملک ہے اور وہاں جملہ امور مرد کے گرد گھومتے ہیں، اس رویئے کو بیویوں کو زدوکوب کرنے کی روایت کی پشت پناہی حاصل ہے۔

گھریلو زندگی میں عورت کو یہی سکھایا گیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو ثانوی چیز سمجھے اور ہر معاملے میں شوہر کو ترجیح دیتے ہوئے اس کی خدمت کو اپنا شعار بنائے۔ بدقسمتی سے مرد کی فوقیت کا نظریہ گورباچوف کے دور اقتدار میں بھی تبدیل نہ ہوسکا تاہم اتنا ضرور ہوا کہ روس نے تحریک آزادئ نسواں کو ردِ انقلاب قرار دے کر جو سختیاں کی تھیں وہ کسی حد تک نرم پڑگئیں۔ گورباچوف کی معزولی کو روسی ٹیلی ویژن پر دکھایا گیا تھا اور اس موقع پر اس نے امریکی ٹیلی ویژن کو جو انٹرویو دیا اس میں اس نے اپنی اہلیہ رئیسہ کے ساتھ اپنی رفاقت کا تذکرہ بھی کیا تھا۔

مردانہ تسلط کی فرسودہ روایات کے تسلسل کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ پیشگوئی کی جاسکتی تھی کہ روس اور امریکہ کے درمیان شدید دشمنی کے بدل کے طور پر علاقائی نسلی اور مذہبی اختلافات کی بنیاد پر دشمنیاں پھر بھڑک اٹھیں گی کیونکہ جیسا کہ ہم نے دیکھا ہے کہ ''بنی نوع انسان'' کے اندر اعلیٰ ادنیٰ، اندرونی گروپ بمقابلہ بیرونی گروپ قسم کی دھڑے بندیاں اور (بحوالۂ داستانِ حوّا) ''خطرناک'' اور ''ادنیٰ عورت'' وہ امتیازات ہیں جنھوں نے معاندانہ ذہنیت کی تعمیر کی ہے اور اسی کے بل بوتے پر جابرانہ نظام استحکام پاتے رہے ہیں۔

یہ امر بھی قابل پیشگوئی ہے کہ جن ثقافتوں اور ذیلی ثقافتوں میں مردوں کا غلبہ نسبتاً زیادہ سختی سے جما ہوا ہے وہاں اقتصادی بدحالی کے ادوار میں متشددانہ کارروائیاں بہت ہوں گی۔ اس تشدد کا علاقائی اور نسلی بنیاد پر جواز ڈھونڈا جائے گا۔ زیادہ تر تشدد قومیت کے نام پر ہوگا جیسا کہ یوگوسلاویہ، کشمیر اور سری لنکا میں ہوتا ہے یا ہوتا رہا ہے۔ کسی حد تک یہ مذہب کے نام پر بھی ہوتا ہے جیسا کہ اسلامی دنیا کے بہت سے حصوں میں ہورہا ہے۔ اور کبھی کبھار یہ کمیونسٹ انقلاب کی بنیاد پر ہوتا ہے جیسے پیرو، گوئٹے مالا، ایلسواڈور اور تقریباً حال میں

میکسیکو میں ہوا ہے۔لیکن آخر کار سیاسی یا اقتصادی جمہوریت لانے کی بجائے ''ناراض نوجوانوں'' کی بغاوت کی صورت پیدا ہوگی جن کا نشانہ اسی طرح کے متشدد اور سخت گیر بوڑھے ہوں گے اس کا چوکیدار بدلنے سے کچھ بھی فائدہ نہ ہوگا۔ اور ایسا دنیا کے بہت سے خطوں میں ہوچکا ہے جہاں نو آبادیاتی افواج کی جگہ اب دیسی افواج نے متشددانہ اور استحصال پسندانہ حکمرانی قائم کررکھی ہے کیونکہ صومالیہ کے جنگجو سرداروں کے مابین جاری جنگ، مشرق وسطٰی میں جاری خونریزی، جرمنی میں سرمنڈا (skinheaded groups) گروپوں اور غیر ملکیوں کے درمیان سر پھٹول اور امریکہ (یونائیٹڈ سٹیٹس) چاؤ گینگ وارز کی تہہ میں کارفرما اشتراک مردانہ بالادستی کے سوا کچھ بھی نہیں۔ ان تمام جگہوں پر حقیقی مردانگی تشدد اور غلبے کے ہم معنی سمجھی جاتی ہے۔ یہی بنیادی چیز ہے جس کا متنوّع سیاق وسباق میں اظہار ہوتا رہتا ہے۔

اگر ہم شراکت اور تسلط کے ماڈلوں کے نمونوں کو استعمال کرتے ہوئے اپنی دنیا میں ہونے والے قابلِ نفرت تشدد کا تجزیہ کریں تو گھسی پٹی صنفی روایتوں کا تسلسل واحد عامل نہیں ہے (میڈیا نے اپنے فقیدالمثال پروپیگنڈے کی قوت کے بل بوتے پر مردانہ تشدد کو پُرکشش بنا کر پیش کیا ہے) کیونکہ اصل تشدد وہ طریقہ ہے جس کے ذریعے نظامِ تسلط آخر کار عورت پر مرد کی برتری، مرد پر مرد کی برتری اور قوم پر قوم کی برتری قائم کرتا ہے۔

اس سے متعلقہ ایک ''عامل'' یہ ہے کہ یہ نظام تباہی پھیلانے والی ٹیکنالوجیز کو زیادہ اہمیت دیتا ہے اور اس نے حالیہ برسوں میں ہتھیاروں کی تعداد میں بے تحاشا اضافہ کیا ہے۔ کیونکہ تباہی پھیلانے والی ''ناکارہ'' ٹیکنالوجیز'' کو مسلسل ان سے بھی زیادہ مہلک ٹیکنالوجیز سے تبدیل کیا جارہا ہے۔ اس کی واضح اور ڈرامائی مثال یہ ہے کہ خلیج کی جنگ میں عراق کے صدر صدام حسین نے کافی تعداد میں پہلے سے امریکہ اور اس کے اتحادیوں کے دیئے ہوئے ہتھیار استعمال کئے تھے۔ یہ وہ جنگ تھی جو امریکہ نے اس وقت کے اپنے جدید ترین اسلحہ کو آزمانے کے لئے شروع کی تھی۔ بعض رپورٹوں کے مطابق اس جنگ میں لاکھوں عراقی مارے گئے تھے۔

ایک اور معاون عامل جسے نہایت طاقتور الیکٹرانک میڈیا کے ذریعے پھیلایا گیا ہے، ایسے پروگرام اور اشتہار بازی ہے جس کے ذریعے حد سے زیادہ مادہ پرستانہ اور ماحولیاتی

MashalBooks.org

لحاظ سے انتہائی غیر موزوں مسرفانہ لائف سٹائل کو آئیڈیالائز کیا جارہا ہے، اس کے ساتھ ساتھ نظام تسلط کی اقتصادیات کو برقرار رکھا گیا ہے جو ایک طرف دولت منداور غریب اقوام کے درمیان خلیج کو وسعت دے رہا ہے اور دوسری جانب ان اقوام کے اندر غریب اور امیر کے مابین خلیج کو وسیع تر کر رہا ہے۔ دوسری طرف صنعتی دنیا میں مینوفیکچرنگ کے طریقوں کو تیزی سے بدلا جارہا ہے اور ان میں ایسی فنیاتی تبدیلیاں کردی جاتی ہیں کہ آئے دن صنعتی کارکن بڑی تعداد میں فالتو قرار پارہے ہیں، بے روزگاری بڑھنے سے ان کے گھروں کے چولہے بجھ جاتے ہیں جبکہ پروڈکشن کے نئے طریقوں کی وجہ سے محنت کشوں کی کم سے کم تعداد کی ضرورت رہ جاتی ہے (چھانٹی کرتے وقت اور نئی افراد کی قوت بھرتی کرتے وقت سیاہ فام نسل کے مردوں سے امتیازی رویہ اختیار کیا جاتا ہے، اس صورت حال سے عورت اور تمام رنگوں اور نسلوں کے بچے بُری طرح متاثر ہورہے ہیں) اس سے بھی زیادہ مُضر طریق کار ساختیاتی ردّوبدل کی پالیسیوں (structural adjustment policies) کا ہے جو عالمی بنک اور دیگر بین الاقوامی مالیاتی ادارے ترقی پذیر ملکوں پر مسلط کرتے ہیں۔ جب انہیں زندگی کے لئے ضروری کم معیار کی اشیا تیار کرنے والے پروڈکشن سیکٹر کی کم مالیاتی مدد کے ساتھ شامل کیا جاتا ہے تو اس سے بالخصوص افریقہ کے ممالک میں زیادہ تر عورتوں ہی کی حالت بگڑتی ہے۔

علاوہ ازیں پچھلے سات برسوں نے نہ صرف خونریزی زیادہ بڑھائی ہے بلکہ مزید اقتصادی اور ماحولیاتی مسائل میں بھی اضافہ کیا ہے جن کی جڑیں نظامِ تسلّط کے عقائد کی بالادستی کے حامل اداروں میں پیوست ہیں۔شراکت دارانہ پہلو میں بھی اہم پیش رفت ہوئی ہے، یہ سب چیزیں جو کچھ ظاہر کرتی ہیں وہ یہ ہے کہ مردانہ تسلط کے نظام کی طرف سے شدید مزاحمت کے باوجود نظام شراکت داری کا دباؤ اپنا کام دکھاتا رہے گا۔

اس طرح طاقت اور جبر کے ذریعے قائم استبدادی حکومتوں کے خلاف عالمگیر تحریک مسلسل جاری ہے۔بعض اوقات اس کا شدت سے اظہار ہوتا ہے، اس میں دہشت گردی اور فوجی بغاوتیں بھی شامل ہو جاتی ہیں۔لیکن عموماً اور زیادہ تر یہ تحریک خود کو غیر متشددانہ رکھتی ہے۔ جیسا کہ ۱۹۸۹ میں چینی طلبا نے ٹینامین سکوائر میں پُرامن مظاہرے کئے (اس میں خاص طور پر قابل ذکر بات مظاہرین کا ''جمہوریت کی دیوی'' کو تحریک کی علامت کے طور

پر استعمال کرنا تھا) مگر ان مظاہروں کو متشددانہ طریقے سے کچل دیا گیا۔ مگر بعض جگہوں پر کم ڈرامائی مظاہرے بھی ہوئے مثلاً برما (اب میانمر) میں تحریک جمہوریت چلی جس کی قیادت ''ڈاانگ سان سُوکی'' کررہا تھا۔ اس کو ۱۹۹۱ میں امن کا نوبیل پرائز ملا تھا۔

تحریک کو تشدد کے ذریعے کچلنے کے خلاف عالمی رائے عامہ کا شدید ردّعمل شراکت پر مبنی معاشرے کی طرف چلنے کا ایک ''سائن پوسٹ'' (نشانِ راہ) ہے۔ اسی طرح اقوام متحدہ کی وہ ابتدائی نوعیت کی مساعی بھی قابل قدر ہیں کہ اس نے بوسینا میں ڈھائے جانے والے وحشیانہ مظالم کی تحقیقات کے لئے وارکرائم کمیشن قائم کردیا۔ کیونکہ اگر کمیشن صحیح طور پر کام شروع کردے تو اس سے جنگ کے خلاف نفرت میں اضافہ ہوگا کیونکہ جنگ خود ہی اختلافات حل کرنے کا ایک وحشیانہ اور سفاکانہ ہتھیار ہے۔

شعور میں اہم تبدیلیاں لانے کا ایک اور نشان، عورتوں پر طویل عرصہ سے ڈھانے والے مظالم کے خلاف عالمی سطح پر مرکوز ہونے والی توجہ ہے، خواہ یہ مظالم بیویوں پر تشدد کی شکل میں ہوں، زنا بالجبر ہو، صنفی اعضا قطع کردینا ہو، نوزائیدہ بچیوں کو دم گھونٹ کر ماردینا یا انہیں بھوکی پیاسی چھوڑ کر ہلاک کرنا ہو۔ یہ تشدد کے نئے نظاموں کی طرف اشارہ ہے۔

اسی طرح ۱۹۸۹ء میں اقوام متحدہ کا کنونشن برائے حقوق بچگاں، اور ''۱۹۹۴'' کو خاندانوں کا عالمی سال قرار دیا جانا، بچوں پر تشدد کی پُر زور مذمت کا اظہار تھا جبکہ اس سے پہلے یہ تشدد سرکاری طور پر جائز سمجھا جارہا تھا۔ اب یہ شعور بھی تیزی سے بڑھ رہا ہے کہ بچوں پر تشدد، غیر منصفانہ اور جابرانہ سماجی اداروں کو برقرار رکھنے میں اہم کردار ادا کرتا ہے۔

مختصراً یہ کہ اس امر کا شعور بڑھ رہا ہے کہ عرف عام میں جن کو پبلک اور پرائیویٹ دائرے کہا جاتا ہے وہ آپس میں پیچ در پیچ جڑے ہوئے ہیں۔ اسے سادہ لفظوں میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ دنیا بھر کے عوام اس بات سے خوب آگاہ ہیں کہ جب تک مردوں، عورتوں، والدین اور بچوں کے بنیادی تعلقات میں تبدیلی نہیں آتی کوئی دیرپا اور قابل قبول تبدیلی نہیں آسکتی۔ قابل قبول تعلقات کا یہ شعور ایک اور بدلتے ہوئے شعور کی علامت ہے، وہ ہے، ماحولیاتی تحریک کا فروغ جس کا زور فطرت کو فتح کرنے پر نہیں بلکہ اس کے ساتھ شراکت کرنے پر ہے۔ بدقسمتی سے اس کے لئے محض لفّاظی کی جارہی ہے۔ عملی کام نہ ہونے کے برابر ہے۔ ماحول کو بگاڑنے میں ملٹی نیشنل کارپوریشنوں کا کردار کسی سے ڈھکا چھپا

نہیں۔ وہ بظاہر ماحولیاتی آلودگی پر اپنی تشویش کا اظہار کرتی رہتی ہیں لیکن دوسری طرف وہ ہوا اور پانی میں مسلسل آلودگی پھیلاتی رہی ہیں۔ تاہم اس بات کے اشارے ملتے ہیں کہ امریکہ اصلاحی ماحول کے لئے اپنے وعدوں کو نبھائے گا جیسا کہ اس کے سابق وائس پریذیڈنٹ الگور نے اپنے دور اقتدار میں ٹھوس اصلاحی پالیسیاں وضع کرنے کا اعلان کیا تھا (اس نے اپنی کتاب "Earth in Balance" میں لکھا ہے کہ امریکہ بین الاقوامی معاہدوں میں ماحول سے متعلقہ دفعات شامل کرے گا) اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ اس شعور نے کسی حد تک حکومتوں کی پالیسیوں کو متاثر کرنا شروع کردیا ہے۔

شعور میں بعض تبدیلیاں خاص طور پر اہمیت رکھتی ہیں، ان کا تعلق عالمی آبادی میں بے تحاشا اضافے سے ہے، جسے آبادی کا ''دھماکہ'' کہاجاتا ہے۔ یہ ۱۹۷۴ء میں بخارا میں آبادی کے مسئلے پر ہونے والی پہلی بین الاقوامی میٹنگ سے متعلق گفتگو سے ہٹ کر بات کررہی ہوں کیونکہ اس امر کا ہرکہیں اعتراف موجود ہے کہ آبادی میں استحکام کی اگر کوئی امید رکھی جاسکتی ہے تو وہ عورتوں کے مسائل پر توجہ دینے میں مضمر ہے: ان لفظوں کو نمایاں کرنے کی کوشش کریں، موجودہ صورت میں یہ بالکل بے معنی ہیں عورتوں کو نہ صرف فیملی پلاننگ تک آزادانہ رسائی دی جانی چاہیے بلکہ انہیں تعلیم اور پیشہ وارانہ ترقی کے بھی مساوی مواقع بھی ملنے چاہئیں۔ تاکہ ان کے تحفظ اور حیثیت کا بیشتر انحصار بیٹے جننے پر ہی نہ رہے۔

عورت کی اہمیت کا اعتراف نہ صرف آبادی کی کامیاب منصوبہ بندی میں مرکزی حیثیت رکھتا ہے بلکہ اقتصادی اور معاشرتی ترقی میں بھی اہمیت رکھتا ہے۔ عورتوں کے مسائل آہستہ آہستہ بین الاقوامی پروگراموں میں بھی اپنی جگہ بنارہے ہیں۔ مثال کے طور پر عالمی بنک کے سابق چیف اکانومسٹ لارنس سمرز نے اس مسئلے پر حال میں اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ ترقی کے لئے لاگت کے مقابلے میں انتہائی نفع بخش سرمایہ کاری (cost effective investment) وہ ہے جو عورتوں کی تعلیم پر کی جائے گی، یہ خاص طور پر ترقی پذیر دنیا میں زیادہ منافع دے گی جہاں مردوں اور عورتوں کی شرح خواندگی کا تناسب بعض اوقات ''دو'' اور ''ایک'' تک چلاجاتا ہے۔

انسانیت کے اس نسوانی نصف حصے کی طرف توجہ غیرسرکاری یا نجی ترقیاتی امداد میں بھی منعکس ہونا شروع ہوگئی ہے۔ مثال کے طور پر بنگلہ دیش کے گرامین بنکنگ پروجیکٹ کی

MashalBooks.org

کامیابیوں کو دیکھ کر کیلی فورنیا میں قائم ''کٹالیسیس نارتھ ساؤتھ ڈیولپمنٹ پارٹنرشپ'' وسطی امریکہ میں دیہی عورتوں کو چھوٹے قرضے دیتی رہی ہے، جس میں اسے خود بھی بہت فائدہ ہوا اور خواتین کو بھی اپنی معیشت سنوارنے میں بڑی مدد ملی۔ اسی طرح کیلی فورنیا میں ''گلوبل فنڈ فار ویمن'' نے دنیا بھر کی عورتوں کی معاشی ترقی کے لئے امداد فراہم کرنے کی اچھی مثال قائم کی ہے۔

ذیل کی مثالیں اہم پارٹنرشپ کے ایک اور رجحان کی عکاسی کرتی ہیں: عورتوں کی خاصی تعداد سرکاری اور غیر سرکاری پالیسی سازی کے عہدوں پر فائز ہورہی ہے۔ (اس کا اظہار ۱۹۹۲ء میں امریکی سینٹ اور ہاؤس آف ریپریزنٹیٹوز کے لئے منتخب ہونے والی عورتوں کے ووٹنگ ریکاڈز سے بھی ہوتا ہے) صحت، سماجی بہبود اور تعلیم کے شعبوں میں عورتوں کو زیادہ توجہ مل رہی ہے، سکینڈے نیوین اقوام میں عورتوں کی بھرپور سیاسی نمائندگی ہورہی ہے لیکن حالیہ برسوں میں دیگر مغربی اقوام میں انہیں کافی فوائد حاصل ہورہے ہیں اگرچہ سوویٹ یونین اور سابق مشرقی بلاک کی اقوام میں مخالفانہ رجحان بھی دیکھنے میں آیا ہے، مگر یہ نظام تسلط کی واپسی کے مظاہر میں سے ہے۔

مزید برآں یہی رجعت سابق سوویٹ یونین اور مشرقی یورپ میں عورتوں کی تحریکوں کی حوصلہ افزائی کررہی ہے۔ ۱۹۹۳ء کے روسی انتخابات میں ''ویمنز پارٹی'' کی چند امیدوار کامیاب ہوئیں۔ امریکہ میں اقتدار کا بش سے کلنٹن انتظامیہ کو منتقل ہونا امریکی عورتوں کی تحریک کے لئے ایک بڑا موڑ ثابت ہوا، اس سے عورتیں مدافعتی پوزیشن سے آگے جاکر اپنے مقاصد حاصل کررہی ہیں۔ صدر کلنٹن کا اپنی بیوی ہیلری کلنٹن کے ساتھ تعلق شراکت (پارٹنرشپ) کا اہم ترین ماڈل رہا ہے، اس کی کابینہ میں بھی عورتوں کی فقیدالمثال تعداد شامل تھی۔ اس سے پہلے عورتوں سے متعلق مطالبات مثلاً ''بچے کی پیدائش سے قبل کی چھٹیاں'' ''عورتوں کے خلاف تشدد کی روک تھام'' اور ''نسوانی'' سماجی ترجیحات کے رکے ہوئے بل پاس ہوگئے۔

ایک اور اہم پیش رفت وہ توجہ ہے جو اسلحے کی بین الاقوامی تجارت کی ''انسانی اور اقتصادی لاگت'' کو مل رہی ہے۔ امریکہ میں ہتھیاروں کا پھیلاؤ روکنے کا بل جینیٹ رینو نے پیش کیا جسے کلنٹن ہی نے اٹارنی جنرل مقرر کیا تھا۔ ادھر مردوں کی وحشیانہ حرکتوں کو مردوں

کی شان کے طور پر پیش کرنے اور اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والے مصائب کو معمولی نوعیت کے ظاہر کرنے پر مبنی ٹیلی ویژن اور ویڈیو گیمز کی صنعت کو ایسی شبیہیں استعمال کرنے سے روکنے میں بھی جینٹ رینو کے دباؤ نے کافی اثر دکھایا۔

کارپوریشن میں بھی، جو روایتی متسلط یا ملٹری ماڈل کی سخت گیر اوپر سے نیچے چین آف کمانڈ کے طور پر متشکل ہوتی ہے، شراکت کی طرف تحرک واضح ہو رہا ہے۔ اگرچہ ایسا ہر کہیں نہیں ہو رہا ہے، یہ تصوّر بڑھ رہا ہے کہ اوپر سے نیچے کی طرف بے لچک ساختیں (structures) تیز رفتار ٹیکنالوجی اور اقتصادی تبدیلی کے دور میں غیر موثر اور کاہل ثابت ہوتی ہیں۔ (خواہ وہ مرکزی منصوبہ بندی کی حامل سوشلسٹ بیوروکریسی یا کیپٹلسٹ کارپوریٹ بیوروکریسی ہو)، ایسی ساختیں درحقیقت انسانی صلاحیتوں کے لئے تباہ کن ہوتی ہیں۔ یہ باتیں بھی زیر بحث رہتی ہیں۔

اب یہ دیکھنا باقی ہے کہ کیا اس طرح کوئی حقیقی ساختیاتی تبدیلیاں واقع ہو سکیں گی یا محض مزید کتابیں لکھی جائیں گی اور مشیر قسم کے لوگ وسیع ٹیم ورک اور صحت بخش یا روایتی ''نسوانی'' مینجمنٹ سٹائلز کے گن گاتے رہیں گے۔ لیکن تب بھی بعض کثیر القومی کارپویشن جو پہلے ہی دنیا کی بیشتر دولت کو کنٹرول کر رہی ہیں ان کا اپنے کارپوریٹ کلچرز میں تبدیلیوں کی بات کرنا، بڑی نمایاں پیشرفت ہے۔

اسی طرح یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ وی آنا میں ۱۹۹۳ء میں ہونے والی انسانی حقوق کی کانفرنس میں خواتین کی بڑی معقول تعداد موجود تھی۔ نیز ''ثقافتی اضافیت'' (Cultural relativism) جسے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے جواز کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔ اسے شدید نقصان پہنچا ہے۔ اور ان خرافات کو تسلیم کئے جانے کے اشارے مل رہے تھے جن میں ''انسانی حقوق'' میں سے اکثریت کے حقوق بطور ''عورتوں کے حقوق'' اور ''بچوں کے حقوق'' الگ الگ تقسیم کئے جا رہے تھے۔

میں یہاں کہوں گی کہ ان تمام دوائرِ زندگی میں شراکت پر مبنی معاشرے کی طرف جو سفر جاری ہے سربراہانِ حکومت کی قیادت کی بدولت نہیں بلکہ سرکاری اور بین الاقوامی تنظیموں پر بے شمار غیر سرکاری گروپوں پر مسلسل پڑنے والے دباؤ کے نتیجے میں سفر ہو رہا ہے، یہ وہ گروپ ہیں جن کی جڑیں دنیا بھر میں پھیلی ہوئی ہیں یہ بے شمار چھوٹے بڑے دیہی قصبوں

سے اٹھنے والی شراکت پر مبنی تحریک ہے جو میرے خیال کے مطابق ہماری آج کی دُنیا کی اہم ترین طویل المیعاد پیش رفت ہے۔ کیونکہ یہی وہ مقام ہے جہاں پر عام مفہوم والی سیاست نئے معنی اختیار کر کے طاقت کے عدم توازن پر مرکوز ہورہی ہے۔ اس کا رُخ متسلط اہرام (dominator pyramid) کی صرف چوٹی کی طرف نہیں بلکہ ہمارے انتہائی اساسی رشتوں کی طرف ہے: یعنی والدین اور بچوں کے تعلق اور مرد وعورت کے تعلق کی جانب ہے جہاں متسلط معاشروں میں لوگوں کو سب سے پہلے یہی سکھایا جاتا ہے کہ دوسرے لوگوں کے انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں ''ایک معمول ہے، جو چلتا آیا ہے اور آگے بھی اسی طرح چلے گا''۔

لیکن یہاں ہم کتاب کے موضوع کی طرف آتے ہیں جو میں نے ابھی ابھی ختم کی ہے۔ لیکن جیسا کہ اس میں سے حاصل ہوا یہ ہے کہ اسے ''جان چھڑانا'' (Breaking free) نہیں کہاجائے گا بلکہ ''مقدس خوشی'' (Sacred pleasue) کہاجائے گا کیونکہ گزشتہ آٹھ برسوں میں میری روز افزوں توجہ ہمارے انتہائی نجی تعلقات (بالخصوص جنس، روحانیت، سیاست اور اقتصادیات) پر مرکوز رہی اور اس سے بھی آگے بڑھ کر اس سوال پر رہی کہ شراکتی معاشروں میں دکھ اور خوشی کی سماجی تشکیل جبر پر مبنی معاشروں سے کس قدر مختلف ہوتی ہے۔

جہاں تک جام اور خنجر (The Chalice and the Blade) کا تعلق ہے، اس کتاب کے لئے تحقیق کرنا اور اسے ضابطۂ تحریر میں لانا میری زندگی میں گہری مقصدیت اور معنویت لانے کا باعث بنا، اس کے ساتھ ساتھ میرے ذہنی افق میں بھی وسعت پیدا ہوئی۔ اس نے مجھے گہرے جذباتی اور روحانی احساسات سے آشنا کیا، جس کا میں اس سے پہلے اندازہ نہیں کرسکتی تھی۔

میں ان ذاتی تاثرات کے ساتھ اس ضمیمے کو پایۂ تکمیل تک لا رہی ہوں کہ پچھلے دو عشروں کے دوران جس انہماک کے ساتھ میں اس کام میں مصروف رہی، وہ میرے لئے ایک حیرت اور ایک خوش قسمتی کا سامان تھا۔ اور خاص خوش نصیبی یہ تھی کہ اس کتاب کی بدولت مجھے چند غیر معمولی لوگوں سے ربط وضبط اور تبادلۂ خیال کا موقع ملتا رہا ہے۔

مجھ سے ہزاروں خواتین اور مرد حضرات نے خطوط کے ذریعے رابطہ قائم کیا اور بتایا کہ اس کتاب (جس کا یہ ۲۵ واں ایڈیشن ہے) نے ان کی زندگیاں بدل دی ہیں۔ ان میں

سے بہت سوں نے بتایا کہ وہ بنیادی سماجی اور نظریاتی تقلیب کے لئے جو کام کر رہے ہیں، اس کے لئے یہ ایک مفید اور کارگر ہتھیار بنے گی۔ ان میں سے بعض افراد کی درخواستیں کے جواب میں اور یونیورسٹی پروفیسرز اور ہائی سکول ٹیچرز کے اس کتاب کو اپنی کلاسوں میں لگانے کی غرض سے میں نے (اپنے شوہر اور شریک کار، معاشرتی نفسیات داں ڈیوڈ لائے کے تعاون سے) "The Partnership Way: New Tools for Living and Learning" (جسے ہارپر سان فرانسسکو نے بھی طبع کیا) لکھی جو ''جام اور خنجر'' (The Chalice and the Blade) کے ساتھ ایک Practical Companion ہوگی۔

نیز اس زور دار بنیادی سطح کے ردعمل کے باعث ایک Center for Partnership Studies قائم کیا گیا اس کے بعد بیس سے زائد US Centers for Partnership Education کا قیام عمل میں آ گیا جو خود ہی منتظم خود ہی نگران اور خود ہی مالیات اکٹھی کرنے والے گروپ ہیں، یہ لوگ اپنی اپنی کمیونیٹیز میں شراکت کے اصولوں پر سرگرمی سے عمل درآمد کراتے ہیں اور پچھلے دو برسوں سے یہ سنٹرز مختلف جگہوں مثلاً جرمنی، فلپائن اور ارجنٹائن ایسے مزید مراکز قائم کر رہے ہیں۔

''جام و خنجر'' (The Chalice and the Blade) کا اس سے قبل فرانسیسی، سپینی، جرمن، پرتگیزی، یونانی، ڈینش، فنش، جاپانی، روسی اور چینی زبانوں میں ترجمہ ہو چکا ہے۔ اور پاکستان میں یہ اس کا پہلا اردو ترجمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ ایک برطانوی ایڈیشن جس کی ڈسٹری بیوشن آسٹریلیا اور بھارت کے لئے ہے وہ بھی چھپ چکا ہے۔ جبکہ نائیجیرین ترجمہ تقریباً ہو گیا ہے۔

اکتوبر ۱۹۹۲ میں، میں نے اپنے جواب کو عملی روپ دھارتے ہوئے پایا جب کریٹ میں اوّلین انٹرنیشنل پارٹنر شپ کانفرنس منعقد ہوئی، اس میں چالیس سے زائد ممالک کے پانچ سو مندوبین شریک تھے۔ اکتوبر ۱۹۹۳ء میں، میں ایک کانفرنس کی شریک چیئر مین تھی جس میں نصف انسانیت کے انسانی حقوق کی اہمیت پر توجہ مرکوز کی گئی۔ اس کانفرنس میں امریکہ کے مختلف حصوں سے آئے ہوئے تقریباً ایک ہزار افراد شریک تھے۔ اس کا اہتمام رضا کاروں کی ایک کمیٹی نے کیا۔ جو شراکت کے اصولوں کے مطابق بہت سے مردوں پر مشتمل

MashalBooks.org

تھی۔ ۱۹۹۳ میں بیجنگ میں اس کتاب کی اشاعت کے بعد ایک ''چائینز پارٹنرشپ ریسرچ گروپ قائم ہوا، وہاں اس کی اشاعت کا اہتمام چائینز اکیڈمی آف سوشل سائینسز نے کیا تھا۔ اور آج تک پچاس سے زائد کتابیں ''جام اور خنجر''(The Chalice and the Blade) کے متعارف کرائے ہوئے ماڈل سے استفادہ کرچکی ہیں۔ جن میں ایک تو انفانسو منچور اور ازابیلا کونٹی کی مشترکہ تصنیف From Power to Partnership ہے، جو معروف لوگوں کے انٹرویوز پر مشتمل ہے۔ اور ایک کتاب میرے اور میرے شوہر ڈیوڈ کے ساتھ انٹرویو پر مبنی ہے۔ یہ ایوانٹ گارڈے سان فرانسسکو راک میوزیشن میتھو کالاہان نے کیا تھا، اس کا نام "Sex, Death and the Angry Young Man" رکھا گیا ہے۔

میں نے اپنا زیادہ تر وقت اس قسم کی کوششوں کی مدد کرنے میں گزارا ہے ڈاکٹورل تھیسس لکھنے والوں کو نظریۂ ثقافتی تقلیب سے متعلقہ خیالات سے آگاہ کیا۔ اور میں سال کا بیشتر حصہ یونیورسٹیوں، کارپوریشنوں اور کانفرنسوں میں شرکت میں گزارتی ہوں جہاں میں پارٹنرشپ کے متبادل پر لیکچرز دیتی ہوں اور عموماً دنیا بھر میں چلنے والی شراکت کی تحریک کو تقویت بہم پہنچاتی ہوں۔ ۱۹۹۳ء میں جب جرمنی میں میری کتاب کا گولڈ مین پیپر باؤنڈ ایڈیشن شائع ہوا (اس کا پیش لفظ سابق چیئر مین بورڈ آف واکس ویگن ڈینٹل گوڈیورٹ نے لکھا) تو مجھے اس پر اظہار خیال کے لئے دو دفعہ جرمنی جانا پڑا۔ دوسری بار جب مجھے بون میں مدعو کیا گیا تو میرا تعارف ''جرمن بنڈاسٹیگ'' کی صدر پروفیسر ریٹا سسمتھ نے کرایا جو میرے لئے ایک خاص معنی رکھتا تھا، جرمن گورنمنٹ کی ایک اعلیٰ عہدیدار نے نہ صرف میرے کام میں دلچسپی لی بلکہ میرا اور میرے شوہر کا پُرجوش استقبال بھی کیا۔ یہ ہمارے لئے بہت بڑا اعزاز تھا، اور ہمارے دل کے زخموں کا ایک اندمال بھی تھا اس لئے کہ جب میں چھوٹی ہوتی تھی اور جرمن گورنمنٹ نازیوں کے ہاتھوں میں تھی ایک دفعہ میں ہلاک ہوتی ہوتی بچ گئی تھی۔ اسی دورے میں جب میں سابق دیوار برلن کے سامنے کھڑی تھی تو میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ یہ کتنی عجیب بات ہے کہ مسلح کمیونسٹ گارڈوں کے پہرے کی بجائے آج روسی خوانچہ فروش سیّاحوں کو سوونیئرز پیش کررہے ہیں، برڈنبرگ گیٹ پر روسی جنگی تمغے بھی فروخت ہورہے تھے۔ اسی طرح ریشتاگ کے سامنے کھڑی ہوکر میں یہ سوچے بغیر نہ رہ سکی کہ میری زندگی اور عالمی تاریخ کا دھارا ۱۹۳۰ء اور ۱۹۴۰ء کے عشروں میں کتنا مختلف ہوتا

MashalBooks.org

اگر پروفیسر سمتھ جیسی جرأت مند عورتیں اور مرد زیادہ تعداد میں ہوتے۔

۱۹۴۴ء میں مجھے اس ملک کا شکریہ ادا کرنے کا موقع ملا جس نے ایسا سخت موقف اختیار کیا، وہ سال ڈنمارک میں میری اس کتاب کی طباعت کا تھا، وہ واحد یورپی ملک تھا جس کے لوگوں نے ہٹلر کے احکامات کی غیر متشددانہ طریقے سے مزاحمت کی تھی۔ جس کا آغاز کنگ کرسچین سے ہوا اور لوگوں نے نازی جرمنوں کی اس قتل عام کی کاروائی سے تعاون کرنے سے انکار کردیا جس کے تحت یہودیوں کا صفایا کیا جارہا تھا اور میں بھی اتفاق سے ایک یہودی والدین کے ہاں پیدا ہوئی تھی۔

وہ طباعت (جس کے لئے لکھے گئے خصوصی ضمیمے میں، میں نے اہل ڈنمارک کی جرأت کو خراجِ تحسین پیش کیا تھا) بھی میرے لئے بے حد پُرمعنی تھی۔ اس نے مجھے یاد دلایا کہ اگر ہم کافی تعداد میں اکٹھے ہو جائیں، ہم نظام تسلّط کو پیچھے کی طرف کھسک آنے سے روک سکتے ہیں۔ اور یہ کہ اگر ہم اپنے عزم پر پختگی کار بند رہیں تو اپنی شراکت پرمبنی دنیا کی تخلیق کے تصور کو عملی جامہ پہنا سکتے ہیں۔ اور خاص طور پر اس وقت جب میڈیا ہر روز خوفناک تشدد، رجعت اور دباؤ کی خبروں کو بطور "exclusive news" نشر کرتا ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ ہم میں سے ہر ایک، کچھ نہ کچھ کرنے کی اہلیت رکھتا ہے۔ آخر کار یہ ہمارا ہی فیصلہ ہوگا کہ ہم کس قسم کی دنیا میں رہنا چاہتے ہیں۔

[اگست ـ1994]